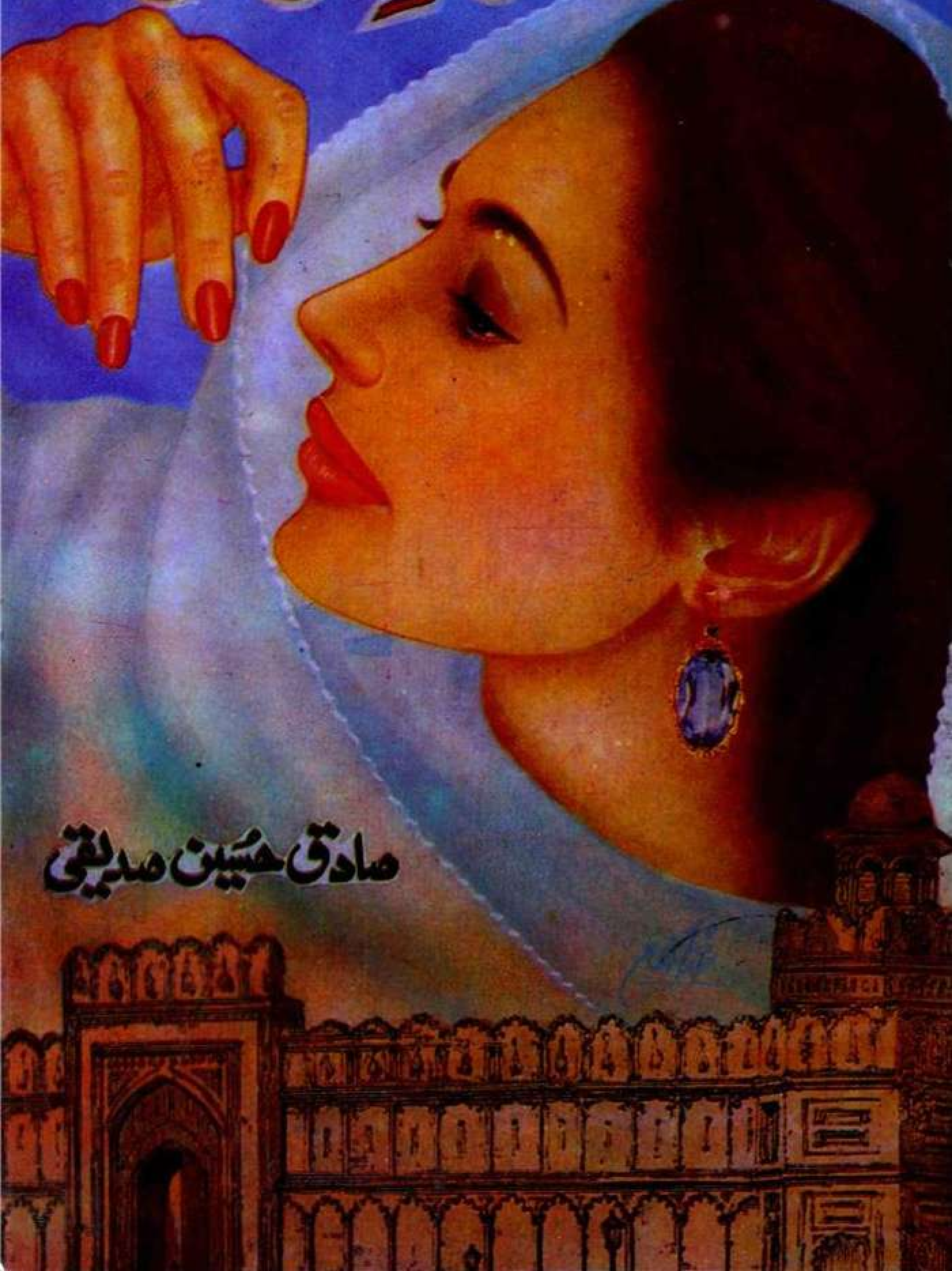
حورِ مہرآتش



صادق حسین صدیقی

نہایت دلچسپ حیرت انگیز اسلامی تاریخی ناول

حورِ مراکش

مصنف

صادق حسین صدیقی

شاھد بکڈپو
اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ناشر — اے ایچ قریشی
با اہتمام — ایم اے، قریشی
مطبع — F.A.S PRINTERS LAHORE
تعداد — 600
سن اشاعت — 1993
قیمت — 80 روپے

شاہد بک ڈپو
اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

(۱)
پہلا باب

خوفناک انسان

"جلدی چلیئے نہ بھائی جان واپس بھی آنا ہے۔"

یہ الفاظ ایک نہایت ہی حسین اور پری چہرہ لڑکی نے اپنے نوجوان ساتھی سے مخاطب ہو کر کہے۔

نوجوان نے کہا "چل تو رہا ہوا زرقا!"

اس حسینہ کا نام زرقا تھا۔ یہ بڑی خوبصورت اور نازنین تھی۔ اس کا بدن چھریرا اعضاء سڈول اور موزوں، پیشانی بلند اور کشادہ بھویں گھنی اور سیاہ آنکھیں بڑی بڑی، پتلیاں کسی قدر نیلی اور مژگان نوکیلی تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا حسن مجسم تھی، عرب لوگوں میں ایسی لڑکی بے انتہا حسین اور مہ جبین سمجھی جاتی تھی۔

اور حقیقت میں وہ تھی بھی بڑی پری پیکر اور ماہ رو۔ اس کا دہن چھوٹا لب موزوں، پتلے اور گلاب کی پتی کی طرح تھے۔ دانت چھوٹے چھوٹے سفید، بالکل موتیوں کی لڑیاں تھے۔ وہ جب کسی کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتی تو بجلی سی کوند جاتی اور دلوں میں تیر سے گڑھ جاتے۔

زرقا نے کہا "کہاں چل رہے ہو تم آج کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہو کیا بات ہے۔ بتا"

نوجوان چونک پڑے۔ انہوں نے کہا "میں کھویا کھو[illegible] ہوں ---- تم

نے کیسے سمجھا۔

زرقا ہنس پڑی۔ اس کی آنکھیں چمکنے اور چہرہ جگمگانے لگا۔ اُس نے کہا "تمہاری حالت دیکھ کر ہر ایک یہی سمجھے گا۔ بتاؤ نہ کیا بات ہے۔"

"نوجوان کا نام سعید تھا۔ انہوں نے کہا "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

زرقا۔ اگر خاص بات نہیں ہے۔ تو یہ خود فراموشی کیوں ہے۔"

سعید:۔ تمہیں وہم ہے۔

زرقا:۔ کیا دیکھ نہیں رہے ہو کہ بادلوں کے دل کے دل اڑتے چلے آرہے ہیں اگر بارش ہونے لگی تو کیا ہوگا۔"

"بارش ہونے لگی۔ کیا ایسا ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا اور آسمان کی طرف دیکھا، زرقا نے سچ کہا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ گھٹا امنڈی چلی آرہی تھی، ہوا کسی قدر تیز ہوگئی تھی، سعید نے کہا "تم نے سچ کہا زرقا بارش تو سر پہ آگئی ہے۔"

زرقا بڑی چنچل اور شوخ تھی، وہ پھر ہنس پڑی اس کے سرخ لب کھل کر سفید دانت بجلیاں گرانے لگے، چہرہ پر نور کی لہریں دوڑ گئیں۔ اُس نے کہا "اب بتاؤ تم تھے خود فراموش یا نہیں۔"

سعید:۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کچھ سوچ رہا تھا۔

زرقا:۔ اور یہی میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا سوچ رہے تھے۔

سعید نے بات ٹالنے کے لیے کہا، جلدی چلو زرقا، بارش تو ہونے ہی والی ہے۔ یہ دونوں عربی النسل گھوڑوں پر سوار تھے، دونوں نے باگیں سہاریں اور کسی قدر تیزی سے چلے زرقا سفید قمیض اور سفید چست پاجامہ پہنے تھیں۔ قمیض پر پیازی رنگ کی ریشمی واسکٹ تھی۔ جس میں زردوزی کا کام بنا ہوا تھا۔ اور جسکے حاشیوں پر سنہرا کلابتو ٹکا ہوا تھا۔ سر پر گول ٹوپی تھی۔ جس میں چلپنی سنہری لیس تھی اور جو موتیوں اور زمردوں سے مزین تھی بڑی خوشنما اور خوبصورت تھی۔ ٹوپی کی جھلملاہٹ نے چہرہ کو اور بھی جگمگا دیا تھا۔ پشت کی طرف دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ یہ دوپٹہ بسنتی رنگ کے باریک ریشم کا تھا۔ اس کے کناروں پر بھی سنہرا گوٹا لگا ہوا تھا۔ واسکٹ کی کھچاوٹ نے اس کے سینے کو نمایاں کر رکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر پری کی طرح پرواز کر رہی تھی۔ یہ دونوں درگاہ

اور لیسیہ کی طرف جا رہے تھے، جو شہر فاس سے کسی قدر فاصلہ پر تھی۔ یہ خانقاہ یا درگاہ مرجع خلائق تھی، بربری، عربی، مصری، تونسی، زنابی اور ریفی غرض مشرقی اور مغربی۔ امیر اور غریب عورتیں اور مرد سب اِس درگاہ میں آتے رہتے تھے۔ رات اور دن لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ فاس کے باشندے روزانہ بلاناغہ اس درگاہ میں فاتحہ خوانی کے لیے آنا۔ ایک ضروری فرض سمجھتے تھے، دور دراز ملکوں سے عالم و فاضل عابد و زاہد اور درویش و صوفی آتے رہتے تھے، عوام کا تو کچھ حد و حساب ہی نہ تھا۔ زرقا نے چلتے چلتے کہا "آج معلوم نہیں میرا دل کیوں کچھ پریشان ہے۔"

سعید: یہی کیفیت میری بھی ہے۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔"

زرقا: میرا دل تو کچھ بیٹھا سا جا رہا ہے۔ اِس سے پہلے حضرت جی کی درگاہ پر آتے ہوتے کبھی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی۔"

سعید: کہیں میاں صاحب ناراض تو نہیں ہو گئے۔ مجھ سے اور تم سے۔"

زرقا: کچھ عجیب نہیں ہے۔ پہلے ہم روزانہ درگاہ عالیہ پر آتے تھے اب ہفتہ میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔"

سعید: آج ہم مزار مبارک کی زیارت کر کے یہ وعدہ کریں گے کہ انشاء اللہ روزانہ حسب معمول آتے رہیں گے۔"

زرقا: لیکن اسی وقت تک جب تک ہم اس مشہور شہر میں رہیں گے۔"

سعید: اور ہم یہاں سے جا کہاں سکتے ہیں۔"

زرقا: بھائی جان، حکومت میں انقلاب ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں سلطنت کسے ملے۔ کون سلطان ہو، ہمارے خاندان کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے رہیں، ہم یہاں رہ بھی سکیں یا نہیں۔"

سعید: اگرچہ یہ خدشہ مجھے بھی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سلطان کوئی بھی ہو۔ ہمارے خاندان سے کچھ تعرض نہ کرے گا۔"

زرقا: مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہودی روپے کے زور سے گڑے مردے نہ اکھاڑنے لگیں۔"

سعید: میں جانتا ہوں کہ یہودیوں کے پاس روپیہ ہے اور یہ بھی جانتا ہوں۔

کہ انہیں ابن مشعل کے مارے جانے کا سخت صدمہ ہے۔ وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی ضرور کوشش کریں گے۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس شیطنت کی سزا جو ابن مشعل کو دی گئی ہے۔ وہ اسی کا مستحق تھا یہودی اور مسلمان سب اس بات کو جانتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی سلطان ہو، وہ یہودیوں کے کہنے میں آکر ابن مشعل کا قصاص طلب نہ کریگا۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو ایک مرتبہ پھر فاس میں بدامنی ہو جائے گی۔ مسلمان اس بات کو ہرگز بھی گوارا نہ کریں گے۔

زرقا۔ ان باتوں سے مجھے بھی تسلی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب یہ سوچتی ہوں کہ ایک طالب علم نے جان پر کھیل کر میری آبرو اور ہمارے خاندان کی عزت کو باقی رکھا ہے۔ تو اندیشہ ہوتا ہے کہ ہمارا خاندان چاہے بچ جائے لیکن وہ طالب علم نہ بچ سکے گا۔

سعید:۔ کیا تم ایسا سمجھتی ہو۔ زرقا کہ ہم اس کی مدد نہ کر سکیں گے۔ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ میں اور میرے خاندان کے زن و مرد اس طالب علم کے پسینہ کی جگہ خون بہا دینگے، ہم بزدل نہیں ہیں، مفلس ضرور ہیں۔ لیکن شریف ہیں۔ سید زادے ہیں، ہماری شرافت کے جوہر زنگ خوردہ نہیں ہوتے ہیں۔

اب ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں۔ زرقا نے کہا۔ ترشح شروع ہو گیا ہے۔ کہیں ہم درگاہ عالیہ تک پہنچتے پہنچتے بھیگ نہ جائیں۔"

سعید:۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ ضرور بھیگ جائیں گے۔ مجھے تو یہ بوندیں بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی ہیں۔ تمہارا البتہ فکر ہے کہیں تم بھیگ کر زرقا نے حسین قہقہہ لگا کر کہا۔ "پگھل نہ جاؤں، ہوں نہ کھانڈ کی بنی ہوئی۔"

"کھانڈ کی تو نہیں۔ مگر عورتیں موم کی بنی ہوئی ضرور ہوتی ہیں۔"

زرقا:۔ اور مرد شاید فولاد کے ہوتے ہیں۔ نہ معلوم مرد اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ سعید نے مسکرا کر کہا، مرد، مرد ہوتے ہیں اور عورتیں، عورتیں ہوتی ہیں۔"

زرقا۔ یہ مردوں کی بھول ہے کہ وہ عورتوں کو موم کی پتلیاں سمجھتے ہیں ورنہ۔"

ابھی اس نے اسی قدر کہا تھا کہ اس کا گھوڑا چونکا ہوا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک نہایت قوی ہیکل شخص ادنیٰ جبہ پہنے ہوئے کھڑا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس کی صورت بڑی ڈراونی تھی، آنکھیں سُرخ تھیں۔ ڈاڑھی اُلجھی ہوئی تھی۔ بالکل وحشی معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر ندرت کی ہلکی چیخ نکل گئی۔ اس نے کہا "دیکھنا بھائی جان، یہ کون جنگلی ہے"۔

سعید نے بھی اسے دیکھا، اس کی خوفناک صورت نے اِن کے دِل پر بھی اثر کیا۔ انہوں نے کہا۔ واقعی کوئی جنگلی آدمی ہے۔ مگر تم اسے دیکھ کر ڈر گئیں"۔

ندرت:۔ ذرا تیز چلو بھائی جان"۔

یہ کہتے ہی اس نے گھوڑے کی باگ سہاری اور قدرے تیزی سے چلی۔ سعید بھی اِس کے ساتھ چلے۔ اِس جنگلی نے کہا "کب تک بچو گے مجھ سے"۔

ان دونوں نے اس کے یہ الفاظ سُن لیے سعید نے پیچھے پھر کر دیکھا۔ وہ ابتک انہیں گھور رہا تھا۔ یہ دونوں بڑھے چلے گئے۔

دُوسرا باب

رشید

پہلے ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں، اب پھوار پڑنے لگی۔ اگرچہ گرمی کے دن تھے، لیکن گھٹا چھا جانے سے گرمی جاتی رہی تھی اور اب پھوار پڑنے سے تو خنکی ہو چلی تھی۔

زرقا اور سعید دونوں گھوڑے بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ حسین زرقا کی خوبصورت ٹوپی کچھ پیچھے سرک گئی تھی، ننھی ننھی بوندوں نے اس کے سر کے بالوں میں افشاں چن دی تھی یا بال بال موتی پرو دیئے تھے۔

اس کی دو چوٹیاں سفید موباف میں گندھی اس کے گداز سینہ کے دونوں طرف نوزائیدہ سانپوں کی طرح پڑی تھیں۔ وہ کبھی کبھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ جس سے بوندیں اس کے حسین چہرہ پر پڑ کر گلاب کی پتیوں پر شبنم کی بوندوں کا سماں پیدا کرنے لگی تھیں اور یہ بوندیں اس کے گلابی چہرہ پر ایسی مفتوں ہو گئی تھیں کہ ڈھلکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ جیسے چپک گئی ہوں، انہوں نے گھوڑوں کو اور تیز کیا۔ اب خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ کچھ خوشبو تو ان پھولوں کی تھی۔ جو اس نواح میں کھل رہے تھے اور کچھ خوشبو بخور اور عطریات کی تھی۔ یہ خوشبو درگاہ عالیہ کی طرف سے آ رہی تھی۔

اب درگاہ نظر آنے لگی تھی۔ چاروں طرف کے راستے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے، کثرت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ اب زرقا نے بھی اپنے چہرہ پر نقاب کھینچ لیا تھا۔ مرد اور عورتیں غول در غول آ جا رہے تھے۔ سب خوش پوش تھے۔ عورتوں کے لباس ریشمی اور زرق برق تھے۔ وہ چہروں پر خوشنما نقاب ڈالے تھیں۔ بعض عورتیں

پیدل اور بعض سواریوں میں آجا رہی تھیں۔ ننھی ننھی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی، زرغا اور سعید دونوں درگاہ عالیہ کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے اصطبل میں گھوڑے کھڑے کیے اور محافظوں کو اُن کی حفاظت کی ہدایت کر کے درگاہ کی طرف بڑھے۔

یہ درگاہ ایک وسیع اور سطح اونچے ٹیلہ پر واقع تھی۔ اس کے کئی دروازے تھے۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر پھاٹک میں پہنچتے تھے اور پھاٹک کو طے کر کے صحن میں آتے تھے۔ درگاہ کی چہار دیواری پتھر کی تھی۔ فرش بھی پتھر کا تھا۔ کہیں کہیں پھولوں کی کیاریاں اور انجیر کے درخت تھے۔

جب یہ دونوں اس صحن میں پہنچے تو خوشبو کی لپٹیں اور بھی تیز آنے لگیں۔ لوگ اس صحن میں بھی کثرت سے تھے۔ بعض آجا رہے تھے اور بعض پانچ پانچ دس دس کی ٹکڑیوں میں اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں عورتوں اور لڑکیوں کے غول بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

لیکن مرد، عورتیں اور بچے سب بڑے ادب سے تھے۔ نہ کوئی ہنس رہا تھا نہ فضول باتیں کر رہا تھا۔ درگاہ عالیہ کا سب احترام کرتے تھے، صرف مسلمان ہی درگاہ میں نہیں آجا رہے تھے۔ بلکہ یہودی مرد عورتیں اور بچے بھی تھے۔ اور چند عیسائی عورتیں اور مرد بھی تھے۔

عورتیں بچے اور مرد خواہ کسی مذہب و ملت کے تھے سب خوش پوش تھے۔ عورتوں کے زرق برق لباس اور سونے اور جواہرات کے زیورات جگمگا رہے تھے، یہودی اور نصرانی عورتیں اور لڑکیاں بے نقاب تھیں۔ ان میں سے اکثر خاصی شکیل اور خوبصورت تھیں۔

یہ دونوں آگے بڑھے اور بھیڑ میں گھستے ہوئے ایک عالیشان دروازہ میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ بھی خاصا اونچا اور لمبا تھا۔ اس کو عبور کر کے وہ دوسرے صحن میں پہنچے۔ اس درگاہ کے دو صحن تھے۔ یہ دوسرا صحن پہلے صحن سے کچھ بڑا تھا، اس صحن میں پہلے صحن سے بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ اس صحن کے آخر میں وہ عمارت تھی جس کے اندر مزار تھا۔ وہ عمارت صحن کی سطح سے کچھ اونچی تھی۔ اس پر چڑھنے کے لیے کئی چوڑی چوڑی اور صحن کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ تک لمبی سیڑھیاں تھیں ان

سیڑھیوں پر سے عورتیں اور مرد اتر چڑھ رہے تھے، مسلمان مردوں کا لباس بالکل سفید عیسائیوں کا سیاہ اور یہودیوں کا زرد تھا۔ البتہ ہر مذہب کی عورتوں کے لباس رنگ برنگ کے ریشمی، اور زرق برق تھے۔ ان مہذب اور مطلا لباسوں پر سونے اور جواہرات کے زیورات اور جگمگا رہے تھے، تمام طور پر مسلمان عورتیں اور لڑکیاں نقاب پوش تھیں۔

سعید اور زرقا نے ابھی دوسرا صحن نصف کے قریب طے کیا تھا کہ ایک نوجوان عالمانہ لباس پہنے ہوئے ملے۔ وہ کمسن بھی تھے۔ اور خوبصورت بھی وجیہہ بھی تھے۔ اور شاندار بھی، ان کا جسم مضبوط، سینہ چوڑا اور چہرہ روشن تھا۔ سعید نے سلام میں میں سبقت کی۔ نوجوان نے سلام کا جواب دیا۔ سعید نے کہا "کیا واپس جا رہے ہو بھائی رشید"

اس نوجوان کا نام رشید تھا۔ انہوں نے کہا۔ جی ہاں واپس جا رہا ہوں گھٹا سر پر تلی کھڑی ہے۔ پھوار پڑنے لگی ہے۔ ممکن ہے۔ زور کی بارش شروع ہو جائے"

زرقا نے کہا "اور آپ پگھل جائیں"

رشید نے زرقا کی طرف دیکھا۔ خوشنما نقاب میں سے دو حسین آنکھیں جن سے شوخی ٹپک رہی تھی جھانک رہی تھیں"

سعید نے مسکرا کر کہا "کیوں بھائی پگھل جانے کا خوف ہے"

رشید۔ "یہ تمہارے ساتھ زرقا ہیں شاید"

سعید۔ "جی ہاں"

رشید۔ "اب کیا جواب دوں میں انہیں"

زرقا۔ "جواب بھی کیا ہو سکتا ہے"

سعید۔ "بھئی گر پگھل جانے کا خوف ہے تو بیشک واپس چلے جاؤ۔ ورنہ آؤ۔ ہم بھی زیارت کر لیں، فاتحہ پڑھ لیں اور ساتھ ہی چلیں"

زرقا نے مسکرا کر کہا "جانے بھی دیجئے۔ پگھل وگھل گئے"

سعید۔ "ایسے کیا یہ کھانڈ کے بنے ہیں"

رشید۔ "بھئی کھانڈ کا کیوں بتاتے ہو مجھے۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہوں"

زرقا۔ سوچ لیجئے۔"

رشید۔ اب میں تم سے بھی گیا۔ میرا خیال تھا۔ زیادہ بارش ہوگئی تو کہیں"

زرقا۔ زکام دکام نہ ہو جائے۔"

سعید۔ بھئی تم ٹھہرے نازک واقعی کہیں زکام نہ ہو جائے۔"

رشید۔ کیا اب بھی تم یا زرقا مجھے نازک سمجھتے ہو جبکہ میری بہادری کا امتحان لے چکے ہو۔"

سعید۔ میں تو تمہاری بہادری کا قائل ہوں۔ لیکن زرقا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

زرقا۔ ذکر بہادری کا نہیں ہے۔ بارش کا ہے۔ اور بارش بہادری کو نہیں دیکھتی۔"

رشید:۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میں پگھلنے اور گھلنے والا نہیں ہوں۔"

زرقا نے شوخی سے کہا۔" تب فکر نہ کیجئے۔"

رشید۔ لیکن ایک دقت ضرور ہوگی۔"

سعید:۔ کیا۔۔ ؟"

رشید:۔ تم دونوں گھوڑوں پر آئے ہو گے اور میں پیدل آیا ہوں۔ میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکوں گا۔"

سعید:۔ میں اور تم پیدل چلیں گے اور زرقا گھوڑے پر سوار ہو جائے گی۔

رشید:۔ لیکن واپسی میں دیر زیادہ ہو جائے گی۔ اب تم یہاں سے مغرب کی نماز پڑھ کر چلو گے۔"

سعید۔ مغرب کا وقت تو قریب آ ہی گیا ہے۔ دیکھو درگاہ میں روشنی ہونے لگی ہے۔"

واقعی روشنی شروع ہوگئی تھی۔ جھاڑ فانوس روشن کیے جانے لگے تھے۔ کئی خدام روشنی کرتے پھر رہے تھے۔ گھٹا ہونے کی وجہ سے قبل از وقت اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔"

اب بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ زرقا نے کہا۔" جلدی چلئے نہ بارش تیز

ہو گئی ہے۔"

رشید:۔ "ہاں بھئی چلو سعید۔ کہیں زرقا بھیگ کر ۔"

سعید:۔ "پگھل نہ جائے۔"

زرقا:۔ "مجھے اپنا خیال نہیں بلکہ (رشید کی طرف اشارہ کر کے) ان کا خیال ہے ۔"

رشید:۔ "چلو میرا ہی خیال سہی۔"

یہ چلے اتفاق سے زرقا بیچ میں آگئی۔ اس کے ایک طرف رشید ہو گئے اور دوسری طرف سعید۔ ابھی وہ چند قدم چلے تھے کہ انہوں نے لوگوں کو تیزی سے چلتے ہوئے دیکھا، دفعتاً زرقا نے رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ رشید نے دیکھا۔ ان کے قریب سے ایک وحشی قسم کا آدمی نکل کر بڑھا یہ وہی تھا، جو زرقا اور سعید کو راستہ میں آتا ہوا ملا تھا۔ رشید نے کہا ہے "بڑا خوفناک صورت انسان ہے۔"

سعید نے بھی اسے دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا "یہ شخص ہمیں راستہ میں بھی ملا تھا۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی۔"

زرقا۔ "مجھے خیال ہے۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔"

رشید:۔ "مجھے بھی ایسا ہی خیال ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔"

چونکہ اس وقت بارش تیز ہو گئی تھی، اس لیے یہ تینوں عمارت کی طرف قدم بڑھا کر چلنے لگے۔

تیسرا باب

ادریس اوّل

رشید اور سعید دونوں جھپٹ رہے تھے اور زرقا تو ایسی چھلانگیں لگا رہی تھی، جیسے وہ اُڑ رہی ہو، تینوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگے، اب زرقا کا پیر پھسلا یا اِس نے شوخی کی۔ چلتے چلتے ہاتھ رشید کے کندھے پر رکھ کر اپنے جسم کا پورا زور ڈال دیا۔ اگر وہ ہوشیاری سے سنبھل نہ جاتے تو معہ زرقا کے لڑھک کر نیچے صحن میں جا پہنچتے۔ وہ سنبھل گئے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا "بڑی شوخ ہو تم"۔

زرقا نے الٹا ان پر الزام لگا دیا۔ کہنے لگی "توبہ توبہ، گرا ہی دیا تھا مجھے"۔

سعید نے اس شوخ و شنگ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "کس نے گرا دیا تھا تمہیں۔ زرقا نے فوراً بات بدلی۔ لہا۔ ان کمبخت سیڑھیوں نے دیکھتے نہیں ہو پھسلن کس قدر ہے"۔

سیڑھیوں پر پھسلن بالکل بھی نہ تھی۔ مگر سعید نے یہ سمجھا کہ بوندوں کی وجہ سے شاید پھسلن ہو گئی ہو۔ انہوں نے کہا "سنبھل کر چلو"۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ رشید نے کہا "مجھے تختہ مشق کیوں بناتی ہو۔ میں تمہارا بوجھ نہ سنبھال سکوں گا"۔

زرقا:۔ بس بہادری کے دعوے ختم ہو گئے۔

رشید:۔ معاف کرنا عورت کے سامنے مرد کی بہادری رکھی رہ جاتی ہے"۔

زرقا - اب آپ نے صحیح راستہ پر "

اب یہ تینوں عمارت میں داخل ہوتے، یہ عمارت اونچے اور چوڑے در وں کا دالان تھی، اس کا چھجہ کافی آگے کو نکلا ہوا مضبوط اور خوبصورت تھا۔ محرابیں بڑی خوشنما تھیں، دیواریں بھی اچھی تھیں۔ اس دالان کے پیچھے ایک وسیع کمرہ برج نما تھا۔ اس پر نہایت خوبصورت، بلند اور مضبوط گنبد بنا ہوا تھا۔ گنبد میں سونے کا کلس لگا ہوا تھا۔

اس کمرے کے چاروں طرف دالان تھے ایک دالان کے سامنے تو پتھر کے فرش کا بڑا صحن تھا، اور تین طرف خوشنما باغیچے تھے۔ ان باغیچوں میں طرح طرح کے خوشنما اور خوشبودار پھول کھل رہے تھے۔ ان پھولوں کی بھینی بھینی مہک پھوٹ رہی تھی۔

لیکن پھولوں کی مہک پر بخور اور عطریات کی خوشبو غالب آ رہی تھی۔ یہ خوشبو مزار مبارک سے پھوٹ رہی تھی۔

چاروں طرف کے دالان مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان دالانوں میں سے مزار مبارک کے اندر جانے کا راستہ مردوں کے لیے الگ تھا۔ اور عورتوں اور بچوں کے لیے الگ۔

چنانچہ سعید اور رشید تو مردانہ راستہ سے مزار کے اندر پہنچے۔ اور زرقا زنانہ راستہ سے چلی۔ جب وہ مزار کے کمرہ کے اندر پہنچی اور اس نے مزار مبارک دیکھا تو اس کے دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہوا۔ وہ بڑی سنجیدہ بن گئی۔ اور بڑے ادب و احترام سے آگے بڑھی۔

یہ مزار مبارک حضرت ادریس ثانی رحمتہ اللہ علیہ کا تھا۔ یہ ادریس مغرب اقصیٰ کے تاجدار اور بڑے بزرگ ولی کامل تھے۔ ان کے حالات لکھنے سے پہلے ان کے اب و جد کے حالات مختصراً بیان کرنے ضروری ہیں۔ ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ادریس ثانی (انہیں ادریس الصغیر بھی کہتے ہیں) بن ادریس بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ، بن حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام،

غرض یہ چمن سادات کے دو پھول تھے، جو خاک میں مل کر بھی خوشبو دیتے رہے تھے، وہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نونہال تھے، خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں جب مکہ معظمہ میں خاندان رسالت پر کچھ پابندیاں عائد کی گئیں تو وہاں سے کچھ لوگ ہجرت کر گئے۔ چنانچہ ادریس اول بھی اپنے خادم راشد کو ساتھ لے کر ملک حجاز سے مصر میں پہنچے وہاں اس زمانہ کے پوسٹماسٹر جنرل نے انہیں پناہ دی لیکن عباسیوں کے خوف نے انہیں ملک فراعنہ میں بھی اطمینان سے نہ رہنے دیا۔ انہیں خوف ہوا کہ کہیں ان کی وجہ سے ان کے میزبان پر کوئی آفت نہ آجائے۔ وہاں سے ملک افریقہ پہنچے۔ چند روز وہاں رہے۔ اور پھر وہاں سے بھی روانہ ہو کر مراکش میں جا پہنچے۔ مراکش اس ملک کو کہتے ہیں جو جزیرہ نما اندلس کے جنوب میں آبنائے جبل الطارق کے اس طرف براعظم افریقہ کے گوشہ میں واقع ہے۔ اسے مراکش مراکو یا ماریٹینا بھی کہتے ہیں۔ عرب ملک مراکش کو مغرب اقصیٰ کہتے ہیں۔

ملک مراکش یا مغرب اقصیٰ میں بربر قوم آباد تھی۔ اور بربر قوم کے قبائل الگ الگ صوبوں میں بود و باش رکھتے تھے، ان قبائل کے نام پر ہی صوبوں کے نام رکھے جاتے تھے، اور ان قبائل کی آبادی کے اعتبار سے حدود کی تقسیم ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی قبیلے کے لوگ کہیں اور جا آباد ہوتے تھے۔

یا کسی دوسرے صوبہ میں چلے جاتے تھے، جہاں وہ جا کر رہنے لگتے تھے اس علاقہ کا نام ان ہی قبائل کے نام موسوم ہو کر صوبہ بن جاتا تھا۔ اور صوبہ چھوٹا بڑا بھی ہو جاتا تھا۔

مراکش میں مشہور بربری قبائل زناطہ، مسمودہ، شہاجہ، قطامہ، ہوارہ، بنو زدامہ اور بنو غش تھے۔ علاقہ بربر یعنی شمالی افریقہ میں اہل فینیشیا یعنی شامیوں کنعانیوں نے عرصہ تک حکومت کر کے اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایران کے بعض خاندان بھی مراکش میں آباد ہو گئے تھے، اِن کے وہاں پہنچنے سے آتش پرستی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد یعنی بنی اسرائیل بھی اس ملک میں آباد ہو گئے تھے کیونکہ یہودی بھی وہاں کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ رومیوں اور یونانیوں کی حکومت بھی اس ملک کے ایک علاقہ پر قائم ہو گئی تھی۔ قرطاجنہ

کی مشہور قوم اسی علاقہ بربر کی رہنے والی تھی، جسے اہل فینیشیا یعنی کنعانیوں کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ قوم گاتھ بھی مراکش میں رہ چکی تھی اور بڑی سفاکی دکھا چکی تھی مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کی رومی حکومت اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے مراکش پر حملہ کیا وہاں موجود تھی۔

مراکش میں عرب شامی، مصری، یونانی، ایرانی اور رومی وغیرہ آباد ہو گئے تھے لیکن بربر قوم کی اکثریت تھی۔ اور ملکی آب و ہوا کی وجہ سے بربری قوم میں بربریت اور وحشی پن زیادہ تھا۔

جب اسلام مراکش میں پہنچا۔ تو اگرچہ بربری مزاجاً بہت کچھ نرم ہو گئے لیکن کبھی کبھی ان کی بربریت عود کر آتی تھی۔

مراکش کو عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ ان کے ہی عہد میں بربری گو مسلمان ہو گئے تھے، وہ اہل سادات کی بڑی عزت و عظمت کرتے تھے۔

خلیفہ ولید کے زمانہ میں مغربی علاقہ کے وائسرائے یعنی گورنر جنرل موسیٰ بن نصیر تھے۔ افریقہ اور مراکش کے ممالک بھی ان کے تحت میں تھے، موسیٰ نے ملک مراکش کا گورنر طارق بن زیاد کو مقرر کیا تھا۔ یہ وہی طارق بن زیاد ہیں جنہوں نے ملک اندلس پر لشکر کشی کی اور اپنی بے نظیر جرأت اور استقلال سے اس مغربی ملک کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔

بربری لوگ کسی کے محکوم ہو کر رہنا نہیں جانتے تھے۔ وہ بہادر تھے اور بہادر غلامی کو برداشت نہیں کیا کرتے۔ انہیں بھی جب اپنی محکومی اور غلامی کا احساس ہوتا تھا تو وہ بغاوت کر بیٹھتے تھے، لیکن عرب ان کی بغاوت کو فرو کرتے پھر انہیں رام کر لیتے تھے

چونکہ وہ مستقل مزاج جری اور بیباک دلیر تھے، اس لیے عرب اکثر ان کی بہادری سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ جب کبھی اندلس میں عیسائیوں نے سرکشی کی مراکش کے بربریوں نے جا کر انہیں سیدھا کر دیا۔

غرض ادریس اول مراکش میں پہنچے۔ اور سجلماسہ کے قریب بولیلی یا ولیلی میں جا مقیم ہوئے اس وقت بولیلی میں اسحاق بن محمد بن عبد الحمید حکمران تھے۔ انہوں

نے ادریس اوّل کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی خوب خاطر مدارات کی۔

جب بربریوں کو معلوم ہوا کہ وہ خاندان سادات سے ہیں تو وہ انہیں مولائی ادریس کہنے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ قبائل زورغہ، لواطہ، زناطہ سدراطہ، مکناسہ اور غمازا وغیرہ ان کے معتقد اور حلقہ بگوش ہو گئے۔

کچھ بربری قبائل یہودی، نصرانی اور مجوسی ہو گئے تھے، وہ اسوقت تک مسلمان نہیں ہوتے تھے۔ مولائی ادریس نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے سرکشی کی، اور مسلمانوں کو دھمکیاں دیں، مولائی ادریس نے ان پر حملہ کر دیا، یہ غیر مسلم قبائل شالہ اور رمادلہ مقامات میں آباد تھے۔ ۱۷۲ھ میں انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اور رفتہ رفتہ مولائی ادریس مغرب اقصیٰ کے سلطان ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بغداد میں ہارون رشید خلیفہ تھے۔ انہوں نے جب مولائی ادریس کی قوت و طاعت کا حال سنا تو بہت زیادہ فکر مند ہوتے انہیں خوف ہوا کہ کہیں وہ اپنی قوت حاصل نہ کر لیں کہ بربریوں کو لے کر بغداد پر چڑھ آئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک معتمد و معتبر غلام سلیمان بن جریر کو جو شماخ کے نام سے مشہور تھا۔ مولائی ادریس کو ٹھکانے لگانے کے لیے ملک مراکش میں بھیجا۔

شماخ نے مولائی ادریس کے پاس پہنچ کر ان پر یہ ظاہر کیا کہ خلیفہ ہارون رشید اس سے ناراض ہو گئے تھے، اسے قتل کرانا چاہتے تھے۔ وہ موقع پاکر بھاگ آیا۔ اب ان کے پاس پناہ لینے آیا۔

مولائی ادریس بڑے رحمدل تھے۔ وہ اس کی باتوں میں آ گئے۔ انہوں نے اسے نہ صرف پناہ ہی دی، بلکہ اسے اپنے مشیروں اور مصاحبوں کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ اور اس کی خاطر و مدارات کرنے لگے۔

شماخ کو کچھ طب میں دخل تھا۔ اُس نے بولیلی میں اپنا مطب کھول لیا اور نہایت شان سے رہنے لگا۔ اتفاق سے مولائی ادریس کے دانتوں میں درد ہونے لگا۔ اور یہ درد روز بروز بڑھنے لگا۔ انہوں نے علاج شروع کیا۔ مشہور بربری حکیموں سے رجوع کیا۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔

ایک روز مولائی ادریس نے شماخ سے بھی اپنی تکلیف کا ذکر کیا۔ اُس نے کہا:

میرے پاس ایک ایسا منجن ہے جو ایک ہی دفعہ کے ملنے میں تمام تکلیف کو رفع کردے گا۔"

چنانچہ اُس نے منجن دیا۔ اس منجن کے استعمال کرتے ہی مولائی ادریس کا دم گھٹ گیا۔ اور وہ ۱۷۵ھ میں وفات پا گئے۔

شماخ بولیلی سے بھاگا۔ مولائی ادریس کے غلام راشد نے اُس کا تعاقب کرکے اسے جا پکڑا۔ مقابلہ ہوا، شماخ زخمی ہوگیا مگر وہ بچ کر نکل بھاگا۔ راشد واپس لوٹ آئے۔ لوگوں کو سلطان ادریس اوّل کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا انہیں بولیلی ہی میں دفن کردیا گیا۔

چوتھا باب

ادریس ثانی

سلطان ادریس اوّل کے اس وقت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی ان کے وفادار غلام راشد اور مولائی ادریس کے دوسرے معتقد افسروں کو یہ فکر ہوئی کہ اب اس سلطنت پر جس کی ادریس نے بنیاد ڈالی اور جسے پروان چڑھا کر مضبوط بنایا کسے حکمران مقرر کریں۔

راشد کو یہ بات معلوم ہوئی کہ مولائی ادریس کی ایک بربری کنیز کو جس کا نام کنیزہ ہے حمل ہے۔ وہ یہ بات سُن کر بہت خوش ہوتے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ مولائی ادریس کی بربری کنیز کنیزہ نامی کو حمل ہے۔ یہ بچہ ہی جو رحم مادر میں ہے سلطنت کا وارث ہے۔ ہمیں اس بچہ کی بیعت کرنی چاہیئے۔

خیال تھا کہ شاید بربری لوگ اس بات کو لپند اور منظور نہ کریں کہ اس بچّہ کی بیعت کرلیں جو ابھی ماں کے پیٹ ہی میں ہے۔ لیکن بربریوں کو مولائی ادریس سے بڑی عقیدت ہوگئی تھی۔ انہوں نے اِس بات کو منظور کر کے اسی بچہ کی بیعت کرلی۔ راشد نائب السلطنت مقرر کر دیئے گئے۔ اور انہوں نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے نظامِ حکومت قائم کیا۔

مدّت حمل گذرنے کے بعد کنیزہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا۔ تمام ملک میں اس لڑکے کی پیدائش سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس لڑکے کا نام بھی ادریس رکھا گیا۔ اور یہ ادریس ثانی یا ادریس الصغیر کہلاتے۔

ادریس ثانی کے پیدا ہوتے ہی راشد نے حکم دیا کہ اب اس ننھے بچہ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ چنانچہ سب نے بیعت کر لی، اب بھی راشد ہی نائب السلطنت رہے، انہوں نے اپنی دانشمندی قابلیت اور دانائی سے حکومت کے نظام کو درہم و برہم نہ ہونے دیا۔ نہ کسی کو بغاوت کرنے دی، اور نہ کسی کو یہ حوصلہ ہوا کہ اس سلطنت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔

جب ادریس ثانی کا دودھ چھڑایا گیا تو راشد کے کہنے پر لوگوں نے بیعت کی تجدید کی، اور جب ادریس ثانی کی عمر ۱۸۸ھ میں گیارہ سال کی ہوئی اور انہوں نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو جامع مسجد بو لیلی میں پھر ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

ادریس ثانی اس عرصہ میں مذہبی اور ملکی دونوں تعلیمیں حاصل کرتے رہے وہ ہونہار تھے، ذہین تھے، بہت تیزی سے علم و فن میں ترقی کرتے جاتے تھے۔

لیکن عباسی خلافت کو اب بھی اس حکومت سے خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ نے اپنے افریقہ کے گورنر ابن اغلب کو راشد کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ ابن اغلب نے بربریوں کو اُبھار دیا۔ اور انہوں نے بغاوت کر کے راشد کو قتل کر ڈالا مگر ادریس ثانی کی اطاعت سے باہر نہیں ہوئے۔

راشد کے قتل کے بعد ابو خالد بن یزید بن الیاس عبدی ادریس ثانی کے اتالیق مقرر ہوئے۔ انہوں نے بھی نہایت ہوشمندی اور دانائی سے حکومت شروع کی۔ باغی بربریوں نے ان کی اطاعت کر لی۔

ادریس صغیر نے بہت جلد مذہبی علوم سے فراغت حاصل کر کے امورِ سلطنت سے بھی واقفیت و آگاہی حاصل کر لی۔ اور خود ایک روز سر یرآرائے سلطنت ہو کر مصعب بن عیسٰی ازدی کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر لیا۔ اور اب رفتہ رفتہ اپنی حدودِ سلطنت کو وسیع کر کے قریب قریب تمام مراکش پر قبضہ کر لیا ادریس ثانی نہایت نیک دِل اور حلیم مزاج کے تھے، ان کی بزرگانہ علامتوں کا اظہار شروع ہو گیا۔ وہ صرف سلطان ملک ہی نہ تھے، بلکہ سلطان دین بھی ہو گئے تھے۔ لوگ چھوٹی سی عمر ہی میں انہیں ولی اللہ سمجھنے لگے تھے، ان کی شہرت سُن سُن کر عرب، اندلس، افریقہ، مصر اور شام سے آ آ کر ان کے پاس جمع ہونے لگے اِن لوگوں کے آنے کی وجہ سے حکومت و سلطنت میں رونق اور شان و شوکت آ گئی۔

بولیلی ایک چھوٹا مقام تھا، دار السلطنت کے قابل نہ تھا۔ نہ اسے وسیع کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ حدودِ سلطنت بڑھ گئے تھے۔ اس لیے دار السلطنت کو وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی، چنانچہ ادریس صغیر نے خود ایسی جگہ تلاش شروع کی جو دار السلطنت کے لیے موزوں ہو،

تلاش و جستجو کے بعد انہوں نے وہ قطعہ زمین پسند کیا جو جبل زلاغ کے دامن میں اس مرغزار میں واقع تھا۔ جس کی آبشار میں تین چھوٹی چھوٹی مگر بارہ ہی ندیاں فاس اشر اشرا اور زیتون ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔

لیکن اِس قطعہ آراضی پر قبائل بنوزواغہ اور یرغش آباد تھے، وہاں ان کی جھونپڑیاں تھیں۔ چنانچہ ان دونوں قبائل سے وہ قطعہ آراضی اس طرح پر خریدا گیا کہ بنوزواغہ کا حصہ ساڑھے تین ہزار درہم میں اور یرغش کا حصہ ڈیڑھ ہزار درہم ہیں۔

چنانچہ اِس خوشنما اور خوش سواد قطعہ میں ماہ ربیع الاوّل ۱۹۲ھ مطابق ۳ فروری ۸۰۸ء پنجشنبہ (جمعرات) کے روز ایک شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت ادریس ثانی یا ادریس صغیر نے اپنے تبر (فاس) اسے زمین پر خط کھینچے اور ظہر کے وقت نماز پڑھ کر پروردگار عالم سے دعا مانگی کہ میں تیرے نام پر اس شہر کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔ تو اسے دار الامن، مرکز، علوم و فنون اور ملجاء ماویٰ علماء اور فقہا بنانا۔ خدا نے ان کی یہ دُعا قبول فرمائی کیونکہ آج بھی جبکہ اس شہر کی تعمیر کو بارہ سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ شہر سرچشمہ علوم و فنون بنا ہوا ہے۔

اس شہر کا نام "فاس" رکھا گیا۔ لوگ اِس کی وجہ تسمیہ کے متعلق عجیب عجیب روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جب یہ شہر تعمیر ہو رہا تھا تو ایک روز جبکہ حضرت ادریس تعمیر کی نگرانی کر رہے تھے تو ایک مسافر اس طرف سے گذرا اس کا نام فارس تھا۔ اسے لکنت کی شکایت تھی، مزدوروں نے اس کا نام پوچھا۔ اُسے ہکلا کر کہا۔ فہ... فہ... فاس حرف "ر" اس کی زبان سے ادا نہ ہوا، مزدوروں نے مذاق میں فہ... فہ... فاس کہنا شروع کیا۔ اس سے اس شہر کا نام فاس پڑ گیا۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس ویرانہ میں ایک قریہ آباد تھا۔ اِس قریہ میں قبائل زواغہ اور یرغش آباد تھے، اس قریہ کا نام ساف تھا۔ اس کا نام الٹ کر فاس ہو گیا۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ چونکہ اس مرغزار میں فاس نامی ندی رواں تھی۔ اس لیے اس ندی کے نام پر اس شہر کا نام فاس رکھا گیا۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ چونکہ تبر کو فاس کہتے ہیں، اور فاس یعنی تبر سے حضرت ادریس ثانی نے خط کھینچا تھا۔ اس لیے اس شہر کا نام فاس مشہور ہوا یہی چوتھی وجہ تسمیہ معلوم ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ شہر فاس کو فیض بھی کہنے لگے، یہاں کی ترکی ٹوپیاں مشہور ہوگئیں۔ فیض ٹوپی، ترکی ٹوپی کہلانے لگی۔

یہ شہر بہت جلد آباد ہوگیا، تقریباً ساٹھ ہزار عرب اندلس کو خیرباد کہہ کر اس شہر میں آبسے۔ انہوں نے شہر فاس کے جس حصہ میں آکر قیام کیا اس کا نام عدوہ اندلس ہوگیا ان کے بعد کچھ عرب قیروان سے آکر آباد ہوگئے۔ اس حصہ شہر کا نام عدوہ قیروان ہوگیا۔ عدوہ کے معنے محلہ کے ہیں۔

ادریس ثانی نے مراکش یعنی مغرب اقصیٰ کی سلطنت کو وسیع کر کے کافی مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ سلطان بھی تھے، اور درویش بھی ان سے بڑی بڑی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ لوگ ان کے محکوم ہی نہیں بلکہ معتقد بھی ہوگئے۔ انہوں نے ۲۱۳ھ میں عین عالم شباب میں چھتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت سے ان کا مزار مرجع خلائق ہوگیا تھا۔

زرقا نے ہاتھ اٹھا کر اور حسین آنکھیں بند کر کے فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ پڑھ کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور سیدھے قدموں واپس آئی تاکہ واپسی میں مزار کی طرف پشت نہ ہو جائے۔

جوں ہی وہ مزار کے کمرہ سے نکلی۔ اور اس نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈالنا چاہا۔ کسی نے اس کی چٹکی بھر کر کہا "شریر تو یہاں ہے"۔

زرقا نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک مہ جبین اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا جمیلہ تم بڑی شوخ ہو"۔

اس نازنین کا نام جمیلہ تھا۔ بڑی حسین اور دلربا تھی، اس نے کہا "ڈھونڈتی ڈھونڈتی تھک گئی۔ اب مشکل سے ہاتھ آئی ہو"۔

زرقا نے مسکرا کر کہا۔ جھوٹی کہاں کہاں ڈھونڈا تو نے مجھے۔؟"

جمیلہ۔ ایک جگہ ڈھونڈا ہو تو بتاؤں۔"

زرقا۔ کب آئی تو تازہ سے؟"

"تازہ ایک شہر کا نام تھا۔ جو فاس۔ سے کچھ فاصلہ پر تھا۔"

جمیلہ نے کہا۔ کل آئی تھی۔ خالو جان لائے تھے، مجھے تو تیرا رنگین افسانہ سننے کا اشتیاق کھینچ لایا ہے۔ سنا ڈال جلدی سے۔"

زرقا۔ پگلی ہو گئی ہے۔ میرا افسانہ ایسا ہے۔ جو ایک دو منٹ میں ختم ہو جائے گھر آنا۔ اطمینان سے بیٹھ کر سننا۔"

جمیلہ:۔ سارے مراکش میں تیرے افسانہ اور تیرے حسن کی شہرت ہو گئی ہے۔"

زرقا۔ خدا برا کرے اس ابن مشعل کا۔ اس کی وجہ سے میں بدنام ہو گئی۔"

جمیلہ نے چٹکی بھر کر کہا۔ بدنام ہو گئی یا نام پالیا۔ اچھا میں دو تین روز میں تیرے گھر آکر ہی تیرا افسانہ سنوں گی۔"

جمیلہ چلی گئی۔ زرقا دالان میں آئی، سعید اور رشید اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گئی۔

پانچواں باب

حملہ

اب یہ دالان کے بڑے دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ اور بھی بہت سے عورتیں اور مرد وہاں کھڑے تھے، یہ سب بارش رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔

بارش اب بھی بہت تیز ہو رہی تھی، کبھی کبھی بادل بھی گرجنے لگتا اور بجلی بھی چمکنے لگتی تھی، روشنی کافی ہو رہی تھی، اور روشنی میں عورتوں کے زرق برق لباس اور بھی جگمگانے لگتے تھے۔

زرقا اور سعید کا خیال تھا کہ مغرب کے وقت سے پہلے واپس لوٹ آئیں گے۔ بارش نے واپسی کی مہلت نہ دی۔

تھوڑی دیر میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ درگاہ میں نماز کا انتظام مردوں کیلئے الگ اور عورتوں کے لیے الگ تھا۔ جب مغرب کی اذان ہوئی تو مرد ایکطرف نماز پڑھنے چلے گئے۔ اور عورتیں ایک طرف چلی گئیں۔

رشید اور سعید دونوں جلدی جلدی وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے سینکڑوں آدمیوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر رشید اور سعید اُٹھے اور چلے۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک درویش انہیں ملے۔ وہ دونوں درویش سے واقف تھے، انہوں نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ درویش نے سلام کا جواب دے کر رشید سے کہا بیٹا رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔"

رشید:۔ "اگر مناسب ہو تو بیان فرمایئے۔"

درویش:۔ "وہ خواب تمہارے ہی متعلق ہے۔"

رشید:۔ فرمایئے۔

درویش :۔ کیا کہوں، میں نے جب سے خواب دیکھا ہے۔ بہت ہی متعجب ہوں۔"

رشید :۔ آپ نے میرا اشتیاق بہت بڑھا دیا۔"

درویش :۔ میں نے دیکھا تم اور میں کسی مقام پر جا رہے ہیں ہم نے ایک خوفناک جانور دیکھا۔ نہایت ہی عجیب نہ تو وہ شیر تھا نہ بھیڑیا مگر تھا۔ درندہ میں نے تمہیں ہوشیار کیا کہ اس جانور سے خبردار رہنا نہ معلوم کیسے میں اور تم دونوں الگ ہو گئے۔ مجھے تمہارا فکر رہا۔ دفعتاً میں نے تمہاری چیخ کی آواز سنی، جھپٹ کر تمہارے پاس پہنچا۔ تو تمہیں اس خوفناک جانور کے چنگل میں پایا۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہیں اس کے پنجوں سے چھڑایا۔

لیکن تم میرے سامنے سے غائب ہو گئے۔ میں تمہیں تلاش کرنے لگا، معلوم تم کہاں چلے گئے، ملے ہی نہیں۔ جب میں تمہارے ملنے سے مایوس ہو چکا تھا۔۔۔ اچانک تم مجھے نظر آئے مگر کس عالم میں، میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ تم نہایت فاخرہ لباس پہنے تھے، سر پر تاج اوڑھے تھے۔ سفید پوشوں کا بڑا بھاری ہجوم تمہارے ساتھ تھا۔ بہت سے برقنداز تھے، بہت سے سوار تھے، میں تمہیں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں آواز دی۔ تم رک گئے۔ تم نے پلٹ کر مجھے دیکھا دیکھ کر مسکرائے۔ اور مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں جھپٹا۔ دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔"

خواب واقعی عجیب تھا۔ رشید نے کہا۔ آپنے اس کی کیا تعبیر لی۔"

درویش بھئی میں نے تو یہ سمجھا ہے کہ تم کوئی جلیل القدر عہدہ پانے والے ہو۔

رشید : حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں جامع قیروین کا ایک طالب علم ہوں جامع قیروین شہر فاس میں ایک بڑی مسجد ہے۔ اس کے چودہ بڑے دروازے ہیں۔ دو سو ستر ۲۷۰ نہایت خوشنما ستون ہیں۔ اور ان ستونوں کی اکیس محرابدار بسی صفیں ہیں۔ چھت نہایت خوبصورت ہے۔ ستونوں کا جنگل سا معلوم ہوتا ہے یہ مسجد اتنی بڑی ہے کہ اس میں بائیس ۲۲ ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں ایک سو تیس ۱۳۰ جھاڑ روشنی کے لیے تھے۔ جن میں سے ہر ایک جھاڑ کی قیمت سات سو سترہ دینار سرخ (تقریباً چھ ہزار روپے) تھی، یعنی سب جھاڑوں کی قیمت سات لاکھ اسی ہزار روپے تھی، بر

جھاڑ میں پانچسو بیس گلاس روشنی کے تھے۔ ماہِ رمضان المبارک میں روزانہ رات کو تمام جھاڑ فانوس روشن ہوا کرتے تھے۔ ان جھاڑوں کی روشنی سے تمام مسجد جگمگانے لگتی تھی۔ فرش وبیزا اور خوبصورت قالینوں کا تھا۔ مسجد کے صحن میں کئی حوض تھے۔ فرش کے نیچے تین طرف نہایت خوشنما باغیچے تھے۔ وضو کے لیے مسجد کے وسط میں سفید بے داغ سنگ مرمر کی نہر جاری تھی۔

دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے بادردی نما سقایہ نہایت خوشنما اور سبک تھے معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ نہر مسجد میں کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاکر غائب ہو جاتی ہے۔ نہر ایسی سفید شفاف اور خوشنما تھی کہ عالم اسلام کے کسی اور شہر میں ایسی نہیں تھی۔"

مسجد کے مینارے زیادہ بلند نہیں ہیں۔ لیکن وہ دہلی کی مسجد کے میناروں کی طرح اندر سے خالی ہیں۔ ان میناروں میں رات کو بارہ بجے سے روزانہ حفاظ چڑھ کر وظائف پڑھنے لگتے ہیں۔ وظائف اور قرآنی آیات بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ ہر حافظ آدھ آدھ گھنٹہ بعد بدل جاتے ہیں (اس زمانہ میں بھی شہر فاس کی مشہور مسجد قیر دوین میں رات کو حفاظ وظائف اور آیات قرآنی بہ آواز بلند پڑھتے ہیں۔ اور آدھ آدھ گھنٹہ کے بعد بدل جاتے ہیں (صادق۔ صدیقی۔ سردھنوی اس مسجد کو فاطمہ فہری نے تعمیر کرایا تھا۔ فاس میں آباد ہونے کے لیے جو لوگ باہر سے آتے تھے۔ ان میں ایک مالدار سوداگر محمد الفہری تھے، جب ان کا انتقال ہوا۔ تو انہوں نے کافی دولت چھوڑی۔ ان کے صرف دو لڑکیاں فاطمہ اور مریم تھیں ان دونوں بہنوں نے شہر فاس میں دو مسجدیں تعمیر کرائیں۔ فاطمہ فہری نے تو مسجد قیر دوین تعمیر کرائی اور مریم نے جامع اندلس تعمیر کرائی۔ جامع اندلس بھی بہت بڑی مسجد تھی لیکن جو بات مسجد قیر دوین میں تھی۔ وہ جامع اندلس میں نہ تھی۔

درویش نے کہا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم جامع قیر دوین کی یونیورسٹی دار العلوم) کے طالب علم ہو، لیکن کیا علمائے نے بڑے بڑے عہدے حاصل نہیں کیے۔ بہت ممکن ہے کہ خدا تمہیں بھی کسی بڑے عہدہ پر پہنچا دے۔"

رشید: ہاں خدا میں سب کچھ قدرت ہے۔

درویش: میری دعا ہے کہ خدا تمہیں عہدہ جلیلہ پر پہنچائے۔

رشید نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ چلے گئے۔ یہ دونوں دالان میں آئے اور زرقا کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔

نماز کے بعد زرقا کو کئی بڑے گھرانوں کی بیگموں نے روک لیا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگیں۔ معمولی باتیں۔ دراصل زرقا بہت ہی خوبصورت اور پری پیکر تھی۔ عورتیں بھی اس سے محبت کرتی تھیں۔ وہ شوخ بھی تھی، اس کی باتوں میں دلچسپی لیتی تھیں ——

وہ ایک دم اٹھی۔ اس نے کہا۔ بھائی جان انتظار کر رہے ہونگے۔"

وہ سلام کر کے چلی آئی۔ سعید اور رشید دونوں اس کا انتظار کر رہے تھے سعید نے کہا "آگئیں تم زرقا — ؟"

زرقا :۔ جی آگئی۔ کیا بارش رک گئی ہے۔ ؟"

سعید :۔ ہاں رک گئی ہے۔ آؤ جلدی چلیں۔"

تینوں چلے اور درگاہ کے دونوں صحن طے کر کے اصطبل میں آئے وہاں سے گھوڑے لیے۔ ایک گھوڑے پر زرقا سوار ہو گئی۔ رشید نے سعید سے کہا "آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔"

سعید :۔ نہیں میں اور تم پیدل چلیں گے۔"

چنانچہ سعید نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور دونوں باتیں کرتے ہوتے چلے۔ زرقا بھی چلی۔ چونکہ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کافی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ابھی یہ لوگ شارع بخارین تک نہیں پہنچے تھے کہ کچھ کھٹکا ہوا۔ سعید نے پلٹ کر دیکھا انہیں خنجر کی جھلک نظر پڑی، اسوقت بجلی چمکی۔ سعید نے دیکھا کہ وہی وحشی انسان جس نے اس کو دھمکی دی تھی، رشید پر خنجر سے وار کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے جلدی سے کہا "رشید بچنا"

مگر فوراً ہی رشید کے شانہ پر خنجر پڑا، انہوں نے آف کہا۔ وحشی انسان بھاگا۔ سعید نے رشید کی آواز سن لی تھی، وہ جلدی سے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر وحشی انسان کے پیچھے دوڑے۔ رشید کھڑے نہ رہ سکے بیٹھ گئے۔ زرقا گھبرا کر گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا رشید۔ ؟"

رشید ابتک ضبط کر رہے تھے۔ اب نہ ہو سکا۔ وہ کراہے اور انہوں نے منہ چاہا۔ زرقا جلدی سے ان کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اور ان کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔"

چھٹا باب

گرفتاری

سعید انگوٹھوں کے بل دوڑ رہے تھے تاکہ ان کے قدموں کی چاپ آگے بھاگنے والے تک نہ پہنچ سکے۔ وہ اپنے آگے بھاگنے والے کے بھاری قدموں کی آواز برابر سن رہے تھے، وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔

بھاگنے والے نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ کھیتوں میں جا گھسا تھا بجلی کے چمکنے پر انہوں نے اسے اس طرف دوڑتے ہوتے دیکھا، وہ اور تیز دوڑے۔ سامنے چند جھاڑیاں آگئیں۔ بھاگنے والا ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ سعید بھی گھس گئے۔

سعید نے اپنے پیچھے بھی بھاری قدموں کی آواز سنی۔ وہ ایک جھاڑی کے قریب ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ اور آنے والے کو دیکھنے لگے۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تو، پھر بجلی چمکی، انہوں نے ایک مسلمان کو اپنے قریب آتے ہوتے دیکھا انہوں نے آہستہ سے کہا "کون ہے؟"

آنے والے نے کہا "سعید کیا تم ہو ہے؟"

سعید :۔ ہاں میں ہوں۔ آہستہ بولو عبدالرحمٰن"

ان نئے آنے والے کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ وہ سعید کے جاننے والے تھے ان کے پاس آئے۔ اور پوچھا۔ کیا معاملہ ہے۔ ؟ تمہارے آگے کون بھاگا جا رہا تھا ــــ

سعید نے جلدی سے کہا "میں اس ملعون کو نہیں جانتا۔ اس نے رشید پر وار کیا ہے۔ وہ یہیں کہیں ان جھاڑیوں میں گھس گیا ہے۔ اسے تلاش کرو۔

عبدالرحمٰن :۔ آؤ۔

سعید :۔ بولو بالکل نہیں۔ نہ پیروں کی چاپ ہونے دو۔

دونوں بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے چلے۔ جھاڑیوں میں گھس گئے۔ انہوں نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ جو شخص ایک نیک انسان پر وار کر کے آیا ہے۔ وہ ان پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔

وہ دونوں نہایت آہستگی سے تلاش کرنے لگے۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔ اور تمام جنگل اس قدر روشن ہو جاتا تھا۔ جیسے آگ لگ گئی ہو، ایک مرتبہ پھر بجلی چمکی انہوں نے ایک جھاڑی کے قریب ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔

عبدالرحمٰن نے آہستہ سے کہا "تم نے دیکھا۔ وہ شخص بیٹھا ہے"

سعید نے آہستگی سے جواب دیا "جی ہاں دیکھ لیا۔ ایک طرف سے تم چلو دوسری طرف سے میں آتا ہوں"

دونوں الگ ہو گئے۔ اور الگ الگ سمتوں سے اس جھاڑی کی طرف بڑھنے لگے، جس کے قریب انہوں نے کسی کو بیٹھے دیکھا تھا۔!

چونکہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی بارش ہو چکی تھی۔ اس لیے زمین نم تھی، اور جھاڑیاں اور گھاس بھیگی کھڑی تھیں، ان لوگوں کے زیر ناف تک لباس تر ہو گئے تھے۔ بلکہ ٹانگیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

یہ نہایت آہستگی سے مخالف سمتوں سے بڑی ہوشیاری سے بڑھ رہے تھے انہیں یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ اس جھاڑی کو چھوڑ کر جس کے قریب کسی بیٹھے دیکھا تھا۔ کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔

ایک دفعہ پھر بجلی چمکی اور انہوں نے دیکھا کہ وہ ٹھیک چل رہے ہیں۔ وہ شخص ایک جھاڑی کے پاس ابھی تک بیٹھا ہے۔ انہیں تعجب ہوا کہ وہ اس طرح کیوں بیٹھا ہے، بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ کیا وہ اس بات سے مطمئن ہے کہ کسی نے اسے نہیں دیکھا یا کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔

ان دونوں میں پہلے سعید اس کے پاس پہنچے انہوں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ اے خدائے موسیٰ تیرا شکر ہے۔ میں نے آج اپنے آقا کا انتقام لے لیا۔ اس بدکار کافر مسلمان کو مار ڈالا جس نے تیرے ایک موسیٰ کے فدائی کو ستایا تھا میرے پیر میں موچ آ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میرے تعاقب میں ایک کافر لگا چلا آ رہا ہے۔ مگر اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ کوئی خوف نہیں ہے۔ مجھے جو کرنا تھا۔ میں وہ کر چکا کافر مجھے گرفتار کریں۔ مار ڈالیں یا میری کھال اُدھیڑ ڈالیں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے"۔

سعید سمجھ گئے کہ اس نے رشید پر انتقام کے جوش پر حملہ کیا ہے۔ ان کا دل دھک سے ہو گیا کہ کہیں رشید پر اس وحشی کا وار کاری تو نہیں پڑ گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ اس کے پیر میں موچ آ گئی ہے۔ اور اس لیے وہ مجبوراً چپ چاپ بیٹھا ہے۔

وہ اس کے قریب پہنچے۔ اس کے ہاتھ میں خنجر اب بھی چمک رہا تھا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں خنجر تھا۔ وہ شخص خوف سے ایک دم چیخ اٹھا۔ سعید نے اس کا ہاتھ مروڑ کر خنجر چھین لیا۔

اس وقت عبدالرحمٰن بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی اس کی باتیں سن لی تھیں وہ رشید کو بھی جانتے تھے۔ انہیں غصہ آ گیا تھا۔ انہوں نے اس کی کمر میں ایک گھونسا مارا وحشی انسان دوہرا ہو گیا اور چلا اٹھا۔ اس بیدردی سے نہ مارو مجھے"۔

عبدالرحمٰن نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھٹکا دے کر اٹھایا اور کہا۔ "برا ہو تیری اس ماں کا جس نے تجھے جنا تو نے ایک مسلمان پر وار کیا۔ اُٹھ"۔

یہ وہی وحشی تھا جو سعید کو ایک مرتبہ راستہ میں ملا تھا۔ اور زرقا نے جسے درگاہ میں دیکھ کر رشید کو بھی دکھایا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرے پیر میں موچ آ گئی ہے۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔

عبدالرحمٰن نے اس کی ٹھوڑی میں گھونسہ مار کر کہا۔ اٹھ او ملعون زادہ اٹھ ورنہ ابھی تیرا بھیجہ توڑ ڈالوں گا"۔

جان کے خوف سے وحشی کھڑا ہوا۔ مگر اس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ پھر بیٹھنے لگا۔ عبدالرحمٰن نے اس کی چھاتی پر گھونسہ مار کر کہا۔ "نخرے کر رہا ہے۔ بدمعاش ہمارے ساتھ چل۔ ورنہ گھونسے مار مار کر تیرا بھرتہ کر دوں گا"۔

وحشی نے چلا کر کہا۔ اررر ـــــ میری پسلی توڑ دی۔ ظالمو! مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے۔"

عبدالرحمن۔ ذلیل کتے یا تو سیدھی طرح چل ورنہ تجھے کتے کی طرح کھینچ کر لے چلیں گے۔

جوش اور غصہ تو سعید کو بھی بہت آرہا تھا۔ مگر وہ قدرے حلیم مزاج تھے۔ انہوں نے کہا۔ عبدالرحمن! اسے ایسا نہ مارو جس سے یہ مر جائے۔ ہم اسے یہاں سے لیجا کر سرکاری آدمیوں کے حوالہ کر دیں گے وہ اس کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں کریں۔

عبدالرحمن:۔ مگر یہ اونٹ کا اونٹ نخرے دکھا رہا ہے۔ چلتا نہیں ہے۔

سعید نے وحشی سے کہا" اگر تم سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو تو ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے ورنہ تمہارا یہ خنجر جس سے تم نے رشید پر وار کیا ہے۔ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اسے تمہارے سینہ میں اتار دوں گا۔ اور تمہاری لاش یہیں جھاڑیوں میں ڈال جاؤں گا۔"

وحشی نے کہا" مجھے یہ بتا دو کیا وہ نوجوان جس پر میں نے وار کیا تھا۔ زندہ ہے یا مر گیا ہے"

سعید:۔ مجھے معلوم نہیں ان کا کیا حال ہے۔ تو ان پر وار کر کے بھاگا۔ میں تیرے پیچھے دوڑ پڑا۔ لیکن بدبخت تو نے اس نیک اور پرہیزگار آدمی پر کیوں حملہ کیا ہے"

وحشی ۔ وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اُس نے اِس گھر کو تباہ کیا ہے جس کا تعلق مجھ سے بھی تھا۔ اچھا چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

وہ اپنے پیر گھسیٹتا ہوا ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔

جبکہ سعید وحشی کے پیچھے دوڑے اور زرتا نے رشید کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اس وقت رشید پر نیم بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ زرتا کو بڑا قلق تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ رشید کی کیا کیفیت ہے۔ زخم کہاں آیا ہے۔ سانس کس طرح چل رہا ہے"

وہ خود بڑی نازک اندام تھی۔ رشید جیسے کڑیل نوجوان کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھی، مگر اسوقت نہ معلوم اس میں کہاں سے اتنی قوت آگئی تھی کہ وہ ان کا سر اپنے کندھے پر رکھے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اُس نے ان کے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنی نازک حسین اور مخروطی انگلیوں سے

ان کا سینہ ٹٹول کر سانس کا اندازہ کرنے لگی۔ رشید کو اس وقت ہوش آگیا۔ انہوں نے زور سے ٹھنڈا سانس لیا۔ زرقا نے کہا "خدا تیرا شکر ہے۔"

رشید کے حواس رفتہ رفتہ درست ہونے لگے، انہوں نے زرقا کی آواز سن لی۔ اور یہ بھی محسوس کر لیا۔ کہ وہ اس کے نرم اور گداز جسم سے لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ زرقا، یہ کیا —— تم مجھ سے ملی ہوئی بیٹھی ہو۔"

زرقا۔ کیا ہرج ہو گیا اس میں۔

رشید۔ میں تمہارے لیے نامحرم ہوں، ہمارا مذہب مجھے اور تمہیں اِس طرح بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

یہ کہتے ہی وہ سیدھے ہو گئے۔ اِس سے اِن کے زخم کو ٹھیس لگی۔ کچھ کسک ہوئی، مگر وہ ضبط کر کے سیدھے ہو بیٹھے۔ اس وقت سعید آگئے، زرقا اُٹھ کھڑی ہوئی، سعید نے کہا۔ زرقا، کیا حال ہے رشید کا۔"

زرقا نے جواب دیا —— یہ بیہوش ہو گئے تھے۔ ابھی ہوش آیا ہے۔"

سعید: ۔ خدا کا شکر ہے حملہ آور وحشی پکڑا گیا۔ عبدالرحمٰن اسے سرکاری آدمیوں کے حوالہ کرنے اس کے ساتھ گئے ہیں۔ میں نے اور عبدالرحمٰن نے وحشی کو پکڑا ہے۔"

انہوں نے رشید سے ان کے زخم کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ زخم تنا نہ پڑا ہے۔ سخت تکلیف ہے۔ سعید نے ان کے زخم پر اپنا پٹکہ کھول کر باندھا۔ انہیں اپنے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ زرقا اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی، سعید رشید کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر چلے۔ زرقا اس کے دوسری طرف ساتھ ساتھ چلی۔

ساتواں باب

ڈاکٹر عثمان

سعید، رشید کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر پہنچے۔ سعید کے باپ مکان کے دروازے میں کھڑے اپنے بیٹے اور بیٹی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا نام صالح تھا، بڑے نیک دیندار اور پرہیزگار تھے، سید تھے، خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ انہوں نے کہا۔

" بیٹا سعید، بہت دیر کر دی واپس آنے میں "

سعید نے جواب دیا" جی ہاں ابا جان دیر ہو گئی، ایک حادثہ پیش آگیا "

" حادثہ"، صالح نے متعجب ہو کر کہا۔ پھر بولے" کیا حادثہ پیش آیا ؟

سعید۔ کسی بدبخت نے رشید کو زخمی کر دیا "

صالح نے دلی رنج کو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ رشید کو زخمی کر دیا۔ ؟ کہاں ہیں وہ۔"

سعید:۔ میں ساتھ لایا ہوں انہیں "

سعید نے سہارا دے کر رشید کو اتارا۔ رشید نے بزرگ صالح کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیکر جلدی سے ان کے پاس آئے۔ پوچھا۔ کہاں زخم آیا ہے بیٹا "

رشید نے جواب دیا۔ شانہ پر آیا ہے۔ میرا خیال ہے شانہ کٹ گیا ہے "

وہ سعید کے سہارے سے چلے۔ صالح نے بھی سہارا دیا۔ اور چلتے چلتے پوچھا۔

کس ظالم نے یہ حرکت کی۔؟"

رشید: میں نے دیکھا نہیں اسے"۔

سعید: وہ ایک وحشی ہے۔ کوئی غلام معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس کا تعاقب کیا عبدالرحمٰن بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ ہم دونوں نے اسے پکڑ لیا اور سرکاری آدمیوں کے حوالہ کر دیا۔

یہ دونوں انہیں لیکر ایک خوشنما کمرہ میں پہنچے۔ سید صالح متوسط طبقہ کے لوگوں میں تھے۔ نہ تو وہ غریب تھے اور نہ دولت مند۔ ان کا مکان اچھا تھا۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ اور ہر کمرہ میں معمولی درجہ کا فرنیچر اور آرائشی سامان تھا۔

رشید کو بستر کر کے لٹا دیا گیا۔ صالح نے سعید سے کہا" بیٹا اسمٰعیل کو بھیجو اور تاکید کرو کہ جلدی ڈاکٹر عثمان کو لے کر آجائیں"۔

اسمٰعیل اس گھر کا پرانا اور وفادار غلام تھا، سعید چلے گئے۔ صالح رشید کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں زرقا لباس بدل کر اپنی والدہ فاطمہ کے ساتھ آئی فاطمہ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ ان کے چہرہ سے لسنی وقار ظاہر تھا۔ اس عمر میں بھی وہ کافی شکیل معلوم ہو رہی تھیں۔ جوانی میں یقیناً بہت زیادہ خوبصورت ہونگی۔

کمرہ میں ایک جھاڑ روشن تھا۔ اس میں کئی بتیاں روشن تھیں۔ رشید نے فاطمہ کو سلام کیا۔ انہوں نے دعا دیکر کہا۔ بٹیا مجھے زرقا نے ابھی بتایا کہ کسی بدبخت نے تمہیں زخمی کر دیا ہے۔ کون تھا وہ ظالم"۔

رشید۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہے۔

فاطمہ۔ خدا اس سے سمجھے، کیسے نیک نوجوان کو ستایا ہے۔ اس نے یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا کہ یہاں چلے آئے۔

زرقا اور فاطمہ دونوں دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں زرقا نے اس وقت نہایت باریک سا ریشمیں نقاب اپنے چہرہ پر ڈال رکھا تھا۔ جس کی شعاعیں چھن چھن کر نقاب سے نکل رہی تھیں۔ کبھی کبھی جب وہ سر کو ایک دلفریب ادا کے ساتھ جھٹکا دے کر کسی طرف مخاطب ہوتی تھی، تو چہرہ کا کچھ حصہ کھلنے سے بجلی سی چمک جاتی تھی ــــــ

فاطمہ نے صالح سے دریافت کیا" کیا کسی ڈاکٹر کو بلایا ہے۔؟"

صالح نے جواب دیا" ہاں ڈاکٹر عثمان کو بلایا ہے"
اس وقت بادل گرجنے لگا اور بجلی جلدی جلدی چمکنے لگی۔ بارش کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

زرقا نے کہا۔ بارش شروع ہو گئی ہے۔ بھائی جان کمبل لے کر نہیں گئے وہ پہلے بھی بھیگ چکے ہیں۔ کہیں ٹھنڈ کا اثر نہ ہو جائے۔

صالح نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔ اسے بھی تو اپنے ہی جیسا نازک سمجھتی ہے۔ وہ مرد ہے مرد"

زرقا نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا" مرد ہے۔ مرد گویا مردوں پہ ہوا بارش اور دھوپ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔"

صالح۔ ہوتا ہے مگر عورتوں کے مقابلہ میں بہت کم اور تجھ جیسی لڑکیوں کے مقابلہ میں تو بالکل ہی نہیں ہوتا"

زرقا۔ جی۔ مگر میں نے تو مردوں ہی کو نزلہ اور زکام میں مبتلا دیکھا ہے۔ فاطمہ نے صالح سے مخاطب ہو کر کہا" جانتے ہو کہ تمہاری یہ لاڈلی اپنی بات کی تائید کیے جائیگی۔ دلیل پر دلیل دیتے جائے گی۔ اور پھر اس سے بحث سی شروع کر دی" زرقا نے فاطمہ سے کہا۔ گویا میں سخن پرور ہوں۔ ضدی ہوں"

فاطمہ نے ہنس کر کہا۔ بیٹی۔ میں تجھے کہاں جیت سکتی ہوں میں ٹھہری پرانے زمانہ کی۔ شاید تیرا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے"

زرقا:۔ تجربہ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ سوال ہے مردوں کی مردانگی کا اور ان کی مردانگی یہ ہے کہ دھوپ ہوا اور بارش کا ان پر اثر نہیں ہوتا ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں پر جلد اثر ہوتا ہے۔

فاطمہ:۔ دیکھ وہ بیٹھے ہیں۔ تیرے ابا جان ان ہی سے بحث کر تو"

زرقا نے صالح سے مخاطب ہو کر" کیوں ابا جان یہی بات ہے نہ"

صالح نے ہنس کر کہا۔ بات تو یہی ہے۔ مگر یہ وقت ایسے مباحثوں کا تو نہیں ہے

زرقا۔ جب بحث شروع کر دی۔ تو وقت اور غیر وقت کی کیا بات"

فاطمہ نے مسکرا کر صالح سے کہا۔ مان لو نہ تم ہی زرقا کی بات"

صالح ۔ اچھا مانے لیتا ہوں۔"

زرقا ۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

فاطمہ ۔ ارے بھئی انہوں نے یہ مان لیا کہ تم جیسی لڑکیوں پر بھی اثر نہیں ہوتا اور کیا منوانا چاہتی ہے۔ تو عجیب منطقی لڑکی ہے۔"

زرقا:۔ میں منطقی نہیں ہوں۔ امی جان تمہیں معلوم نہیں یہ مرد اپنے آپ کو بڑے سورما سمجھتے ہیں۔ عورتوں کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔"

فاطمہ نے ہنس کر کہا۔ یہ ان کی غلطی ہے۔"

صالح نے قہقہہ لگا کر کہا، چلو ماں بیٹی نے فیصلہ کر دیا۔"

اس وقت سعید کمرہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ڈاکٹر عثمان آگئے ہیں۔

فاطمہ:۔ اچھا بیٹا پہلے تم کپڑے بدل ڈالو۔"

زرقا ۔ کیوں ان پر بارش کا کیا اثر ہوگا۔ یہ تو مرد ہیں۔

فاطمہ اور صالح ہنس پڑے۔ سعید نے کہا۔ پردہ کر لو۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتا ہوں۔"

فاطمہ اور زرقا اُٹھ کر چلی گئیں۔ سعید، ڈاکٹر عثمان کو لے کر آئے۔ وہ ایک چمڑہ کا بکس ہاتھ میں اٹھائے آرہے تھے۔ انہوں نے بکس دوسرے پلنگ پر رکھا آستینیں چڑھائیں اور رشید کے پاس آئے۔

رشید کے شانہ میں زخم آیا تھا۔ جو عبا وہ پہنے تھے، اسے اتارنا مشکل معلوم ہوا۔ ڈاکٹر عثمان نے اوّل ٹیکا کھولا۔ پھر قینچی لے کر عبا کی آستین اور کندھے کے نیچے کا حصہ کاٹ ڈالا۔ جب عبا کو الگ کرنا چاہا تو وہ زخم سے چپک گئی تھی۔ وہ رک گئے رشید نے کہا۔ رکیئے نہیں، جھٹکا دے کر عبا الگ کر دیجئے۔

فاطمہ دیوار سے لگی کھڑی تھی، انہوں نے کہا۔"عبا کھینچئے نہیں۔ انہیں تکلیف ہوگی گرم پانی موجود ہے۔ اس سے تر کر کے چھڑا لیجئے۔"

ڈاکٹر:۔ نہیں میں تیل استعمال کروں گا۔"

انہوں نے بکس کھول کر ایک شیشی نکالی، اس میں سے تیل عبا پر ڈال کر اس جگہ کو تر کر [illegible] تھوڑی دیر میں آسانی سے عبا کا کونا کھینچ لیا۔ اب انہوں نے ایک

دوا سے زخم صاف کر کے دیکھا۔ زخم کچھ گہرا تھا۔ کئی نسیں کٹ گئی تھیں انہوں نے عمل جراحی کیا اور زخم پر کوئی دوا لگا کر پٹی کس دی۔

وہ نہایت ہوشیار اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، اکثر زخموں کا علاج کرتے رہتے تھے، کبھی کبھی رضا کارانہ طور پر فوج کے ساتھ بھی چلے جاتے تھے۔ اور زخمیوں کا علاج کرتے تھے۔

انہوں نے صالح سے کہا، زخم گہرا ہے۔ کئی دن میں بھر سکے گا۔ آج رات بھر ان کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے۔ یہ کروٹ نہ لینے پائیں، میرا خیال ہے۔ انہیں بخار ہو جائے گا۔ ممکن ہے غفلت زیادہ ہو جائے۔ گھبرایئے گا۔ نہیں۔ میں صبح آ کر پھر دیکھوں گا۔"

وہ چلنے لگے رشید نے عبا کی جیب سے چند درہم نکال کر سعید کو دیئے اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب کو نذرانہ تو دید یجیئے۔"

ڈاکٹر عثمان نے سُن لیا۔ انہوں نے کہا" مولوی رشید کیا میں تمہارے کارنامہ سے واقف نہیں ہوں۔ اِس گھرانہ سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ تم نے اِس خاندان پر نہیں۔ بہت سے خاندانوں پر احسان کیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ میں رات بھر تمہارے پاس رہ کر تمہاری تیمارداری کروں۔ مگر پیشہ ایسا ہے کہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ نہ معلوم کون کس وقت آ جائے۔ اچھا سلام عرض کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عثمان چلے گئے۔ رشید نے کہا" میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھے نادار سمجھ کر نذرانہ نہیں لیا۔

سعید:۔ یہ بات نہیں ہے جو کچھ انہوں نے کہا وہ ٹھیک کہا۔ ہمارے ان کے تعلقات گھر کے سے ہیں۔ اِس لیے میں نے انہیں نذرانہ نہیں دیا تھا۔ وہ خفا ہو جاتے۔ تمہارے احسان کا صرف انہیں ہی نہیں بلکہ فاس کے تمام لوگوں کو معلوم ہے۔ تم اپنے دِل میں کوئی خیال نہ کرو۔

رشید خاموش ہو گئے۔ سعید کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ وہ کپڑے بدلنے چلے گئے۔ صالح ان کے پاس بیٹھے رہ گئے۔

آٹھواں باب

حسین تیماردار

کچھ دیر کے بعد ان لوگوں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ رشید نے بھی تیمم کر کے اشاروں سے نماز ادا کرلی۔ صالح اور ان کے گھر والوں نے کھانا بھی کھا لیا۔ رشید کو دودھ دیا گیا۔ انہوں نے لیٹے ہی لیٹے بڑی مشکل سے تھوڑا دودھ لیا۔

ایک تو رشید کو کافی تکلیف تھی، دوسرے دودھ پینے سے کچھ غفلت لگ گئی۔ اس پر ضعف طاری ہوگیا اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ کچھ دیر کے بعد فاطمہ، زرقا اور سعید بھی آگئے۔ صالح ان سے پہلے سے بیٹھے ہوتے تھے۔ سعید نے کہا۔ کیا سو گئے بھائی رشید۔؟"

فاطمہ نے ان کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں بند دیکھ کر انہوں نے کہا "سو گئے معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہوا سو گئے۔ تکلیف کا احساس کم ہو جاتے گا۔"

اب صالح رشید کی طرف متوجہ ہوتے۔ انہوں نے انہیں دیکھا اس عرصہ میں سعید اور سب بیٹھ گئے تھے۔ صالح نے کہا "وہ سو نہیں سکتے۔ انہیں تکلیف زیادہ ہے۔ سو کیسے جائیں گے۔"

صالح نے جھک کر دیکھا، ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اور نبض دیکھی۔ انہوں نے کہا۔ انہیں بخار ہوگیا۔ اور بخار سے غفلت ہوگئی ہے۔"

زرقا نے یہ سُن کر کہ وہ سو گئے ہیں۔ نقاب اُلٹ دیا۔ اب جب سنا کہ ان

پر غفلت طاری ہوگئی۔ تو وہ چونک پڑی، اس کی حسین آنکھوں سے خوف اور دلربا چہرہ سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ لیکن وہ چپ رہی۔

فاطمہ نے بھی ان کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ انہوں نے کہا" واقعی انہیں تو تیز بخار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر عثمان کو پھر بلانا چاہیئے"۔

صالح:۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر عثمان کہہ گئے تھے کہ انہیں بخار ہو جائے گا۔ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر غفلت زیادہ ہو جائے۔ تو گھبرانہ جانا۔ البتہ رات بھر ان کی حفاظت اور نگرانی کی ضرورت ہے۔ یہ کروٹ نہ لینے پائیں"۔

سعید:۔ میں رات بھر حفاظت اور نگرانی کروں گا"۔

فاطمہ:۔ ضرور کریئے گا۔ رات کو بستر پہ پڑ کر خبر تو رہتی نہیں۔ رشید کی حفاظت اور نگرانی کریئے گا"۔

صالح:۔ بھئی نیند کا تو میں بھی کچا ہوں، ایسا کرو پہرہ مقرر کر لو۔ ہم چار آدمی ہیں، سعید کو تو رہنے دو، میں فاطمہ اور زرقا رہ جاتے ہیں۔ تہائی تہائی رات پہرہ دے لیں گے۔ غلام بیچارہ سارا دن مُجتا رہتا ہے۔ اسے بھی آرام کرنے دو"۔

زرقا:۔ بس ختم ہوگئی۔ مردوں کی مردمی۔ سعید کو تو رہنے دو۔ یہ تو مرد ہیں۔ ساری رات جاگ کر پہرہ دے سکتے ہیں"۔

صالح مسکرائے۔ انہوں نے کہا" ابھی تک شام کا غصہ باقی ہے"۔

زرقا:۔ غصہ نہیں۔ مردوں کو ناز ہے۔ اپنی مردانگی پر"۔

سعید:۔ تم کہتی ہو تو میں تنہا ساری رات جاگوں گا۔ اور پہرہ دوں گا"۔

زرقا:۔ بہت جاگیئے گا۔ یہ خدا نے عورتوں ہی کو قوت دی ہے کہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیں۔ تیمارداری عورتوں سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا۔

سعید:۔ تمہیں اپنے جاگنے پر ناز ہے۔ تو میرے ساتھ آج رات بھر بیٹھ کر جاگو۔

زرقا نے مسکرا کر کہا" اچھی بات ہے۔ امتحان ہو جائے گا"۔

سعید:۔ امتحان؟ ایک ہفتہ تک رات رات بھر جاگ سکتا ہوں۔ پورے ایک ہفتہ

زرقا:۔ اسی لیے تو کہتی ہوں، آج امتحان ہو جائے گا، امی جان آپ اور ابا جان، آپ بھی آرام کریں۔ ہم دونوں نگرانی کر لیں گے"۔

صالح :۔ تم جانو "

زرقا ۔ آپ اطمینان رکھیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بھائی جان سوئیں گے یہ تنہا نگرانی کرلوں گی "

سعید :۔ کون سو جائے گا ۔ بس خوب کہی ۔ دیکھنا تم سوتی ہو یا میں ۔

زرقا :۔ میں تو عورت ہوں ، سو بھی سکتی ہوں ، تم البتہ مرد ہو ، تمہیں نہیں سونا چاہیئے :

سعید : اور میں ہرگز نہ سوؤں گا "

تھوڑی دیر بعد فاطمہ اور صالح اٹھ کر چلے گئے ۔ زرقا اور سعید بیٹھے رہ گئے اگرچہ اس وقت بارش نہیں ہو رہی تھی ، لیکن بادل اب بھی گرج رہا تھا ، اور بجلی چمک رہی تھی ۔

تہائی رات تک تو سعید اکڑے بیٹھے رہے ۔ لیکن جب رات بھیگنے لگی تو انہیں جمائیاں آنے لگی ، آنکھوں میں نیند گھل گئی ۔ وہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح کبھی رشید کو اور کبھی زرقا کو دیکھنے لگے ۔ زرقا ان کی کیفیت دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتی جاتی تھی

جب وہ جلدی جلدی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے لگے تو زرقا نے کہا ۔ لیٹ جایئے بھائی جان "

سعید :۔ کیا لیٹ جائیں ——— رات بھر جاگنا تو بہت ہی واہیات بات ہے ۔ اکیلے بیٹھے مکھیاں مارے جاؤ "

زرقا نے سریلا قہقہہ لگا کر کہا " مکھیاں اس وقت کہاں سے آئیں یہ رات ہے رات مکھیاں نہیں ہوتیں "

سعید ۔ رات کو تو کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ سوائے وحشت ناک سکون اور خاموشی کے ۔ بیٹھے رہتے اور دیکھتے رہو ۔ یہ بھی کوئی کام ہوا "

زرقا :۔ بالکل نہیں ۔ تم مرد ہو ۔ مردوں کا یہ کام نہیں ہے ۔

سعید :۔ یہی بات ہے ۔ مرد اپنا کام کر سکتے ہیں ۔ عورتیں اپنا یہ کام تمہارا ہی ہے "

زرقا ۔ اور میں اس کام کو کرلوں گی ، تمہیں نیند آرہی ہے جا کر سو جاؤ "

سعید :۔ مگر تم تنہا ڈر تو نہ جاؤ گی۔"

زرقا :۔ بے فکر رہو۔ میں نہیں ڈر سکتی۔"

سعید :۔ اگر خوف معلوم ہو۔ نیند لگے، یا رشید کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے جگا لینا۔

زرقا :۔ بہت اچھا۔ مگر میرا خیال ہے۔ تمہیں جگانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

سعید اکتا ہی رہے تھے، جلدی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اب زرقا تنہا رشید کے پاس رہ گئی۔ وہ ان کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی، دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اور رشید کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ [illegible] تپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اور کہا۔ اُف کس قدر تیز بخار ہے۔ ماتھا کیسا جل رہا ہے۔ بخار ہی کی وجہ سے انہیں غفلت ہے۔"

اُسنے کچھ سوچا اور اپنے کمرے میں جا کر خوشبودار تیل کی شیشی لائی، رشید کے سر سے عمامہ ڈاکٹر نے آتے ہی اتار لیا تھا۔ اُس نے تیل ہتھیلی پر ڈالا، اور جھک کر آہستگی اور نرمی سے مالش کرنے لگی۔

کافی دیر تک مالش کرنے کے بعد ٹھنڈا پانی ہاتھ کی ہتھیلی میں لے کر آہستہ آہستہ دو تین مرتبہ ملا اور پھر رومال سے سر صاف کر دیا، اپنے ہاتھ بھی پونچھ ڈالے وہ پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی اور کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اُس نے پھر جھک کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسوقت اسے بخار تیز نہیں معلوم ہوا۔

جب وہ جھکی ہوئی ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی، دفعتًہ اس زور سے بادل گرجا کہ وہ ڈر کر ناوانستگی میں ان پر بھی جھک گئی۔ اسوقت رشید نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ حور جمال زرقا کو پہچان گئے، ابتک وہ ان کے اُوپر جھکی تھی۔ اور اس کا نازک ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔ اُس نے نہایت خوشبودار اور مفرح قلب عطر اپنے لباس میں لبسا رکھا تھا، رشید چند لمحوں تک دیکھتے رہے پھر انہوں نے نحیف آواز میں کہا "زرقا ——"

زرقا چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ شرمسار نظر آنے لگی۔ رشید نے کہا۔

بیٹھ جاؤ زرقا۔"

وہ سامنے بیٹھ گئی۔ اسے نقاب کا خیال نہیں رہا۔ بادل پھر گرجا رشید نے کہا۔

تم ڈر تو نہیں گئیں زرقا۔"

زرقا:۔ سچ پوچھتے ہو تو میں ڈر ہی گئی تھی۔ تم غفلت میں تھے۔ بخار تیز تھا۔ میں تمہاری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بادل بڑے زور سے گرجا۔ میں ڈر کر تم پر جھک گئی۔"

رشید:۔ مگر تم ابتک جاگ کیوں رہی ہو۔"

زرقا:۔ ڈاکٹر کہہ گئے تھے کہ رات کو خاص طور پر نگرانی رکھی جائے۔"

رشید:۔ اچھا —— تم میری نگرانی کر رہی تھیں۔ شکریہ ایک بات کہوں زرقا۔"

زرقا:۔ کہو۔

رشید:۔ مجھ پر اس قدر مہربانی نہ کرو۔ تم خوب جانتی ہو۔ میں ایک مفلوک الحال طالب علم ہوں، تمہارے احسان کا بدلہ نہ چکا سکوں گا۔

زرقا نے شرمیلی۔ مگر ہوشربا نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا تم جو احسان کر چکے ہو۔ اس کا بدلہ ہی نہیں ہو سکتا۔"

رشید:۔ اس کا ذکر نہ کرو۔ سنو۔ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ آج شیخ یعقوب درویش زرکا خانہ مل گئے تھے۔ شاید تم نے انکا نام سنا ہے۔"

زرقا۔ سنا ہے۔

رشید:۔ انہوں نے مجھ سے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا۔"

رشید نے وہ تمام خواب جو درویش نے ان سے کہا تھا۔ بیان کیا زرقا بڑے توجہ سے سنتی رہی۔ اس کی حسین نگاہیں ان کے چہرہ پر لگی ہوئی تھیں۔ رشید نے کہا۔ خواب کا پہلا حصہ پورا ہو گیا ہے۔ مجھے ایک وحشی شخص نے زخمی کر دیا دوسرا حصہ پورا ہونے والا ہے۔"

زرقا۔ کیسے۔"

رشید۔ موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ زندگی میں تاج کیا نصیب ہو گا۔ ممکن ہے۔ مرنے کے بعد مل جائے۔

زرتا ایک دم ہول ہو گئی۔ وہ جلدی سے اُٹھی۔ اس نے اپنا دستِ نازان کے منہ پر رکھ کر کہا "ایسی بدفال منہ سے نہ نکالو"

رشید نے کچھ کہنا چاہا۔ زرتا ہٹ کر اپنی جگہ آ گئی تھی۔ اُس نے کہا "باتیں نہ کرو، آرام کرو۔

رشید چپ ہو گئے۔ زرتا بھی کسی خیال میں کھو گئی۔

نواں باب

رشید کا راز

جب صبح ہوئی تو صالح اور فاطمہ صبح کی نماز پڑھ کر آئے۔ زرقا نے بھی نماز پڑھ لی تھی، رشید سو رہے تھے، فاطمہ نے پوچھا "کیا ابھی تک انہیں ہوش نہیں آیا۔"

زرقا نے جواب دیا "آدھی رات کے بعد ہوش آیا تھا۔ کچھ دیر جاگ کر سو گئے۔ فاطمہ نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ انہیں رات کی بہ نسبت بخار کم معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ اسوقت بخار ہلکا ہے۔ سعید کہاں ہے؟ وہ بھی جاگتا رہا تھا۔"

زرقا نے مسکرا کر کہا "وہ مرد ہیں۔ کہنے لگے رات بھر جاگنا تو بڑی واہیات بات رات کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔ سوائے وحشت ناک سکون اور خاموشی کے بیٹھے رہو۔ اور دیکھتے رہو، یہ بھی کوئی کام ہے۔ ساتھ ہی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے لگے، مجھے ان پر رحم آگیا۔ میں نے کہہ دیا۔ جاؤ اور آرام سے سو رہو۔ وہ میرے کہنے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ کہتے ہی چلے گئے۔ اور سو گئے۔ ابھی تک سو رہے ہیں۔"

فاطمہ نے ہنس کر کہا۔ بھلا وہ جاگ سکتا تھا۔ میں نے پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا۔

زرقا:۔ مگر مرد تو ہیں وہ۔ عورتوں سے بہتر۔"

فاطمہ:۔ تو ابھی بچی ہے۔ ان باتوں کو کیا جانے مرد، مرد ہی ہوتے ہیں اور عورتوں سے بہتر ہی ہوتے ہیں۔"

زرقا :۔ یہ آپ کہہ رہی ہیں۔ اب میں کیا جواب دوں۔"

فاطمہ :۔ ایک روز تجھے خود اس بات کا احساس ہو جاتے گا۔ مرد ہمارے محافظ ہیں۔ ہمارے ناموس کے محافظ ہیں، حکومت کرنا جانتے ہیں لڑنا جانتے ہیں۔ عورتیں نازک ہوتی ہیں۔ مرد سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔"

زرقا :۔ یہ سب سچ ہے۔ لیکن جو کام مرد کر سکتے ہیں وہ عورتیں کر سکتی ہیں۔ عورتیں اپنی اور اپنے ناموس کی حفاظت خود کر سکتی ہیں۔ حکومت کر سکتی ہیں۔ لڑ سکتی ہیں ــــ تیمارداری کر سکتی ہیں۔ کیا کچھ نہیں کر سکتیں۔"

فاطمہ :۔ تو تھوڑا سا لکھ پڑھ کیا گئی ہے۔ پوری فلسفی اور منطقی بن گئی ہے اب تجھ سے کوئی بحث کرے۔"

زرقا ۔ دعویٰ بلا دلیل غلط ہوتا ہے۔ تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں کہ عورتوں نے اپنی اور اپنے ناموس کی حفاظت تلوار اور عقل کے زور سے کی ہے۔ لڑائیاں فتح کی ہیں۔ حکومت کی ہے۔ کیا کچھ نہیں کیا ہے۔"

فاطمہ :۔ مگر تو مجھ سے بحث کیوں کر رہی ہے۔ سعید سے کرنا۔ دیکھ کیسے کیسے جواب دیتا ہے۔ وہ تجھے۔"

زرقا :۔ کیا بحث کر سکیں گے۔ بڑے شد و مد سے کہا تھا کہ میں ساری رات جاگوں گا۔ آدھی رات تک بھی جاگ سکے۔"

اس وقت رشید جاگ گئے۔ صالحہ ان ماں بیٹی کو باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر رشید کے قریب جا بیٹھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ رشید جاگ گئے ہیں تو بولے چیخ کر باتیں کرو۔ اٹھا دیا نہ رشید کو۔"

دونوں خاموش ہو گئیں۔ رشید نے کہا۔ نہیں میں خود جاگ گیا ہوں۔"

صالح :۔ زرقا ان کا منہ ہاتھ دھلاؤ۔"

زرقا دوڑی گئی۔ سلفچی اور آفتابہ لائی، اور بڑی ہوشیاری سے ان کا منہ دھلا دیا۔ کچھ دیر کے بعد سعید بھی اٹھے اور نماز پڑھ کر آگئے۔ فاطمہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ ہار گئے نہ تو رات۔ اب سن یہ تیری بہن کیا کیا کہہ رہی تھی تجھے۔

زرقا :۔ میں انہیں کیا کہتی۔ میں تو ایک عام بات کہہ رہی ہوں۔"

سعید ۔ آخر ہو کیا گیا ہے۔"

فاطمہ۔ تو نے تو سینہ ٹھونک کر کہا تھا۔ میں رات بھر جاگوں گا۔ نہ جاگ سکا۔ سو گیا۔
سعید نے شرارت سے کہا۔ کون، میں سو گیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کون کہتا ہے۔ فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔ یہ تیری بہن ہی کہہ رہی ہے۔"
سعید۔ اس نے ہی اصرار کیا تھا کہ تم سو جاؤ۔ میں جا کر سو رہا۔
زرقا نے ہنس کر کہا۔ مجھے ہی تو شاید انگڑائیاں اور جمائیاں آنے لگی تھیں۔"
سعید۔ چھوڑو بھی اس قصہ کو ——— بھائی رشید اب طبیعت کیسی ہے۔"
رشید۔ خدا کا شکر ہے۔ اچھی ہے۔ میں آپ لوگوں کا بہت مشکور ہوں۔ آپ نے میری دیکھ بھال اور تیمارداری بڑی توجہ سے کی ہے۔"
سعید نے ہنس کر کہا۔ بھئی ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔ البتہ زرقا سنا ہے۔ ساری رات نگرانی کرتی رہی ہے۔"
اسوقت زرقا نے نقاب ڈال رکھا تھا۔ وہ رشید کو دیکھ رہی تھی۔ رشید نے کہا۔ میں زرقا کا بھی شکر گذار ہوں۔"
تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر عثمان آگئے۔ وہ جوان آدمی تھے۔ فاطمہ اور زرقا وہاں سے ہٹ گئیں۔ انہوں نے رشید کی نبض دیکھی اور کہا خدا کا شکر ہے۔ ان کی حالت بہتر ہو چلی ہے۔ رات کیا کیفیت رہی۔"
رشید۔ رات بخار ہو گیا تھا۔ غفلت بھی رہی۔ پچھلی رات کے وقت بخار کچھ ہلکا ہوا۔"
ڈاکٹر۔ ٹھیک ہے۔ چلیں چیک کا کیا حال ہے۔"
رشید: چلیں کافی حد تک ہے۔ حرکت کرنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔
ڈاکٹر:۔ حرکت بالکل نہ کرنا۔ آج پٹی نہیں بدلی جائے گی۔ دوپہر کے بعد سے بخار پھر بڑھے گا۔ لیکن بخار عارضی ہوگا۔ رات کے کسی حصہ میں اتر جائے گا۔
ڈاکٹر نے دوا پلائی، اور کچھ دیر کے بعد چلے گئے۔ شام کے وقت پھر آنے کا وعدہ کر گئے۔ ان کے جانے کے بعد اوروں نے ناشتہ کیا اور رشید کو دودھ دیا گیا۔
زرقا چلی گئی۔ چونکہ وہ ساری رات جاگتی رہی تھی، اس لیے اپنے کمرہ میں جا کر سو گئی۔ فاطمہ، صالح اور سعید رشید کے پاس بیٹھے رہے۔
دوپہر کے وقت رشید کو بھی نیند آگئی۔ صالح اور سعید وہاں سے چلے گئے صرف

فاطمہ بیٹھی رہ گئیں۔ رشید کو سوتے سوتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ قاضی جو اس زمانہ میں مجسٹریٹ کہلاتے تھے آگئے۔ ان کے ساتھ کئی سرکاری سپاہی تھے، سپاہیوں کی جرأت میں ملزم تھا۔ یہ وہی وحشی تھا۔ جو درگاہ عالیہ جاتے ہوئے۔ اور پھر درگاہ میں سعید اور زرقا کو ملا تھا۔

قاضی نے صالح سے کہا۔ ہم رشید کا بیان لینے آئے ہیں۔ کیا وہ بیان دینے کے قابل ہیں؟"

صالح جی ہاں، بیان دے سکتے ہیں۔ مگر رات انہیں نیند کم آئی تھی۔ اس وقت سو رہے ہیں۔ کہئے جگا دوں؟"

قاضی۔ نہیں، جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سونے دو۔ ہم ان کے جاگنے کا انتظار کریں گے۔"

قاضی اور سپاہی مکان کے مردانے حصہ میں بیٹھا دیئے گئے۔ صالح نے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مدارات کرنی چاہی۔ قاضی نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا میں مجسٹریٹ ہوں اور میرے ساتھ یہ ایک پولیس کے افسر ہیں ہم سب عوام کے خادم ہیں۔ سلطان نے ہمیں اپنی رعایا کی خدمت کے لیے ملازم رکھا ہے۔ ہمارا کام ان کی خدمت کرنا ہے۔ ہم خدمت کرتے ہیں۔ اگر سلطان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کسی نے ہماری مدارات کی اور ہم نے اس مدارات کو قبول کر لیا تو وہ ہمیں سخت سرزنش کریں اور ممکن ہے کہ برخاست کر دیں۔

قاضی بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے قریب کی مسجد میں جا کر ظہر کی نماز پڑھی اور جب نماز پڑھ کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ رشید اُٹھ گئے ہیں۔ اور انہوں نے ظہر کی نماز پڑھ لی ہے۔

صالح نے پردہ کرا دیا۔ قاضی اور پولیس کا افسر ملزم کو ساتھ لے کر اس کمرہ میں پہنچے جس میں رشید تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ ان دونوں کمروں میں آنے جانے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ اس کا ایک کیواڑ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ کے پردہ نے دوسرے کمرہ کو چھپا رکھا تھا، زرقا نہایت آہستگی سے آکر پردہ کے پیچھے خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

قاضی اور پولیس افسر کے لیے کرسیاں ڈالدی گئی تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ قاضی نے رشید سے کہا" ہمیں سخت افسوس ہے کہ آپ کو زخمی کیا گیا۔ ہم آپ کا بیان لینے آئے ہیں کیا آپ بیان دے سکتے ہیں؟"

رشید :- جی ہاں میں بیان دے سکتا ہوں۔

قاضی نے کاغذ نکالا۔ قلم دوات لی اور بیان لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے رشید کا نام لکھا۔ اور ان کے والد کا نام دریافت کیا۔

رشید نے کہا۔ بس میرا نام کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ قیرودین کا طالب علم لکھ لیجئے۔ میرے نام کا کوئی اور طالب علم نہیں ہے"

قاضی - یہ صحیح ہے۔ مگر ولدیت لکھنا ضروری ہے۔

رشید :- کچھ مصلحتیں ایسی ہیں کہ میں اپنے والد کا نام نہیں بتا سکتا"

قاضی :- عجیب بات ہے۔ یہ کیا کسی نے منع کر دیا ہے"

رشید :- جی ہاں میری والد نے منع کر دیا تھا۔

قاضی - اچھا میں تمہاری ولدیت لکھوں گا نہیں۔ مگر مجھے معلوم ضرور ہو جانی چاہیئے۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم نہ کہو گے میں کسی کو تمہارے والد کا نام بتاؤں گا۔ اگر تمہیں اطمینان ہو تو میرے کان میں اپنے والد کا نام بتادو۔

رشید :- مجھے آپ پر اطمینان ہے۔ یہ ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ یہی میری زندگی کا راز ہے۔ اور یہ راز ظاہر نہیں ہونا چاہیئے"

قاضی :- کسی پر ظاہر نہ ہو گا۔ راز ہی رہے گا"

رشید :- اچھا تو میرے قریب آجایئے"

قاضی رشید کے اوپر جھک گئے۔ انہوں نے اپنے والد کا نام بتایا۔ قاضی سخت متعجب ہوئے"

انہوں نے کہا" کیا تمہاری والدہ کا نام عذرا تھا۔ ؟

رشید :- جی ہاں"

قاضی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے"

دسواں باب

وحشی کی حرکت

قاضی نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہا۔ میں ایک عرصہ سے جس بات کی تلاش میں تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ آج وہ بات حاصل ہو گئی۔ مجھے تم سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے "

رشید۔ آپ کا شکریہ۔ آپ فیر دوئیں کے ایک مفلس طالب علم کی ذات سے دلچسپی لینے نکلے ہیں۔ لیکن میں آپ کا وعدہ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہیں خوشی میں وعدہ شکنی نہ ہو جائے۔

قاضی۔ جی تو یہ ضرور چاہتا ہے کہ آج اُس بات کا اعلان کر دوں جسے سُن کر فاس اور فاس کی حکومت میں رہنے والے حیران رہ جائیں۔ مگر میں اپنے وعدہ کا احترام کروں گا۔ وقت پر سب کچھ آپ ہی ظاہر ہو جائے گا۔

رشید:۔ مہربانی کر کے مجھے بدنام کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔

قاضی۔ بالکل نہیں اطمینان رکھو۔ تمہارا کارنامہ جب میں نے سُنا تھا۔ تو تم سے ملنے اور تمہارے حالات سننے کی تمنا ہوئی تھی۔ لیکن بعض مصلحتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے میں اپنی تمنا پوری نہ کر سکا۔ خدا نے آج موقعہ دیا۔ کسی قدر حیرت کی بات ہے۔ مگر نہیں، میں خاموش ہی رہوں گا۔"

رشید:۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ خاموش نہ رہ سکیں گے۔ میرے لیے یہ ضروری

ہو گیا ہے کہ میں فاس کو چھوڑ دوں۔

قاضی۔ بالکل ایسا نہ کرنا۔ خوشی اور حیرت نے مجھے اسوقت غیر محتاط سا بنا دیا تھا۔ مگر اب میں بالکل احتیاط کروں گا۔ بھول جاؤں گا کہ میں تم سے ملا تھا۔

رشید:۔ میں مشکور رہوں گا۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں"

قاضی نے بیان لکھنا شروع کیا۔ رشید نے اس وحشی کی طرف دیکھا جو انہیں اب بھی گھور رہا تھا۔ انہیں کوئی بات یاد آگئی۔ وہ چونک پڑے مگر خاموش رہے

قاضی سوالات کرتے اور رشید جوابات دیتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان پر اندھیری رات میں درگاہ عالیہ سے واپسی پر اچانک حملہ کیا گیا۔ انہوں نے حملہ آور کو نہیں دیکھا۔ شہر فاس میں کسی مذہب کا بھی کوئی ایسا آدمی نہیں جو ان سے دشمنی رکھتا ہو، اسوقت ان پر نیم بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اور جب ہوش آیا۔ تو سعید نے بتایا تھا کہ حملہ آور وحشی پکڑا گیا ہے۔ میں نے اور عبدالرحمٰن نے اسے پکڑ کر سرکاری آدمیوں کے حوالہ کر دیا ہے"

قاضی نے وحشی کی طرف اشارہ کر کے کہا "کیا تم اسے جانتے ہو۔؟

رشید:۔ میں نے رات اسے درگاہ عالیہ میں دیکھا تھا۔ مجھے خیال ہوا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ مگر اسوقت یاد نہیں آیا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ اسوقت مجھے یاد آگیا ہے۔ میں نے اسے تازہ میں دیکھا تھا"

تازہ ایک شہر ہے جو فاس سے مشرق و مغرب کی جانب ایک منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ شہر ایک مالدار یہودی ابن مشغل کی وجہ سے تمام مغرب اقصیٰ میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ ابن مشغل ایسا دولتمند یہودی تھا کہ وہ اپنی دولت سے مصر، افریقہ اور مغرب اقصیٰ کی سلطنتیں خرید سکتا تھا۔

قاضی نے کہا۔ تازہ میں کس جگہ دیکھا تھا۔ کچھ یاد ہے"

رشید۔ میرا خیال ہے میں نے اسے ابن مشغل کے محل میں دیکھا تھا۔

قاضی:۔ اسے تم سے عداوت کیوں ہوئی۔

رشید:۔ اس کا جواب تو یہی شخص دے سکتا۔ البتہ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ ابن مشغل کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔ اس لیے اس کا مجھ سے کینہ یا عداوت

رکھنا معمولی بات ہے۔"

وحشی ابتک خاموش تھا۔ لیکن اب چپ نہ رہ سکا۔ اس نے خونخوار نظروں سے رشید کو دیکھ کر کہا۔ "میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ سخت نفرت میں نے تمہیں قتل کرنے کے لیے تم پر حملہ کیا تھا۔ خوش تھا کہ تمہیں قتل کر دیا۔ اپنے آقا کا انتقام لے لیا۔ مگر دار او چھا پڑا تم بچ گئے۔ اسوقت تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا سخت صدمہ اس کے چہرہ سے نفرت وحقارت کے جذبات ظاہر ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں سے وحشیانہ بربریت ظاہر ہوتی۔ قاضی نے وحشی سے پوچھا" تمہارا نام کیا ہے"

وحشی نے جواب دیا" انام بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے"

قاضی ۔کیا تم شہر"نازہ کے رہنے والے ہو"

وحشی ۔ اس کے بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے"

قاضی :۔ تمہیں اس اعتراف میں تو کوئی تامل نہ ہوگا کہ تم ابن مشعل یہودی کے غلام ہو"

وحشی :۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ابن مشعل کا غلام ہوں، وہ میرے آقا تھے اور میں ان کا مدار المہام تھا"

قاضی :۔ تم نے یہ اقرار کر ہی لیا ہے کہ تم نے رشید پر قاتلانہ حملہ کیا اور انہیں قتل کرنا چاہتے تھے"

وحشی :۔ باشبہ میں تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کے بعد ـــ"

قاضی :۔ ان کے بعد کسے قتل کرتے۔

وحشی :۔ اس نازنین یا خوبصورت بلا کو جس کی وجہ سے وہ واقعہ ہوا جس نے مجھے مشتعل کر رکھا ہے"

قاضی :۔ اس نازنین کا نام کیا ہے"

وحشی :۔ زرنا۔ جو دیکھنے میں بڑی معصوم، بڑی بھولی ہے۔ لیکن حقیقت میں بڑی سنگدل اور بڑی سفاک ہے"

قاضی اس کا بیان لکھتے رہے تھے۔ وحشی نے کہا" اے بدنام میں سمجھتا ہوں۔ تو مجسٹریٹ ہے۔ تیرے اختیارات بہت وسیع ہیں تو مجھے قید کی سزا بھی دے سکتا

ہے اور قتل کی بھی۔ میں جانتا ہوں۔ تو مجھے قتل کی سزا دے گا۔ میں شہید ہونا چاہتا ہوں
تجھ پر اور تیرے مذہب پر لعنت بھیجتا ہوں "

اس کے بعد اس گناہ دہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی گستاخی
کی۔ قاضی اور ان مسلمانوں کو جو اس وقت وہاں موجود تھے، سخت ناگوار ہوا۔ جوش اور
غصہ سے ان کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے کوئی مناسب حرکت نہیں کی۔
مجسٹریٹ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ قاضی یا مجسٹریٹ نے اپنے کانوں میں انگلیاں
دے لیں۔ جب وحشی خاموش ہو گیا۔ تب قاضی نے کہا اے غلام میں سمجھتا ہوں
تو عقلمند انسان ہے۔ اسوقت جو تیری صورت وحشیوں جیسی بنی ہوئی ہے۔ تو وحشی
نہیں ہے۔ مہذب اور خلیق ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ سمجھ دار ہے۔

وحشی۔ تم نے ٹھیک کہا۔ میں نے یہ وحشیانہ صورت جذبۂ انتقام کے تحت بنا
رکھی ہے۔ ورنہ میں بڑا مہذب تھا۔ ابن مشعل کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا میری
تہذیب کی شائستگی کی، اور علم کی شہرت تھی، مگر اسوقت میں ایک، وحشی اور سفاک
انسان معلوم ہوتا ہوں "

قاضی:۔ یہی بات ہے مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا سمجھدار اور ذی علم آدمی اور
ایسی ارکیک باتیں کرے، کسی مذہب میں بھی دوسرے مذہب کے بزرگوں کو بُرا کہنا
روا نہیں ہے۔

وحشی:۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن میرا دل جلا ہوا ہے "

قاضی:۔ مگر جانتے ہو کہ اسلام میں اس شخص کی سزا کیا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے "

وحشی:۔ جانتا ہوں۔ اس کی سزا قتل ہے۔ میں قتل ہی ہونا تو چاہتا ہوں "

قاضی:۔ مگر کسی کو برا کہہ کر قتل ہونے سے برا کام کوئی بھی نہیں ہے۔ لوگ ہمیشہ
برائی سے یاد کریں "

وحشی:۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ مرنے کے بعد کون دنیا میں یہ دیکھنے
کے لیے آتا ہے کہ اسے برا کہا جا رہا ہے یا بھلا۔ لوگ اس کی تعریفیں کر رہے
یا برا کہہ رہے ہیں۔

قاضی :۔ ایسے بہت سے یہودی ہیں۔ جنہوں نے نیک اور اچھے کام کیے اور ان کی نیک نامی کی آج تک شہرت ہے۔"

وحشی :۔ یہ درست ہے میری قوم میرا نام بھی نیک نامی سے ہی لے گی۔

قاضی :۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو گستاخی کی ہے۔ اسکی معافی مانگ لو۔ اس جرم سے تمہیں بری کر دیا جائے گا۔"

وحشی :۔ میں معافی مانگنے والے لوگوں میں نہیں ہوں۔ میری سزا قتل ہے۔ مجھے قتل کی سزا دو۔"

قاضی :۔ تمہیں یہ خیال ہے کہ رشید پر قاتلانہ حملہ کے جرم میں تمہیں موت کی سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر رشید معاف کر دیں تو تم سزا سے بچ سکتے ہو۔"

رشید : اور میں تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔"

وحشی :۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اگر زندہ رہا تو پھر تمہیں اور زرقا کو قتل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ اسوقت رشید کی شرافت دیکھ کر مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان پر کیوں حملہ کیا۔ لیکن یہ افسوس اسوقت ہے۔ میری طبیعت بڑی کینہ پرور ہے۔ میں ضرور انتقام لوں گا۔"

قاضی :۔ خیر اس کے متعلق تم پھر غور کرنا۔ مگر رسولِ اللہ صلعم کی شان میں جو گستاخی کی اس کی معافی مانگ لو۔"

وحشی :۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

جہاں تک رشید کے معاملہ کا تعلق تھا۔ شہادت ختم ہو گئی تھی۔ اس لیے قاضی نے رشید اور صالح کا شکریہ ادا کیا۔ اور رشید سے کہا "مجھے امید ہے تم آرام ہونے پر مجھ سے ملتے رہو گے۔"

رشید :۔ انشاء اللہ۔"

قاضی اور پولیس افسر وحشی کو لے کر چلے۔ صالح ان کے ساتھ مکان سے باہر تک آئے۔ قاضی انہیں سلام کر کے چلے گئے۔ صالح واپس لوٹ آئے انہیں رہ رہ کر تعجب تھا کہ رشید نے اپنے والد کا نام کیوں سب کے

سامنے نہیں بتایا۔ وہ کون ہیں۔ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے رشید سے اُس کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ ان کے پاس بیٹھ گئے۔

گیارہواں باب

رشید کا تذبذب

رفتہ رفتہ رشید کو آرام ہونے لگا۔ وہ اُٹھنے بیٹھنے اور کمرہ میں چلنے پھرنے بھی لگے۔ یوں تو صالح، سعید اور فاطمہ سب نے ہی ان کی تیمارداری کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دل سوزی، خلوص اور محبت سے زرفا نے ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی۔ وہ دوسرے نے نہیں کی۔ وہ اکثر رات کو اُٹھ اُٹھ کر ان کے کمرہ میں آتی اور دیکھ جاتی، کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ وہ جاگ رہے یا ہیں سو رہے ہیں۔

بارش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ روزانہ کبھی دن کبھی رات کو یا تو چھینٹا پڑ جاتا تھا یا اچھی خاصی بارش ہو جاتی تھی، بادل کڑکتے اور بجلی چمکتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس موسم میں ایسی بارش مدت دراز کے بعد ہوئی ہے۔ ایک رات کو رشید سو رہے تھے، ان کے کمرہ میں جھاڑ تمام رات روشن رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بجھا دیا کریں۔ مگر صالح اور فاطمہ نے منع کر دیا تھا۔ اور کہہ دیا تھا کہ جب تک تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک نہ ہو جائے۔ اس وقت تک جھاڑ کو تمام رات روشن رہنے دیا کرو چنانچہ وہ تمام رات روشن رہتا تھا۔ اس رات کو بھی روشن تھا۔

اس روز شام ہی سے بادل چھا گئے تھے۔ اور شروع رات سے ہی بہت زیادہ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کبھی کبھی ننھی ننھی بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں، بادل بھی گرجنے

لگتا تھا۔ اور بجلی بھی چمکنے لگتی تھی۔

رشید کو دن میں خفیف سی حرارت ہو گئی۔ مگر شام کے وقت جاتی رہی تھی، لیکن اس روز انہوں نے رات کا کھانا کچھ کم کھایا تھا، زرقا کو فکر ہو گیا تھا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر آئی تھی، اور میوہ یا پھل کھانے پر اصرار کیا تھا۔ رشید نے کہدیا تھا کہ ان کا جی نہیں چاہتا۔ وہ چلی گئی تھی، اور رشید سو گئے تھے۔

آدھی رات کے وقت بوندیں تیز ہو گئیں۔ زرقا دبے قدموں ان کے کمرہ میں آئی، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ وہ سو رہے تھے۔ وہ ان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور ٹکٹکی لگا کر انہیں دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں بادل زور سے گرجا۔ بجلی کڑک کے ساتھ چمکی، ایسا معلوم ہوا۔ جیسے تمام آسمان پر بجلی کا کوڑا جھٹک گیا، اس کے فوراً ہی بعد۔ پھر کڑک ہوئی۔ اس زور سے تڑاقے کی آواز آئی کہ کمرہ ہل گیا، زرقا ڈر کر اچھلی۔ اور اس پلنگ کی پٹی پر جا پڑی، جس پر رشید سو رہے تھے، وہ ایک دم چونک کر جاگ گئے۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو زرقا کو پٹی پر بیٹھے پایا۔ وہ اٹھ رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ زرقا۔ تم۔

زرقا بے حد شرمسار اور نادم معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کہا "جی ہاں"

رشید:۔ اس وقت۔؟"

زرقا۔ تمہیں ——— دیکھنے آئی تھی۔

رشید۔ کیوں۔؟"

زرقا:۔ دن میں تمہیں حرارت ہو گئی تھی، نہ رات کو کھانا بھی کم کھایا تھا۔ اس وقت دیکھنے چلی آئی کہ تم جاگ تو نہیں رہے ہو"

رشید:۔ مگر تم نے تو مجھے جگا دیا"

زرقا:۔ میں نے نہیں، کمبخت بجلی نے۔ کچھ اس زور سے کڑکی کہ میں ڈر کر اچھلی اور نادانستگی میں آپ کے پلنگ کی پٹی پر جا پڑی۔

رشید:۔ اب سمجھ لو، عورتیں ڈر جایا کرتی ہیں"

زرقا نے دلفریب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا "اچھا۔ تمہارا خیال بھی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر تم بھی تو مرد ہو"

رشید :۔ خدا نے مردوں کے دلوں کو مضبوط بنایا ہے ۔“

زرقا :۔ عورتوں سے زیادہ مضبوط دل مرد نہیں ہوتے ۔“

رشید :۔ کبھی مردوں کو بجلی کی کڑک یا بادل کی گرج سے ڈرتے دیکھا ہے ۔“

زرقا نے زیر لب متبسم ہو کر کہا ”مرد ایسے موقعوں پر سوتے رہتے ہیں ۔“

رشید مسکرائے ۔ انہوں نے کہا ۔ مرد ، میدانِ جنگ میں تلواروں کے سے یہ میں رہتے ہیں ۔ اکثر آدھی آدھی رات کو جنگل میں ہوتے ہیں ۔ بارش میں بھیگتے ہیں ۔ اولوں سے پٹتے ہیں ۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سنتے ہیں اور بالکل نہیں گھبراتے ۔ نہ ڈرتے ہیں ۔

زرقا :۔ عورتوں کو بھی اکثر ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں ۔ اور وہ نہیں ڈرتیں ۔

رشید :۔ مگر تم تو کمرہ میں ڈر گئیں ۔

زرقا :۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ڈر گئی ۔

رشید :۔ زرقا ۔ اب جاؤ ۔

زرقا :۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے تمہیں ۔“

رشید :۔ نہیں ۔

زرقا چلی ۔ رشید نے کہا ۔ ذرا ٹھہرو ۔ میں دیکھ لوں بارش تو نہیں ہو رہی ہے

زرقا کی حسین صورت فانوسوں کی روشنی میں جگمگا رہی تھی ۔ اُس نے مسکرا کر کہا ۔ مہربانی ۔ تم کہیں نہ جاؤ ۔ کہیں ہوا لگ کر پھر حرارت نہ ہو جائے ۔ بارش ہو رہی ہے ہونے دو میں پگھل نہ جاؤں گی ۔“

رشید :۔ پگھل وگھل تو نہ جاؤ گی ۔ مگر زکام وکام ہو سکتا ہے ۔“

زرقا :۔ انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا ۔“

اُس نے کمرہ ۔ سے نکل کر زقند بھری اور دوسری طرف دلان میں چلی گئی ۔ وہاں سے اپنے کمرہ میں جا پہنچی ۔ اسوقت بھی بوندیں پڑ رہی تھیں ۔ مگر وہ بھیگی نہیں ۔ اپنے بستر پر پڑ کر ہلکی اُونی چادر اوڑھ لی ۔ اور تھوڑی دیر میں سو گئی ۔“

اس سے اگلے روز دوپہر کے وقت رشید کپڑے بدل کر بیٹھے تھے کہ زرقا آگئی ۔ اسوقت وہ بے نقاب تھی ۔ رشید نے اس سیم تن کو دیکھا اور کہا ”تم نے نقاب

اوڑھنا چھوڑ دیا ہے۔"

زرقا:۔ نہیں نقاب استعمال کرتی ہوں۔"

رشید:۔ اسوقت نقاب ڈال کر نہیں آئیں۔"

زرقا:۔ نہ معلوم کیوں تمہارے سامنے نقاب ڈال کر آتے ہوتے حجاب معلوم ہوتا ہے۔"

رشید:۔ مگر تمہیں نقاب ڈال کر آنا چاہیئے۔"

زرقا:۔ آئندہ احتیاط رکھوں گی۔"

وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرہ اور اُس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے۔ رشید نے سمجھ لیا۔ انہوں نے دریافت کیا۔ زرقا کیا تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟"

زرقا:۔ ہاں مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں تم بتانے سے انکار نہ کر دو۔

رشید:۔ جو بات بتانے کی ہوگی، ضرور بتاؤں گا۔ انکار کیوں کروں گا۔"

زرقا:۔ شاید انکار کر دو۔

رشید:۔ شاید انکار نہ کروں۔ تم سے انکار مشکل ہی ہے۔"

زرقا نے حسین نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کیوں مشکل ہے۔"

رشید:۔ تم نے میری اس قدر تیمار داری کی ہے کہ میں عمر بھر شکر گذار رہوں گا۔"

زرقا:۔ بس ——— تیمار داری کی شکر گذاری ہے۔"

رشید اس بت کمسن کو دیکھنے لگے۔ زرقا نے کہا۔ "اچھا تو بتاؤ گے جو میں پوچھوں گی۔"

رشید:۔ انشاء اللہ بتانے کی کوشش کروں گا۔"

زرقا:۔ اچھا تو بتاؤ۔ تم کون ہو۔"

رشید کو اس کی اس قدر تمہید سے یہی خوف ہوا تھا کہ وہ یہی پوچھے گی۔ وہ عجب تذبذب میں پڑ گئے۔ سچ بتا دیں تو ان کا راز افشا ہوتا تھا۔ اور اگر سچ نہ بتائیں تو اسے کیا جواب دیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں جامع قیر دوئین کا ایک مفلس اور بے وارث طالب علم ہوں۔"

زرقا:۔ تمہاری ظاہری کیفیت تو یہی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کس خاندان سے ہو"
رشید:۔ مفلسوں کا خاندان ہی کیا۔ بس یہ سمجھو کہ ایک گمنام خاندان سے ہوں"
زرقا:۔ تمہارے والد کا کیا نام تھا"
رشید اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ غور سے اِن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ زرقا ابھی اس بات کو نہ پوچھو۔ اگر میں نے یہ بات بتا دی۔ تو میری جان خطرہ میں پڑ جائے گی"

زرقا:۔ میں جانتی تھی کہ تم مجھے نہ بتاؤ گے۔

رشید:۔ میں بتا دوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ شاید انکار کر سکوں انکار نہ کروں گا۔ اگر میری جان جاتی رہے، تو کچھ پروا نہیں۔ خدا کی قسم میں تمہیں ناراض نہ کروں گا"

زرقا ہول گئی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ ایسی بات ہے تو ہرگز نہ بتائیے۔ میں نادم ہوں کہ میں نے کیوں ایسا سوال کیا"

رشید:۔ مگر میں بتاؤں گا سنو"

زرقا نے اِن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا۔ خدا کے لیے نہ بتائیے۔ خدا کی قسم تمہارے نہ بتانے سے مجھے ملال نہیں ہوگا۔ البتہ اگر اب تم بتا دو گے تو ضرور صدمہ ہوگا"

رشید:۔ دیکھو زرقا، میں اپنے قول سے نہیں پھرا"

زرقا:۔ بے شک نہیں پھرے۔ میں تمہاری مشکور ہوں۔ اب میں خود معلوم کرنا نہیں چاہتی۔

رشید چپ ہو گئے۔ زرقا نے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

بارھواں باب ۱۲

شریر سہیلی

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ زرقا اوسط درجہ کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ کو فوجی صلہ میں تھوڑی سی جاگیر ملی تھی۔ اس جاگیر کی آمدنی پر ان کی گذر اوقات تھی، سعید فوج میں بھرتی ہونے کی کوشش کر رہے تھے، مگر ابھی انہیں کوئی عہدہ نہیں ملا تھا۔

زرقا تیسرے چوتھے روز کپڑے بدلتی تھی۔ مگر نہاتی قریب قریب روز تھی ایک روز وہ غسل کر کے بال سکھا رہی تھی۔ اس کے بال نہایت باریک، بھورے مائل سیاہ تھے، بالکل ریشم کے لچھے معلوم ہوتے تھے۔ کمر سے نیچے تک لمبے تھے۔ اب وہ رشید کے پاس کم جانے لگی تھی، رشید کو اس قدر آرام ہو گیا تھا کہ اُن کی پٹی کئی کئی روز میں کھولی جاتی تھی۔ ڈاکٹر عثمان کا خیال تھا کہ پندرہ روز میں زخم بالکل بھر جائے گا۔ رشید میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ باہر تک جانے لگے تھے، انہوں نے چاہا تھا کہ وہ اب جامع قیر دوین میں اپنی قیام گاہ پر چلے جائیں۔ لیکن صالح اور سعید نے انہیں نہیں جانے دیا تھا۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ جب تک انہیں آرام نہ ہو جائے۔ وہ ہرگز انہیں نہ جانے دیں گے۔"

وہ کسی کام سے رشید کے کمرہ میں گئی۔ اسے معلوم تھا۔ رشید وہاں نہیں ہیں۔ اس کے سامنے وہ باہر گئے تھے، کمرہ خالی تھا۔ وہ جس کام سے آئی تھی اس

سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔

رشید نے اپنی قیام گاہ سے چند کتابیں منگائی تھیں، وہ طالب علم تھے یہ کتابیں مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے، وہ انہیں دیکھنے لگی۔ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، زرتا کی مادری زبان عربی تھی، وہ بھی اچھی تعلیم یافتہ تھی، عربی زبان خوب جانتی تھی۔

اس نے ایک کتاب کے شروع میں رشید کے قلم سے لکھے ہوئے چند اشعار دیکھے۔ ان اشعار کا مضمون یہ تھا۔

"میں خوش ہوں۔ بہت خوش کہ میں نے اس زمانہ کی اس بے نظیر حسینہ کو جس کا چہرہ چاند سے زیادہ روشن ہے۔ جس کے رخسار سیب سے زیادہ اچھے ہیں۔ جس کی آنکھیں بڑی حسین اور دلفریب ہیں جو پیکر حسن ہے۔ ایک ظالم کے پنجہ استبداد سے رہائی دلائی۔ اے روح تو اس کے نظارہ سے خوش ہوئی۔ اور اے دل تو بھی خوش ہو۔ اور تم دونوں کو خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوا۔ لیکن میری خوشی اسوقت خاک میں مل گئی۔ جب میں نے اپنی ہستی پر نظر کی۔ میں ایک مفلس بے زر بے پر اور وہ دولت حسن سے مالا مال کیا ہوگا۔ اس آوازہ کا انجام جو میرے دل میں پیدا ہونے لگی۔

میں نجیب ہوں۔ شریف ہوں۔ مگر ہوں تو جامع قیروئین کا ایک مفلس طالبعلم گمنام اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں کون ہوں تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے عجب نہیں کہ میری جان پر بن جائے۔ اگر زندگی کی خواہش ہے تو مجھے گمنام ہی رہنا ہوگا۔

اے دل یا تو تو اس کی یاد کو بھول جا جو پیکر حسن و ناز ہے۔ جو زرتا کے نام سے مشہور ہے۔ جو حوروں سے زیادہ دلربا ہے۔ یا میرے سینہ سے نکل جا۔ مجھے تکلیف نہ دے۔ میری راتوں کی نیند نہ اڑا۔ مجھے جینے دے۔ جس کے تصور کی بھی میں جرأت نہیں کر سکتا۔ تو اسے کیوں یاد کرتا ہے۔

اے کوچۂ دلبر سے آنے والی ہواؤ۔ مجھے نہ ستاؤ۔ اس مست ناز کی خوشبو نہ سنگھاؤ۔ جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرا راز میرے سینہ میں دفن

رہنے دو۔ میں گمنام ہوں۔ گمنامی ہی میں مر جاؤں گا۔"

زرقا پڑھتی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن ہوتی جاتی تھیں، ہونٹوں پر تبسم کھیلتا جاتا تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ اور کسی خیال میں غرق ہو گئی۔ اس کے سر سے دوپٹہ سرکا ہوا تھا، حسین بالوں کی لٹیں اس کے چاند سے چہرہ پر بہ تصدیق ہو رہی تھیں، وہ پریوں کی شان سے بیٹھی تھی۔

دفعتہً کسی کے قدموں کی چاپ ہوئی۔ اس نے دروازہ کی طرف دیکھا رشید کمرہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اس رات کافر کو دیکھا۔ نگاہیں ٹکرائیں۔ وہ کچھ اکھڑ گئے۔ مگر سنبھلے اور اپنے بستر پر جا بیٹھے۔ زرقا کو یہ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ کھلے سر اور بڑی بے تکلفی سے بیٹھی ہے۔

رشید نے پوچھا "کب آئیں زرقا تم یہاں؟"

زرقا نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر ہوئی" وہ برابر رشید کو دیکھے جا رہی تھی، رشید نظریں جھکائے بیٹھے تھے، زرقا نے کہا "خیر سے تم شاعر بھی ہو۔"

"شاعر" رشید نے زرقا کے حسین چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔"

زرقا:۔ جی ہاں شاعر

رشید:۔ شاعر تو نہیں، مگر شاعر بننا ضرور چاہتا ہوں"

زرقا:۔ کیوں شاعر بننا چاہتے ہو؟"

رشید:۔ شاعر اپنے اشعار سے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کر دیتا ہے قوم کے نونہالوں میں حریت کی روح پھونک دیتا ہے۔ جہاد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔"

زرقا:۔ اور اگر کسی کو بدنام کرنا چاہے۔ تو بڑی آسانی سے بدنام بھی کر سکتا ہے۔"

رشید کے چہرہ کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ انہوں نے کہا "حقیقی شاعر ایسا نہیں کرتے۔"

زرقا:۔ ممکن ہے۔"

رشید:۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں شاعر ہوں۔

اب زرقا کچھ کشمکش میں پڑ گئی۔ وہ یہ کہنا نہیں چاہتی تھی کہ اس نے ان کے لکھے ہوئے اشعار دیکھ لیے ہیں۔ ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اچانک

جمیلہ آگئی۔ شاید اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں رشید بھی موجود ہیں۔ وہ بیدھڑک منہ کھولے چلی آئی۔ مگر جب اس نے رشید کو دیکھا تو کچھ شرما گئی۔ اور واپس لوٹ کر تیزی سے کمرہ سے باہر نکل آئی۔

زرقا اسے دیکھ خوش ہو گئی۔ وہ جلدی سے اٹھی۔ اُس نے رشید سے کہا یہ میری سہیلی جمیلہ ہے۔ تازہ کی رہنے والی۔ درگاہ عالیہ میں ملی تھی۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج آئی ہے۔"

زرقا ایک سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ جمیلہ کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ اور خوشی سے اُس کا چہرہ اور بھی روشن ہو گیا تھا۔ وہ بھی طرارہ بھر کر کمرہ سے باہر چلی گئی۔

اسے دیوار سے لگی کھڑی جمیلہ ملی۔ وہ شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ زرقا نے اُس شریر چتون سے اندازہ کر لیا کہ وہ شرارت کرے گی، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے کر تیزی سے چلی اور اپنے کمرہ میں جا کر دم لیا۔ دونوں بیٹھ گئیں۔ جمیلہ نے کہا۔ کون تھے۔ یہ جن کے پاس تو بیٹھی تھی۔"

زرقا:۔ یہ قیروین کے طالب علم ہیں۔"

جمیلہ:۔ کیا نام ہے ان کا۔"

زرقا:۔ رشید۔

جمیلہ:۔ نے شوخی سے کہا۔ اچھا ——— یہی وہ بزرگ ہیں جو تیرے رنگیں افسانہ کے ہیرو ہیں۔"

زرقا:۔ خوبصورت چڑیل۔"

جمیلہ:۔ مگر پھانس لیا ہے نا تو نے انہیں۔

زرقا:۔ دُھت۔

جمیلہ:۔ دُھت دُت نہیں۔ ہرگز نہ چھوڑنا انہیں چھوڑا اور پچھتائی۔

زرقا:۔ پسند آ گئے ہیں تجھے۔"

جمیلہ:۔ اپنے دل سے پوچھ۔ کیسی بے تکلفی سے۔ بے حجاب بیٹھی تھی تو ان کے پاس۔ سر کھولے۔"

زرقا:۔ میں اس کمرہ میں بیٹھی تھی کہ وہ آ گئے۔"

جمیلہ:۔ اب وہ آ گئے یا تو چلی گئی۔ مگر یہ ملا ٹائپ کے لوگ ذرا نرے قل اعوذیہ ہوتے ہیں۔"

زرقا:۔ کسی ملا سے پالا پڑ گیا ہے، کیا تیرا۔"

جمیلہ:۔ خدا نہ کرے۔ مگر سنتی آئی ہوں۔ اب تجربہ تو کر رہی ہے مگر تو تو مغرب اقصیٰ کی حور ہے۔ اور ملا حوروں کے دیوانے ہوتے ہیں۔ پھسل گئے ہوں گے تجھ پر۔"

زرقا:۔ کیسی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔"

جمیلہ:۔ ارے قینچی وینچی کو رہنے دے۔ جو میں پوچھوں وہ بتا۔"

زرقا اس شریر کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ جمیلہ نے کہا۔ پھنس بھی گئے۔ وہ تیری زلفوں کے جال میں۔"

زرقا:۔ بڑی شریر ہو گئی ہے تو جمیلہ۔"

جمیلہ:۔ شرماتی کیوں ہے بتا نہ ——— خیر نہ بتا۔ مگر ایک بات پلہ سے باندھ لے۔ جب تو انہیں اپنے گھر میں لے آئی ہے تو ہرگز نہ نکلنے دینا۔ نکلے نہیں اور تیرے ہاتھ سے گئے نہیں۔ ان ملاؤں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ ذرا سی دیر میں بدل جاتے ہیں۔"

زرقا:۔ شاید اپنے تجربہ کی بات کہہ رہی ہے۔"

جمیلہ:۔ نہ سن پچھتائے گی۔ مگر تو انہیں اپنے گھر لے کیسے آئی۔"

زرقا:۔ انہیں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔"

"حادثہ، جمیلہ نے استعجاب کے لہجہ میں کہا۔ پھر بولی وہ کیسا حادثہ۔"

زرقا نے رشید کے زخمی ہونے کا تمام حال کہہ سنایا۔

جمیلہ نے کہا۔ ابھی تو بیچارہ پر ایک ہی حملہ ہوا ہے۔ تم سلامت ہو تو نہ جانے کتنے حملے ہوں گے۔"

زرقا:۔ میرا کیا واسطہ اس سے۔"

جمیلہ:۔ کیسی بھی بنی جا رہی ہے۔ کون ہے وہ وحشی جس نے ان پر حملہ کیا۔"

زرقا:۔ کوئی ابن مشعل کا غلام ہے۔"

جمیلہ :- اب بتا تیرا واسطہ ہوا یا نہیں۔ مگر مجھے کیا۔ میں تو تیرا دلچسپ افسانہ سننے آئی ہوں۔ سنا ڈال ۔"

زرقا :- میں نے وعدہ کیا ہے۔ سناؤں گی۔ اب آئی ہے تو ذرا اطمینان سے بیٹھ کھانا کھا۔ پھر سناؤں گی ۔"

جمیلہ :- جیسی تیری مرضی ۔"

پھر دونوں مختلف موضوعوں پہ باتیں کرنے لگیں ۔"

تیرھواں باب

جمیلہ کی ظرافت

جمیلہ بڑی چنچل، بڑی شوخ، بڑی باتونی اور بڑی ذہین تھی۔ فی البدیہہ جواب دینے والی۔ ان دونوں میں بچپن سے گاڑھا بہناپا تھا۔ جمیلہ کے خالو عبداللہ کے اولاد نہیں ہوئی تھی، ان کی بیوی یعنی جمیلہ کی خالہ نے جمیلہ کو پرورش کیا تھا۔ جمیلہ کے باپ تازہ میں رہتے تھے۔ اور اس کے خالو عبداللہ فاس میں رہتے تھے۔ جب جمیلہ جوان ہوگئی تو اس کی والدہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ مگر اب بھی ہر چھٹے مہینہ وہ اپنے خالو کے یہاں آجاتی تھی، اور ایک ایک دو دو مہینے رہ جاتی۔

جمیلہ حسین بھی تھی، اور چنچل بھی۔ سمجھ دار بھی تھی۔ اور ذہین بھی۔ اُس کی ماں بھی اس سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی، اور خالہ بھی جان چھڑکتی تھی۔ اگر وہ ماں کے گھر چلی جاتی تھی تو خالہ بے چین ہو جاتی تھی۔ اور جب خالہ کے گھر آجاتی تھی۔ تو ماں بے چین ہو جاتی تھی۔

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں غیر بھی پیار کرتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ مگر جمیلہ ایسی لڑکی تھی، جس کی شوخی اور باتیں سب ہی کو پسند تھیں۔ وہ بلبل کی طرح چہکتی تھی اور گل کی طرح ہنستی تھی۔ زرقا میں اور اس میں خوب گھٹتی تھی، تھی زرقا بھی بڑی شوخ لیکن اس کی شوخی سنجیدگی لیے ہوتے تھی، اور جمیلہ کی شوخی میں چنچل پن تھا۔

جمیلہ کئی مہینے میں آئی تھی، زرقا نے اُس کی بڑی مدارت کی، اچھے اچھے کھانے پکوائے۔ اصرار کر کے کھلایا۔

لیکن جمیلہ سننے آئی تھی۔ اُس کی وہ داستان جس نے اسے نہ صرف شہر فاس اور شہر تازہ ہی میں بلکہ تمام مغرب اقصیٰ میں مشہور کر دیا تھا۔ اِس کی داستان کے ساتھ ساتھ اس کے حسن کی بھی شہرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جلد زرقا اپنی داستان سنا ڈالے۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر دونوں زرقا کے کمرے میں جا گھسیں۔ جمیلہ نے کہا لے بھئی۔ اب سنا اپنی داستان۔"

زرقا نے مسکرا کر کہا۔ اتنی بے صبر کیوں بنی جا رہی ہے۔ میں کہیں بھاگی جاتی ہوں۔ ذرا کھانا کھایا ہے۔ قیلولہ کر لیں۔ پھر سناؤں گی۔"

جمیلہ:۔ "او ہو یہ نخرے۔ رہی بھاگنے کی بات۔ کیا بھروسہ رہا ہے اب تیرا تیرے ماں باپ کے جی میں آ جائے۔ آج ہی تیرا نکاح اس ملا سے کر دیں۔ اور وہ لے کے چلا بھی جائے۔ میں دیکھتی ہی رہ جاؤں۔"

زرقا نے مسکرا کر کہا۔ "بڑی تیز و طرار ہو گئی ہے۔ اب تو تو کیسی کیسی باتیں بنانی آ گئی ہیں تجھے۔"

جمیلہ:۔ "ارے باتیں واتیں نہیں۔ تازہ میں یہ خبر مشہور تھی کہ تجھے اس ملا کے پلے سے باندھا جائے گا۔ جس نے تیری مشکل کو حل کیا ہے۔ مجھے تو خوف ہو گیا تھا کہ کہیں تو بندھ بھی نہ گئی ہو۔ اس ملا کے پلے سے اور لے بھی نہ گیا ہو لمبی ڈاڑھی والا۔ تجھے۔ مگر شکر ہے۔ اس کی نوبت نہیں آئی ابھی۔ ایک بات بتاؤں تیرا ملا اور ملاؤں کی طرح نہیں ہے۔ نہ اس کی ڈاڑھی بڑی لمبی اور بد زیب ہے۔ نہ سر گھٹا ہوا اور بد قوارہ ہے۔ کچھ شریف سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

زرقا:۔ "کمبخت راندۂ درگاہ ہو جائے گی۔ ملاؤں کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔"

جمیلہ:۔ "تجھے خبر نہیں ہے۔ ابا جان نے ایک ملا کی دعوت کی کہیں باہر سے آئے تھے۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ اُف توبہ ہے بھئی، چھاج کی چھاج ڈاڑھی ٹھوڑی

سے ناف تک پھیلی ہوئی تھی، سوائے ڈاڑھی کے سینہ کا کوئی حصّہ نظر ہی نہ آتا تھا جوان تھے۔ سیاہ ڈاڑھی تھی۔ سر گھوٹم گھوٹ تھا۔ آنکھیں سُرخ تھی۔ ایک موٹے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں تھی، اور ایک موٹا سا ڈنڈا پاس رکھا تھا۔ دیکھتے ہی میری نور روح فنا ہو گئی۔ ڈاڑھی کیا تھی۔ جنگل کا جنگل ساتھ لیے پھرتے تھے۔"

زرقا:۔ "مردار بکے چلی جائے گی، ڈاڑھی سنت ہے۔"

جمیلہ:۔ "ایسی ڈاڑھی سنت ہے جیسی اس ملّا کی تھی۔ خدا کی قسم نہیں ہو سکتی، اچھا تو اپنے ملّا جی سے پوچھ لیجئے۔"

زرقا:۔ "کمبخت، نہیں تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔"

جمیلہ:۔ "چند روز میں معلوم ہو جائے گا کہ دماغ میرا خراب ہے یا تیرا خراب تھا۔ اچھا اس تیرے ملّا کا نام کیا ہے۔ ہاں نام تو معلوم ہو گیا۔ کون ہے۔"

زرقا:۔ "ان سے ہی پوچھنا۔ مردار دماغ چاٹ گئی۔ بھلا جب سے تو آئی ہے تیری زبان تالو سے بھی لگی ہے۔"

جمیلہ:۔ "میں تجھے نصیحتیں کر رہی ہوں۔"

زرقا:۔ "یہ نصیحتیں ہیں۔"

جمیلہ: "اب تیری سمجھ کا قصور ہو تو میں کیا کروں۔ اگر تیرے ملّا کی ڈاڑھی بھی چھاج کی چھاج ہوتی، اور سارے سینہ پر جھاڑی کی طرح پھیلی ہوتی۔ تو دعویٰ سے کہتی ہوں۔ ہرگز بھی تو اسے اپنے گھر کے قریب نہ پھٹکنے دیتی۔"

اس روایت کے سنانے سے میرا یہ مطلب تھا کہ اگر وہ بھی ڈاڑھی چھوڑ دے۔ اور شرعی حدود سے بڑھانا چاہے تو ہرگز نہ بڑھانے دینا۔ نہیں تو اس کے سینہ پر جنگل لہرانے لگے گا۔

زرقا:۔ "بے تو بڑی ملّانی چلی ہے۔ روایت بیان کرنے۔ ذرا اپنی شکل تو دیکھ"

جمیلہ:۔ "الحمدللہ میری شکل خاصی اچھی ہے۔ سن تو سہی، اس ملّا نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ جس کی دعوت کی تھی۔ بس آ گئے مزے میں اور دے ڈالا پیغام میں نے جب سنا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ روح فنا ہونے لگی۔ دم سا گھٹنے لگا۔ لیکن خیریت ہوئی کہ ابا جان نے انکار کر دیا۔"

زرقا نے ہنس کر کہا "خدا کی قسم اگر تو ان ملا کے پلے بندھ جاتی تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ وہ اُس موٹے ڈنڈے سے مار مار کر تجھے سیدھا کر دیتے اور تو جو ڈاڑھی والوں کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہے۔ ہرگز نہ پڑھتی"

جمیلہ:۔ "سچ پوچھتی ہے زرقا، میں تو بے موت مرجاتی۔ جب وہ ڈاڑھی کا جنگل نظر آتا تو روح نکل جانے میں باقی ہی کیا رہ جاتا"

زرقا:۔ اچھا ان ڈاڑھی والے کو دیکھ کر تجھے ڈاڑھی والوں سے تعصب کیوں ہو گیا ہے"

جمیلہ:۔ خدا نہ کرے، جو مجھے ڈاڑھی والوں سے تعصب ہو، جانتی ہوں ڈاڑھی سنت رسول (صلعم) ہے۔ میرے ابا جان اور خالو جان کے بھی ڈاڑھی ہے۔ بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ قاعدہ میں ہے مجھے تو اس ڈاڑھی سے ہول سا چڑھتا ہے جو خودرو گھاس کی طرح بے ڈھنگے پن سے بڑھتی جاتی ہے۔ یا رعب ڈالنے کے لیے بڑھالی جاتی ہے۔ شرعی حد کے اندر جو ڈاڑھی ہو وہ اچھی اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور بے ڈھنگی ڈاڑھی تو جھاڑی سی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ڈاڑھی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں سے نائی نہ ملا ہو"

زرقا نے ہنس کر کہا "دیکھتی جا تیرے لیے ایسا ہی دُولہا ڈھونڈا جائیگا"

جمیلہ:۔ "تو کفن اور گور کا انتظام پہلے کر لینا"

اسوقت سعید وہاں آنکلے۔ انہوں نے کہا "بھئی زرقا، بھائی رشید کا نیا نامہ کہاں ہے"

جمیلہ بے حجاب اور بے نقاب بیٹھی تھی، اسے یا زرقا کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کے کمرہ میں آکر ان کی تنہائی میں مخل ہو گا۔ سعید بھی شاذ و نادر ہی زرقا کے کمرے میں جاتے تھے۔ جمیلہ نے انہیں دیکھا، اسی وقت ان کی نظر بھی جمیلہ پر پڑی۔ جمیلہ نے شرما کر اپنے گھٹنوں میں سر دے لیا۔ سعید نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اوہ معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسوقت تمہارے پاس تمہاری کوئی سہیلی بیٹھی ہے"

وہ واپس چلے گئے۔ جمیلہ نے سر اٹھایا، اور مورنی کی طرح لمبی گردن کر کے جھانکا۔ وہ جا چکے تھے۔ جمیلہ نے کہا "ارے یہ کون بزرگ تھے"

زرقا :۔ تو انہیں بھول گئی۔ یہ میرے بھائی جان سعید تھے۔"

جمیلہ :۔ ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گئے ہیں۔ جب چھوٹے سے تھے تب دیکھا تھا۔"

زرقا :۔ تو تو شاید انہیں بھول گئی ہوگی، مگر انہیں تیری شرارتیں اب تک یاد ہیں۔ کبھی کبھی تیرا ذکر کر کے ہنسا کرتے ہیں۔"

جمیلہ :۔ وہ بچپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت واقعی میں بہت شریر تھی۔ خالہ جان کا بھی ناک میں دم کر دیا کرتی تھی۔"

زرقا :۔ گویا اب تو بڑی سنجیدہ اور متین ہو گئی ہے۔ کمبخت پہلے سے بھی زیادہ شوخ ہو گئی ہے۔ تو۔"

جمیلہ :۔ ارے اب تو خالہ جان کہا کرتی ہیں کہ ہماری جمیلہ بڑی متین اور نیک ہو گئی ہے۔"

زرقا :۔ نیک اور متین ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جیسی تو ہے۔ پارہ کی طرح تو تیرا جسم حرکت کرتا رہتا ہے۔ پارہ کو قرار ہے اور تجھے قرار نہیں۔ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔"

جمیلہ :۔ چھوڑ ان باتوں کو، یہ بتا یہ رشید کون ہے۔"

زرقا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور کہا۔ مجھے کیا خبر۔"

جمیلہ نے شرارت سے اس کے چٹکی لیکر کہا۔ اچھا۔ شرما رہی ہے۔ اس مُلا کا نام لیتے ہوئے۔ بھئی نام تو اچھا ہے۔ اور نام ہی کیا وہ ہیں ہی اچھے چلو نام تو معلوم ہو گیا۔"

زرقا :۔ اور کچھ بک لے۔"

جمیلہ :۔ میں بہت بک چکی۔ اب تو بک۔ سنا اپنی داستان۔"

زرقا :۔ پہلے اپنی باتیں تو ختم کر لے۔"

جمیلہ :۔ پھر کروں گی۔ ہاں کر شروع۔"

زرقا :۔ اگر تجھے میری داستان سننی ہے تو چپ بیٹھ کر سُن۔"

جمیلہ :۔ بالکل چپ رہوں گی۔"

زرقا :۔ اچھا تو سُن۔

چودھواں باب

ایک بزرگ

زرقا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جمیلہ نے کہا۔ "پہلے ایک بات سُن لے۔"

زرقا :- "پھر شروع کی بک بک۔"

جمیلہ :- "بک بک نہیں۔ ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

زرقا :- "کیا ؟"

جمیلہ :- "یہ کہ اپنی داستان میں کوئی بات چھوڑ نہ جانا۔"

زرقا :- "کیوں چھوڑ جاؤں گی۔ میں۔"

جمیلہ :- "یہ بات میرے پوچھنے کی نہیں۔ اپنے دِل سے پوچھنے کی ہے مگر کہہ تو، میں سمجھ جاؤں گی کہ تو نے کہاں بات کاٹ دی۔ کہاں قِصّہ چھوڑ دیا۔

زرقا :- "کیسے سمجھ جائے گی۔"

جمیلہ :- "قصّہ کے ربط سے۔ اب ٹال مت کہہ ڈال۔"

زرقا :- "سنتی تو ہے ہی نہیں۔ کیوں کیا۔"

جمیلہ :- "بالکل سن رہی ہوں۔"

زرقا نے بیان کیا۔

" بھائی جان کے پیدا ہونے کے بعد امی جان کی آرزو ہوئی کہ ایک لڑکی بھی خدا دے۔"

جمیلہ نے کہا۔ اور لڑکی بھی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہو۔"

زرقا:۔ پھر بولی تو۔"

جمیلہ:۔ اوہ غلطی ہو گئی۔"

زرقا:۔ بات بات میں جب تو بولتی اور رائے زنی کرتی رہے گی تو نہ میں بیان کر سکوں گی نہ تو سن سکے گی۔

جمیلہ:۔ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب نہ بولوں گی۔ کہہ۔"

زرقا:۔ نے پھر بیان شروع کیا۔"

"خدا نے امی جان کی دعا قبول کر لی۔ میں پیدا ہوئی۔ امی جان اور ابا جان دونوں ہی کو میرے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ میں صورت شکل کی اچھی تھی۔"

میں بڑے لاڈ پیار سے پرورش پانے لگی، جوں جوں بڑی ہوتی گئی۔ میری محبت میرے والدین کے دل میں اور بڑھتی رہی۔ جب میں چھ برس کی ہوئی تو مجھے پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ مولوی صاحب مجھے بڑے پیار سے پڑھانے لگے، کہتے ہیں۔ میں بڑی ذہین تھی۔ مولوی صاحب ایک دو دفعہ سبق بتلا دیتے اور میں یاد کر لیتی۔ میں نے ایک سال میں کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مجھے پڑھنے کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے ہی میں گذارتی۔" جب میں آٹھ برس کی ہوئی تو ایک چڑیل پلے پڑ گئی۔

زرقا جمیلہ کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ جمیلہ نے کہا۔ ارے چڑیل۔ مجھے چڑیل بتا رہی ہے۔ یہ نہیں کہتی کہ ایک بھلی لڑکی ایک خوبصورت بلا کے پنجہ میں پھنس گئی۔"

زرقا:۔ خیر تو بھی پڑھنے آ گئی۔ اور چند ہی روز میں ہم تم گھل مل گئیں۔" کچھ وقفہ کے بعد زرقا نے بیان کرنا شروع کیا۔

ایک روز جب میں مدرسہ سے گھر گئی تو ایک بزرگ ابا جان سے باتیں کرتے ہوئے ملے۔ ان کی ڈاڑھی سفید اور خوبصورت تھی۔ چہرہ سے رعب و وقار ٹپک رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ اور ابا جان سے پوچھا" کیا یہی زرقا ہے۔"

ابا جان نے کہا" جی ہاں۔"

اور ابا جان نے مجھے آواز دی، بیٹی زرقا ذرا یہاں آنا۔"

میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان بزرگ کو سلام کیا۔ انہوں نے دُعا دے کر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ پوچھتے رہے بیٹی کیا پڑھتی ہو۔ میں جواب دیتی رہی۔ انہوں نے میرے ہاتھ دیکھے۔ پیشانی دیکھی۔ اور ابا جان سے کہا۔ یہ لڑکی صاحب جمال تو ہے ہی مگر صاحب نصیب بھی ہے۔ میں نے اندلس میں علم نجوم پڑھا ہے۔ کچھ تجربہ ہے۔ سیاروں کی چال سے واقف ہوں"۔

وہ کچھ اور کہتے ہیں کہ ابا جان نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم نجوم کے قائل ہو۔ بزرگ بولے" قائل ہونا۔ اور اعتقاد رکھنا اور بات ہے میں یہ مانتا ہوں کہ نجوم ایک علم ہے۔ اس علم کا تعلق سیاروں سے ہے۔ سیاروں کا اثر انسان کی صحت اور قسمت پر پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص سیاروں کی چال سے خوب واقف ہے اور علم نجوم اچھی طرح جانتا ہے تو وہ بعض آئندہ حالات سے واقف ہو سکتا ہے لیکن جسے علم غیب کہتے ہیں۔ وہ سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ نجوم کے علم میں غلطی بھی ہو سکتی ہیں، لیکن علمِ غیب میں جو صرف خدا کو حاصل ہے۔ کوئی غلطی نہیں ہو سکتی"۔

اگر میری عمر اس وقت بہت کم تھی۔ میں ان باتوں کو کچھ بھی نہیں جانتی اور سمجھتی تھی۔ لیکن میرے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں اپنے آئندہ کے حالات معلوم کروں مگر شرم نے اجازت نہ دی، اور میں خاموش بیٹھی رہی"۔

ابا جان نے کہا "یہ سنا تو میں نے بھی یہ ہے کہ سیاروں کی چال سے انسان کا تعلق ہے مگر اس پر کبھی یقین نہیں کیا"۔

بزرگ:۔ یقین کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ جو لوگ پورے طور پر نجوم کا علم نہیں جانتے۔ وہ اکثر غلطی کر جاتے ہیں۔ اور جو نجوم کو اچھی طرح جانتے ہیں وہ کچھ بتاتے نہیں۔ اس لیے صحیح حالات نہیں معلوم ہوتے"۔

ابا جان:۔ آپ نے علمِ نجوم کہاں حاصل کیا۔؟"

بزرگ:۔ قرطبہ میں۔ وہاں کئی عرب سائنس اور نجوم کے بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے بڑی دماغ سوزی سے یہ علم حاصل کیا ہے۔ سائنسدانوں نے سائنس میں ترقی کی ہے۔ اور نجوم کے عالموں نے ایسی تقویم بنائی ہے جس سے بہت کچھ واقعات وحالات معلوم ہو جاتے ہیں۔

ابا جان :۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ مجھے اس بچی سے بہت زیادہ محبت ہے۔"
بزرگ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ معاف کرنا یہ بچی ایسی حسین اور خوش جمال ہے کہ ا۔سے پیار کرنے کو سب کا دل چاہے گا۔ خدا نے صورت کے ساتھ اچھی آواز بھی عطا کی ہے۔ اطوار بھی شائستہ۔ ادائیں بھی پسندیدہ ہیں۔ پھر کون اس سے محبت نہ کرے گا۔ لیکن —"

بزرگ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ ابا جان نے کہا" لیکن کیا۔؟"

بزرگ :۔ کچھ نہیں "

ابا جان :۔ نہیں کہئے "

بزرگ :۔ بات یہ ہے کہ حسینوں کی قسمتیں کچھ عجیب ہوتی ہیں۔ بعض نہایت عسرت اور تنگی میں بسر کرتی ہیں۔ بعض کسی ظالم و جابر مرد کے پلہ پڑ جاتی ہیں اور تمام عمر ظلم و ستم سہتی رہتی ہیں۔ بعض حادثات کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بعض قتل کر دی جاتی ہیں۔ بعض ملک میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔ بعض فخرِ قوم بن جاتی ہیں، بعض امیر کبیر ہو جاتی ہیں۔ اور بعض ملکہ اور سلطانہ بن جاتی ہیں "

ابا جان :۔ مگر آپ نے ابھی کہا تھا کہ زرقا صاحب نصیب بھی ہے "

بزرگ :۔ میں نے اس کی بلند پیشانی دیکھ کر ایسا کہا تھا "

ابا جان :۔ آپ نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اچھا ہوتا کہ آپ اس ذکر کو شروع ہی نہ کرتے اور اب جبکہ شروع کیا ہے تو کچھ تفصیل سے بتائیے "

بزرگ :۔ اب اچھا یہ ہے کہ تفصیل نہ سنیئے "

ابا جان :۔ اگر یہ ذکر ہی شروع نہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر اب اشتیاق پیدا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے زرقا کے متعلق جو کچھ آپ کو علم کے زور سے معلوم ہو وہ سب بتا دیجئے "

بزرگ :۔ بہت اچھا "

انہوں نے پھر میرے ہاتھ دیکھے۔ پیشانی دیکھی کچھ سوچتے رہے یا حساب لگاتے رہے۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔ اچھا یہ تو بتائیے یہ کس تاریخ میں کس سن میں اور کس وقت پیدا ہوئی تھی۔

ابا جان نے سوچ سوچ کر، دن، تاریخ، سنہ اور وقت سب بتا دیا۔ بزرگ نے کہا "یہ آپنے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے بتانے میں؟"

ابا جان:۔ نہیں مجھے ہر بات اچھی طرح یاد ہے، وہ سوچنے لگے۔ سوچتے رہے کچھ دیر کے بعد انہوں نے اس طرح بیان کرنا شروع کیا۔ جیسے وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ انہوں نے کہا۔ اس بچی کی قسمت ضرور اچھی ہے۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ مشکلات اور حادثات بھی ہیں۔ اسے کوئی لیجانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے فعل سے اسے تکلیف پہنچے گی۔ مگر بچ جائے گی۔ اور جب یہ جوان ہوجائیگی تب کوئی سفاک آدمی اس پر دست درازی کرے گا۔ یہ پریشان اور مغموم رہے گی۔ غم و فکر سے ہلکان ہو جائے گی۔ رات اور دن غمزدہ رہے گی۔ ایک مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کرے گی۔ لیکن خدا فضل کرے گا۔ یہ تمام آفتوں سے نجات پاجائیگی، اور پھر۔۔

وہ خاموش ہو گئے۔ ابا جان اور میں دونوں بڑے توجہ سے سُن رہے تھے ان کے خاموش ہوتے ہی ابا جان نے کہا "پھر کیا ہو گا۔؟"

بزرگ:۔ اس کے بعد اس کا ستارہ بہت ہی روشن ہے دن کے آفتاب کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یا تو یہ بڑی دولت مند اور امیر کبیر بن جائے گی یا کسی ملک کی ملکہ بنے گی۔"

ابا جان نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "ایسی قسمت کہاں ہم لوگوں کی ہم تو مفلس ہیں۔ مجھے تو صرف یہ پوچھنا ہے کہ اس کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

بزرگ:۔ نہیں، اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ابا جان:۔ بس مجھے صرف اتنا ہی پوچھنا تھا۔ خدا اسے ہر آفت سے بچائے رکھے۔ اچھا زرتاا، اب تم جاؤ۔"

میں وہاں سے چلی آئی۔

پندرھواں باب

ابنِ شمعون

زرقا نے بیان کیا۔

"میں نے اپنی قسمت کا حال سنا تھا۔ ناسمجھی کے زمانہ میں کچھ باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ کچھ بالکل سمجھ میں نہیں آئیں۔ قسمت اچھی ہے۔" یہ بات تو بالکل صاف تھی، اور سمجھ میں آگئی۔ آخر کے فقرے کہ "اس کا ستارہ بہت روشن ہے یا تو یہ امیر کبیر بن جائیگی۔ یا کسی ملک کی ملکہ بنے گی، یہ بات بھی سمجھ میں آگئی لیکن یہ باتیں کہ جوان ہوکر مغموم اور پریشان رہے گی، کوئی سفاک آدمی دست درازی کرے گا۔ ایک مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کرے گی۔" یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ "خودکشی" کا لفظ ہی نہیں سنا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ خودکشی کیا بلا ہوتی ہے۔ بہت غور کیا کچھ نہ سمجھی مگر جب یہ خیال آیا کہ کوئی مجھے چرا کر لیجائے گا" تو دل دھک سے ہوگیا۔ یہ سنا تھا کہ چور دولت و سامان چرا کر لیجاتے ہیں۔ بچوں کی چوری کا حال کبھی نہیں سنا تھا ہول ہوگئی کہ کیا کرتے ہونگے چور بچوں کو۔" اور چور کیسے ہوتے ہیں۔ بہت ڈر معلوم ہوا۔ چور کے نام سے۔ ایک روز میں نے امی جان سے پوچھا "خودکشی کسے کہتے ہیں۔"

انہوں نے بے خیالی میں جواب دیا۔ "آدمی زندگی سے تنگ ہوکر اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ اسے خودکشی کہتے ہیں۔"

میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ انسان اپنے آپ کو کیسے مار سکتا ہے میں

چپ ہوگئی۔"

میں جامع اندلس میں پڑھا کرتی تھی۔ وہاں تجھ سے ملاقات ہوئی تھی تو بڑی شوخ تھی۔ مجھے بہت تنگ کیا کرتی۔ تیری شرارت دیکھ کر تو دل چاہتا تھا کہ تجھ سے بات بھی نہ کروں۔ مگر خدا جانے تیری صورت میں کیسی کشش اور باتوں میں کیسی مٹھاس تھی کہ دل نہ چاہنے پر بھی تجھ سے بولتی تھی، تیرے پاس بیٹھتی تھی۔ اور تیری شرارتوں کو برداشت کرتی تھی، جس روز تو نہ آتی یا مجھ سے نہ بولتی تو میرا دل پریشان ہوجاتا۔"

زرقا نے جمیلہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا" اور خوبصورت چڑیل۔ تو ایسی ظالم تھی کہ تو اکثر روٹھ جاتی تھی اور مجھ سے منتیں اور خوشامدیں کرایا کرتی تھی،

جمیلہ نے ہنس کر کہا" اس زمانہ کی مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ مجھے تجھے ستانے اور تجھ سے روٹھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اگرچہ مجھے تجھ سے ایسی محبت تھی کہ اگر تو خفا ہوجاتی۔ مجھے نہ مناتی، روٹھی رہتی تو میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑا کرتی بلکہ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اسوقت تو بہت بھولی تھی۔ میں جان کر روٹھ جاتی بلاوجہ اور بغیر سبب کے تو مناتی۔ میں من جاتی۔

زرقا:۔ چڑیل تو بہت ہی شریر تھی۔ اگر مجھے یہ بات معلوم ہوجاتی تو میں تجھ سے ناک رگڑواتی۔

جمیلہ نے مسکرا کر کہا معلوم ہی کیوں ہوجاتی خیر ——— بیان کر تو اپنی داستان،

زرقا نے بیان کرنا شروع کیا۔

"میرے دل میں آئی کہ میں تجھ سے ان بزرگ کی باتیں بیان کردوں لیکن نہ معلوم کیوں مجھے کچھ جھجک ہوئی۔ اس بات کو ایک سال گذر گیا۔ اور میں نو سال کی ہوگئی۔ مجھے اس بیان کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ جوں جوں میں بڑی ہوتی جاتی میری صورت اور دلفریب ہوتی جاتی تھی۔ امی جان اکثر کہا کرتی تھیں کہ مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کہیں تجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ خدا نے خیر رکھی تو اگلے سال تجھے پردہ میں بٹھا دوں گی ہمارے گھر جو بیگمیں اور بیبیاں آتی رہتی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر میرے حسن کی تعریفیں کیا کرتی تھیں، بعض بڑی بوڑھیاں تو کہہ دیتیں، ماشاءاللہ ہماری زرقا ہزار دو ہزار میں ایک ہے۔ خدا عمر دے اور زندہ رکھے۔ بڑی حسین اور نازنین ہوگی

اس کا دولہا اُس کے پاؤں دھو دھو کر پیا کرے گا۔ میں شرما کر وہاں سے ہٹ جاتی۔
میری ہمسن تمام لڑکیاں، سہیلیاں۔ حتیٰ کہ تو بھی مجھے مغرب اقصیٰ کی حور کہہ کر تی تھیں
غرض میرے حسن و جمال کی تذکرے شروع ہو گئے تھے، میں نکھرتی جا رہی تھی گلاب کی سربند
کلیوں کی طرح۔

ایک روز میں جامع اندلس سے آ رہی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں صبح نہا کر کپڑے
بدل کر اور عطر لگا آئی تھی، دھوپ ہو رہی تھی میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ راستہ میں مجھے ایک
یہودی ملا۔ جوان آدمی تھا۔ زرد کپڑے پہنے تھا۔ اس کے سر پہ بال تھے۔ اس نے
مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں چلتی رہی۔

دفعتاً وہ تیز چل کر میرے پاس آیا۔ اور پوچھا "لڑکی، تم کون ہو" میں کچھ نہیں بولی۔
آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ اُس وقت اس سڑک پر کوئی شخص نہیں آ جا رہا تھا۔ اُس نے
میرا راستہ روک لیا۔ اور پوچھا "تم کس کی لڑکی ہو"
میں نے کہا "تم کیوں پوچھتے ہو"
اُس نے کہا۔ "مجھے ایک خوشخبری سنانی ہے"
میں: "سناؤ"
یہودی: "پہلے یہ بتاؤ تم کس کی لڑکی ہو"
میں: "میرے والد کا نام صالح ہے"
"صالح" "صالح" اُس نے کئی مرتبہ کہا۔ کہتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی
صورت سے خوف معلوم ہونے لگا۔ وہ غور کر رہا تھا۔ جیسے اپنی یادداشت تازہ
کر رہا ہو۔ آخر اسے کوئی بات آ گئی۔ اُس نے کہا "تم صالح کی بیٹی ہو"
میں نے کہا "جی ہاں"
اس نے کہا "اپنے والد سے کہنا۔ ابن شمعون ملا تھا۔ آپ کو سلام کہتا تھا"
میں نے کہا "کہہ دوں گی"
ابن شمعون مجھے برابر گھورے جا رہا تھا۔
اُس نے کہا۔ "میں بہت جلد تمہارے والد کے پاس آؤں گا۔ وہ مجھ پر بہت
مہربان ہیں"

میں کچھ نہیں بولی۔ اس نے پھر کہا تم نہایت حسین لڑکی ہو۔ شاعروں کے تخیلات سے بھی زیادہ حسین تمہارا حسن بے پناہ ہے۔ اگر دنیا میں حورزادیاں موجود ہیں، تو تم ان میں سے ایک ہو۔

؏ : غضب ہو کمسنی میں تم جوانی میں ستم ہو گی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے برُا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے میرا راستہ روک رکھا تھا۔ کبھی میں نظریں جھکا لیتی تھی، کبھی اسے دیکھنے لگتی تھی۔

اگرچہ ہم دونوں کو وہاں کھڑے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی، مگر اب تک بھی کوئی راہرو اس راستہ سے نہیں گذرا۔ میں زرد پوش جن سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ خدا کا بندہ ہٹتا ہی نہ تھا۔

میں یہودیوں کو کچھ اچھا نہیں سمجھتی تھی، میں نے سن رکھا تھا کہ یہودی دولت مند ہوتے ہیں۔ پیسہ پیسہ پر مرتے ہیں۔ سود خوار ہوتے ہیں۔ پیسہ ان کا ایمان اور پیسہ ان کا مذہب ہوتا ہے۔ اسی پیسہ کی وجہ سے وہ بڑے مغرور اور متکبر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں سے خدائی بیر رکھتے ہیں۔ انہیں ستانے اور نقصان پہنچانے سے نہیں چوکتے۔ بڑے بیرحم اور سنگدل ہوتے ہیں۔ خود پیسہ کے غلام ہوتے ہیں۔ اور دنیا کو اس پیسہ کے زور سے اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں چلنے لگی۔ اُس نے کہا۔" تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ زرقا۔"

ابن شمعون :- جیسی صورت پیاری ہے۔ ویسا ہی نام بھی پیارا ہے۔ ابھی نہ شمع محفل یا آفتاب خانہ بننے کے قابل ہو۔

میں نے کچھ بھی نہیں سمجھا کہ اس نے کیا کہا۔ شمع محفل اور آفتاب خانہ سے اس کا کیا مطلب تھا۔ اب میں اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ مگر وہ مجھے برابر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ گھور رہا تھا۔ جیسے مجھے اپنی آنکھوں کی کھڑکیوں میں چھپا لینا چاہتا تھا۔

کچھ وقفہ کے بعد اس نے کہا۔ اچھا زرقا اگر میں تمہیں کوئی تحفہ دوں تو کیا تم قبول کر لوگی؟

ہم سہیلیاں تو آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ دیتی رہتی تھیں لیکن کسی لڑکے یا مرد نے ہم میں سے کسی کو بھی کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا تھا۔ نہ میں یہ جانتی تھی کہ مرد لڑکیوں کو تحفہ دیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا: "نہیں ــ"

اُس نے متعجب ہو کر کہا: "نہیں، کیوں ـ؟"

میں :۔ اس لیے کہ مردوں کا تحفہ لڑکیاں نہیں لیا کرتیں"

ابن شمعون :۔ اور کس کا تحفہ لیتی ہیں۔ لڑکیاں ـ؟"

میں :۔ اپنی سہیلیوں کا"

میں نے اس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس نے کہا۔ بڑی بھولی ہو تم نہایت ہی معصوم جو حسین لڑکیاں معصوم نہیں ہوتیں۔ وہ بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ میں نے اس ذرا ہی سی دیر میں تمہیں خوب جانچ لیا ہے۔ تم جس قدر دلربا ہو۔ اسی قدر معصوم بھی ہو۔ میں نے تم پر ظلم کیا تمہیں۔ دھوپ میں کھڑا رکھا، تمہارے چہرہ کا رنگ، خونچکا ہو گیا ہے۔ اچھا جاؤ"

وہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں چلی آئی"

سولہواں باب ۱۶
ایک انکشاف

میں سوچتی چلی گئی۔ یہ یہودی کون تھا۔ ابا کو جانتا ہے۔ معلوم مالدار ہوتا ہے۔ مگر اُس نے کہا تھا۔ ایک خوشخبری تو اس نے سنائی ہی نہیں میں نے بھی نہیں پوچھا اور اور باتیں ہوتی رہیں۔ دراصل مجھے یاد ہی نہیں رہا۔

مگر اب اسکی باتیں یاد کر کے سوچتی ہوں۔ اُس نے مجھے چکمہ دیا تھا۔ خوشخبری کچھ نہیں سنانی تھی۔ وہ مجھے اس بہانہ سے روکنا چاہتا تھا۔

اسی روز شام کے وقت میں نے ابا جان سے ابن شمعون کا ذکر کیا۔ اس کا سلام بھی کہا۔ انہوں نے اپنے حافظہ پر بہت زور دیا۔ لیکن انہیں یاد نہیں آیا کہ ابن شمعون کون ہے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ اس نے کیا کیا باتیں کی تھیں۔"

اب کیا کہتی میں ان سے۔ اس نے سوائے میرے حسن کی تعریف کرنے کے اور کچھ کہا ہی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ اُس نے سلام کہا تھا۔ اور کہا تھا۔ تمہارے والد مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ میں اُن سے ملنے آؤں گا۔

ابا جان نے پھر اپنے حافظہ پر زور ڈالا۔ سوچنے لگے مگر انہیں ابن شمعون یاد نہیں آیا۔ انہوں نے کہا۔ بہت یہودی ہمیں جانتے ہیں۔ اور بہت سے یہودیوں

وہم جانتے ہیں، یاد نہیں آتا۔ ابن شمعون کون ہے۔ خیر جب وہ آئے گا تو شاید صورت دیکھ کر پہچان لیں۔"

امی جان بھی اسوقت موجود تھیں۔ انہوں نے کہا، "مجھے بنی اسرائیل (یہودیوں) سے بڑا ہی خوف معلوم ہوتا ہے۔ بڑے خود غرض مکار اور سفاک ہوتے ہیں۔ میں نے کہا تم ان یہودیوں سے ربط ضبط نہ رکھا کرو۔"

ابا جان:۔ ہم ان سے ربط ضبط کہاں رکھتے ہیں۔ جو یہودی آجاتے ہیں۔ ان سے باتیں کر لیتے ہیں۔ میل جول نہیں رکھتے۔

امی جان:۔ کیا ابن ابراہیم یہودی سے میل جول نہیں ہے تمہارا۔"

ابا جان:۔ اس سے میل جول محض لین دین کی وجہ سے ہے۔ تم خوب جانتی ہو کہ ہماری آمدنی اتنی نہیں ہے کہ ہم اس میں آسانی سے گذر کر لیں۔ آئے دن روپے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ابن ابراہیم ہماری ضرورت پوری کر دیتا ہے۔

امی جان:۔ اور وہ ایک ایک کے دو دو لیتا ہے۔ اس کا قرضہ ہی نہیں چکنے میں آتا۔ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں اس کا انجام کیا ہوگا۔"

ابا جان:۔ قرضہ چکے کہاں سے جب جاگیر سے آمدنی ہوتی ہے تھوڑا بہت اسے دے دیتے ہیں۔ اور جس قدر اسے دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ پھر لے لیتے ہیں۔ اس سے قرضہ گھٹتا نہیں، اور بڑھتا ہے۔ وہ تو ابن ابراہیم بھلا آدمی ہے۔ کبھی تقاضا نہیں کرتا ہے اور جب ہمیں ضرورت ہوتی ہے اور دے دیتا ہے۔

امی جان:۔ اور اس کے قبضہ میں ہمارے باغ کتنے ہیں۔"

ابا جان:۔ ہم نے اسے صرف تین باغات دے رکھے ہیں۔ وہ باغات بھی پھلتے نہیں ہیں۔"

امی جان:۔ ان کی آمدنی کس قدر ہے۔"

ابا جان:۔ برسوں سے ابن ابراہیم کے قبضہ میں ہیں۔ وہی ان کی بہار فروخت کرتا ہے۔ آمدنی کا کبھی حساب نہیں لگایا۔"

امی جان:۔ ابن ابراہیم کوئی نادان نہیں ہے۔ بڑا گھاگ یہودی ہے۔ وہ تمہیں دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹ رہا ہے۔ آمدنی کا حساب نہیں دیتا اور رقم پر قرضہ

بڑھاتا چلا جاتا ہے۔"

ابا جان:- تم نازک دل اور نازک دماغ کی عورت ہو۔ حساب کتاب کو کیا سمجھو۔
یہ کہکر ابا جان ہنسنے لگے۔ امی جان چپ ہو گئیں۔ اس روز مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔
کہ ہماری آمدنی اس قدر نہیں ہے جس سے ہمارے اخراجات چل سکیں۔ ابا جان
کو گھر کا خرچ چلانے کے لیے قرضہ لینا پڑتا ہے اور قرض کا بار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

حالانکہ اس سے پہلے میں یہ سمجھتی تھی کہ ہم بھی اوروں کی طرح مالدار ہیں۔ یہ خیال
اس وجہ سے تھا کہ میرے کپڑے نہایت عمدہ امیروں کی لڑکیوں جیسے ہوتے تھے،
زیورات بھی سونے کے اور عمدہ تھے۔ میں جب اپنی کسی سہیلی کو کوئی اچھا کپڑا پہنے
دیکھتی۔ ابا جان سے کہتی اور اس قدر اصرار کرتی کہ وہ مجھے اس سے بھی اچھا خوبصورت
اور بیش قیمت کپڑا لا دیتے۔ یا کسی کا کوئی زیور مجھے پسند آتا میں امی جان سے کہتی۔
وہ ٹال جاتیں۔ مگر جب ابا جان سے کہتی تو وہ بنوا دیتے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے کپڑے اور زیور قرضہ سے بنوائے جاتے تھے۔
اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی، میں نے اپنے آپ کو نفرین کی کہ تو نے اپنے ابا جان
کو روحانی تکلیف پہنچائی، انہیں قرضہ میں پھنسا دیا۔ میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ اب
انہیں کوئی تکلیف نہ دوں گی، اپنے لیے کچھ نہ بنواؤں گی۔

میں برابر مدرسہ جانے لگی۔ ایک روز شام کے وقت جب میں مدرسہ سے آئی۔
تو میں نے ابن شمعون کو ابا جان کے پاس بیٹھے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی ٹکٹکی میرے
چہرہ کی طرف لگ گئی۔ میں نکل چلی آئی۔

اس کے دو تین روز کے بعد کا ذکر ہے۔ اس روز جمعہ کی تعطیل تھی۔ میں اپنے کمرہ میں
بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی، کتاب پڑھتے پڑھتے میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں کمرہ سے
نکلی۔ بغیر کسی ارادہ کے، جی میں آیا امی جان سے ہی کچھ دو باتیں کر لوں۔

وہ اس وقت دالان کے بغلی والے کمرہ میں تھیں، میں جب دروازہ کے قریب
پہنچی تو ابا جان اور امی جان کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں، میں لوٹنے لگی کہ ابا جان
نے میرا نام لیا۔ میں رک گئی، یہ سننے کے لیے کہ میرا کیا ذکر ہے۔

ابا جان:- "نہ کہا" ابھی زرقا بچی ہے۔ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔"

امی جان نے کہا۔اس کا پڑھنا ڈرھنا بند کر دو۔ وہ سیانی ہو گئی ہے۔اب اِس کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں "

ابا جان :۔امیروں کی لڑکیاں پڑھنے سواری میں جاتی ہیں۔ زرتا کے لیے بھی سواری کا انتظام کر دینگے۔

امی جان :۔اور سواری آئے گی کہاں ۔ سے۔

ابا جان :۔بتایا نہیں کہ ابن شمعون کہتا تھا کہ جس قدر روپے کی ضرورت ہو لے لو۔ وہ بڑا مالدار یہودی ہے۔

امی جان :۔معلوم نہیں تمہاری عقل کہاں چرنے گئی ہے۔پچھلا قرضہ ادا ہی نہیں ہوا۔اور نیا قرضہ لینے کو تیار ہو۔

ابا جان :۔عقل تو تمہاری چرنے گئی ہے۔ساری باتیں سن لیں اور سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "

امی جان ذرا تیز ہو کر کہا۔ کیا سمجھ میں نہیں آیا۔؟"

امی جان نے ذرا تیز مزاج تھیں۔بہت جلد بگڑ جاتی تھیں ابا جان خوش مزاج تھے، وہ اپنی خوش مزاجی سے ان کے غصہ کو دور کر دیتے تھے، انہوں نے کہا "تم نے ایک روز کہا تھا کہ ابن ابراہیم تمہیں دونوں ہاتھوں۔ سے لوٹ رہا ہے۔ آمدنی کا حساب نہیں دیتا، میری سمجھ میں یہ بات آگئی۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ جو تین باغات میں نے ابراہیم کو دے رکھے ہیں، یہ خوب پھلتے ہیں۔ اور ان سے کافی آمدنی ہوتی ہے۔ وہ اس آمدنی کو ڈکار جاتا ہے۔ قرضہ میں مجرا نہیں کرتا اور قرضہ کو بڑھاتا رہتا ہے۔اب فکر میں ہوں کہ کسی اور سے قرضہ لے کر ابن ابراہیم کا قرضہ بیباق کر دوں۔ اور باغات رہن سے چھڑا لوں۔ خدا نے ایک دولت مند کو بھیج دیا۔ اُس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ مجھے جتنے روپے کی ضرورت ہے قرض کے طور پر دے دے گا "

امی جان :۔اور وہ ابنِ شمعون ہے "

ابا جان :۔ ہاں "

امی جان :۔مگر ہے تو وہ بھی یہودی۔ پلبسہ کا غلام۔ شاملاک کی اولاد النساء

کا گوشت تک کاٹ لینے والا۔"

ابا جان :۔ ابن شمعون ایسا نہیں ہے ۔ وہ رہن میں بھی کوئی چیز رکھنا نہیں چاہتا۔ میں اس سے قرضہ لوں گا۔ وہ باغوں کی آمدنی سے بیباق کر دوں گا۔

امی جان :۔ یہ تجویز ہے تو مناسب مگر مجھے ڈر ہے ۔ ابنِ شمعون کوئی چال نہ چل رہا ہو۔"

ابا جان :۔ وہ ایسا نہیں ہے ۔"

امی جان :۔ اچھا گاڑی کی کیا ضرورت ہے ۔"

ابا جان :۔ ہماری بچی پیدل جاتی ہے ۔ مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے وہ سمجھتی ہے کہ میں مالدار ماں باپ کی بیٹی ہوں ۔ اس کا یہ خیال قائم رہنا چاہیئے ۔ میری زندگی میں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں غریب باپ کی بیٹی ہوں ۔

میرے دل پر ابا جان کی گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ جی چاہا دوڑ کر ان کے قدم چوم لوں لیکن اس لیے یہ جرأت نہ کر سکی کہ میری موجودگی کا ان کو علم ہو جاتا ۔ اور میں اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی ۔

میں وہاں سے چلی آئی اور یہ سوچنے لگی کہ ابا جان تو کہتے تھے ، وہ ابن شمعون کو نہیں جانتے یا اس سے ایسی واقفیت نکل آئی کہ اس سے قرضہ لینے کو تیار ہو گئے ۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنے والد کو دولتمند سمجھتی تھی ۔ لیکن وہ دولتمند نہیں تھے ، مگر میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے ، میں چاہتی تھی ۔ وہ میرے لیے گاڑی نہ خریدیں ۔ مگر انہیں کہہ نہ سکتی تھی ۔

سترھواں باب

ایک حادثہ

زرقا بیان کر رہی تھی اور جمیلہ بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اُس نے کہا یہ تو پچھلے دکھڑے کیوں لے بیٹھی۔ میں تو تیری وہ عجیب داستان سننا چاہتی ہوں۔ جس نے تجھے سارے افقی میں مشہور کر دیا ہے۔

زرقا:۔ جب تک میں شروع سے تجھے تمام واقعات نہ سناؤں گی۔ س وقت تک تیری سمجھ میں کچھ نہ آئے گا۔ میں نے وعدہ کیا ہے، تجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہو گا جب سلمیٰ قرطبہ کے ریشم کی قمیض اور شلوار اور بلنسیہ کے ریشم کا دوپٹہ اوڑھ کر آئی تھی۔

جمیلہ:۔ مجھے اس زمانہ کی ایک ایک بات یاد ہے۔ سلمیٰ کا وہ جوڑا ابھی یاد ہے بہت ہی بھلا معلوم ہوا تھا۔ مجھے "

زرقا:۔ یہ بھی یاد ہو گا تو نے مجھ سے کہا تھا۔ زرقا، تو بھی ایسا ہی جوڑا بنوا لے۔ اسے پہن کو تو تو بالکل حور معلوم ہو گی "

جمیلہ:۔ ہاں مجھے یاد ہے "

زرقا:۔ اگر میں نے اپنے ابا جان کی باتیں نہ سُنی ہوتیں اور میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ نہ اُٹھ گیا ہوتا تو ابا جان سے کہتی اور وہ ضرور مجھے ویسا ہی بلکہ اس سے بھی اچھا جوڑا بنوا دیتے۔ مگر میں جان گئی کہ میرے ابا جان اتنی بھاری قیمت کا جوڑا نہیں بنوا سکتے۔ اس لیے میں نے کہہ دیا تھا۔ یہ جوڑا پسند نہیں "

جمیلہ :۔ پھر وہی بکواس ۔ میں کہتی ہوں ان باتوں کے کہنے سے تیرا مقصد کیا ہے۔

زرقا :۔ مقصد کچھ نہیں۔ میں اپنی ساری داستان سنا رہی ہوں تاکہ تیری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ وہ واقعہ ہوا کیوں جس نے مجھے بدنام کر دیا۔

جمیلہ :۔ کیا تو کوڑھ مغز سمجھ رہی ہے مجھے "

زرقا نے مسکرا کر کہا "تو تو سدا کی کوڑھ مغز بنی ہی کیا بھول گئی وہ قمچیاں جب سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے روزانہ کھایا کرتی تھی "

جمیلہ :۔ ہمارے مدرس تو نیک اور اچھے تھے۔ مگر وہ چوہدری تھا وہ بڑا بدمعاش تھا۔ وہ لگائی بجھائی کر کے پٹوایا کرتا تھا۔ مگر ایک روز میں نے اس سے سارے بدلے لیے تھے۔ میں اس کی مسند کے نیچے کانٹے کھڑے کر دیئے تو اس کے چوتڑوں میں چبھ گئے۔ ایک دم وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے اس کے بچھوؤں نے ڈنگ مارے ہوں۔ میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔

زرقا :۔ تو بڑی شریر تھی۔ اور اپنی شرارت کی وجہ سے روز پٹتی تھی "

جمیلہ :۔ کم بخت میرا ہی نمبر پٹنے کا آتا رہتا تھا۔ تجھے کوئی پھول کی سنٹی بھی نہیں لگاتا تھا "

زرقا :۔ میں شرارت ہی نہیں کرتی تھی۔

جمیلہ :۔ یہ بات نہیں ہے۔ آخر پٹتی تو زینب، رقیہ، سلمیٰ سب ہی تھیں۔ نہیں پٹتی تھی تو ایک تو اس وقت تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ تو کیوں نہیں پٹتی۔ مگر اب آگئی ہے تو اس قدر حسین اور نازک تھی کہ تجھے مارنا تو درکنار ہاتھ لگانا بھی مشکل تھا۔ مگر خیر چھوڑ ان باتوں کو اور بیان کر جس طرح تو بیان کرنا چاہتی ہے "

زرقا نے بیان کیا۔

" میں ابا جان سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ میرے لیے گاڑی نہ خریدیں۔ مگر کس طرح کہوں یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ابا جان نے میرے سامنے کہا۔ بیٹی! ہم تیرے لیے ایک عمدہ گاڑی خرید رہے ہیں "

میں :۔ ابا جان! مجھے گاڑی پسند نہیں ہے۔

ابا جان :۔ کیا تجھے گاڑی چاہیے؟

میں :۔ پسند تو ہے۔ مگر مجھے پیدل چلنا اچھا معلوم ہوتا ہے "

ابا جان :۔ مگر اب تو بڑی ہو گئی ہے زرقا۔ تجھے پردہ میں بیٹھنا ہے۔ گاڑی کی ضرورت تو ہے ہی۔

میں چپ ہو گئی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ ابا جان میری خوشی سمجھ کر میرے لیے گاڑی لیکر رہیں گے۔ یہ میں اُن سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ تمہاری مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی نہ خریدیئے۔

غرض گاڑی خرید لی گئی۔ نہایت خوبصورت گاڑی تھی۔ دو گھوڑے تھے۔ گاڑی کے لیے ایک سائیس اور ایک کوچبان دو آدمی اور نوکر رکھے گئے۔ ان کے علاوہ گھوڑوں کا خرچ اور بڑھ گیا۔

مگر ابا جان خوش تھے۔ میری خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے گاڑی خریدنے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ حالانکہ مجھے مطلق بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر بد قسمتی سے پر اتفاقیہ یہ راز نہ کھل جاتا کہ ابا جان دولت مند نہیں ہیں مفلس ہیں اور مقروض ہیں تو واقعی مجھے گاڑی خریدنے سے بڑی خوشی ہوتی۔ میری گاڑی ان تمام گاڑیوں سے بہت زیادہ خوبصورت اور شاندار تھی جو میری دولت مند اور رئیس زادی سہیلیوں کی تھیں۔

مگر مجھے ابا جان کو یہ دکھانے کے لیے کہ گاڑی خرید جانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے خوش ہونا پڑا تھا۔ بات بات پر میں خوشی کا اظہار کرتی تھی۔ جیسے میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ گاڑی کی ہر چیز کی تعریف کرتی تھی۔ ابا جان، مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ میری مصنوعی خوشی سے انہیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ امی جان بھی بظاہر خوش تھیں۔

اب میں گاڑی میں مدرسہ جانے لگی تھی۔ میری گاڑی کو دیکھ کر ساری لڑکیاں رشک کرنے لگیں۔ کئی ایک نے تو اپنے والدین سے میری جیسی گاڑی منگانے کی ضد بھی کی لیکن دولت مند سے دولت مند بھی ایسی گاڑی نہ منگا سکے۔ دراصل گاڑی ملی ہی نہیں نہ معلوم ابا جان نے وہ گاڑی کہاں سے منگائی تھی۔

دن گذرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں دس سال کی ہو گئی۔ میرے سن کے ساتھ ساتھ میرا حسن بھی بڑھتا رہا۔ ناز و نزاکت بھی بڑھتی رہی۔ ابن شمعون اکثر آتا رہتا تھا۔ کئی کئی روز ہمارے یہاں مہمان رہتا۔ جب آتا تحائف ساتھ لاتا۔ کئی مرتبہ ایسے عمدہ

ریشمی تھان لایا جو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

مگر جب وہ آتا مجھے دیکھنے، مجھ سے ملنے اور باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہو جاتا کہ مجھے اس سے باتیں کرنی پڑ جاتیں۔ جب تک میں اس سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ میری صورت تکے جاتا۔ میں نگاہیں جھکا لیتی مگر مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور دیکھے جا رہا ہے۔ مجھے اس کی یہ حرکت بری معلوم ہوتی مگر کچھ کہہ نہ سکتی۔

ایک مرتبہ اسے آتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ ایک جمعرات کو میں امی جان کے ساتھ درگاہ عالیہ میں گئی۔ ہم عصر کی نماز کے بعد درگاہ میں گئے تھے۔ ارادہ مغرب سے پہلے ہی واپسی کا تھا۔ لیکن امی جان کی کوئی سہیلی مل گئیں۔ ان سے باتوں میں دیر ہو گئی۔ کئی لڑکیاں جو میری جانی پہچانی تھیں آ گئیں۔ مجھے امی جان کے پاس سے اٹھا کر لے چلیں۔ ہنستی، بولتی اور شرارتیں کرتی ہوئی ہم درگاہ عالیہ سے باہر نکل گئیں۔

اندھیری رات تھی۔ اگر درگاہ عالیہ میں دن کی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تو باہر بحر ظلمات کی سی تاریکی تھی۔ ایک لڑکی جسے میں نہیں جانتی تھی۔ میرے پاس آئی۔ اُس کے لباس سے میں نے پہچانا وہ کوئی یہودی لڑکی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چلی۔ میں نے کہا "کہاں لے جا رہی ہو مجھے"۔ اُس نے کہا ڈرو نہیں۔ جب یہ لڑکیاں ہمیں ڈھونڈتی ہوئی ہمارے پاس آوینگی تو ہم اُنہیں ڈراویں گے"۔

اندھیرے میں لڑکیاں بچھڑ گئی تھیں۔ ہم دو ساتھ رہ گئی تھیں۔ باقی ہم سے کچھ فاصلہ پر چلی گئی تھیں۔ میں اس لڑکی کے ساتھ بڑھی۔ سامنے زیتون کے درخت کھڑے تھے۔ وہاں تک پہنچ گئی۔ ابھی ہم دونوں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھیں کہ ایک جوان اور تنومند یہودی ایک زیتون کے درخت میں سے پیدا ہوا۔ میں نے تو الیہ ہی سمجھا۔ شاید وہ تنہ سے لگا کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی آگے بڑھ آیا۔ اس نے کہا۔ ایستر! آ گئیں تم۔

میرے ساتھ جو یہودی لڑکی آئی تھی۔ اس کا نام ایستر تھا۔ اُس نے کہا۔ جی ہاں آ گئی۔ لو سنبھالو اپنی زہرہ کو"

یہ کہتے ہی اس نے مجھے یہودی کی طرف دھکیل دیا۔ اس یہودی نے مجھے پکڑ

لیا۔ اور گود میں اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ہر چند اس کی گرفت سے چھٹنے کی کوشش کی لیکن ممکن نہ ہوا۔

میں نے چیخ کر کہا" او ریہودی کتے ہٹ"

میری چیخ کی آواز سُنکر دو مسلمان دوڑ کر وہاں آگئے۔ انہوں نے دُور ہی سے کہا" ہم آگئے ہیں۔ خبردار"

یہودی مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ البتہ پہلے ہی خدا جانے کہاں چلی گئی تھی۔ مسلمان میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا" کیا تھا۔؟

میں نے کہا" ایک یہودی مجھے اُٹھائے لیے جارہا تھا"

انھوں نے پوچھا" وہ کس طرف گیا ہے"

میں نے اشارہ سے بتایا۔ اس طرف"

وہ دونوں اس طرف دوڑ گئے۔ میں بدنامی کے خیال سے وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ درگاہ عالیہ میں داخل ہوئی۔ اور اپنی امیؓ کے پاس آگئی۔ وہ میرا انتظار کررہی تھیں۔ میرے آتے ہی چل پڑیں۔ میں نے ان سے اس حادثہ کا ذکر نہیں کیا۔ جو مجھے پیش آیا تھا۔ ہم گاڑی میں سوار ہوکر اپنے گھر چلے آئے۔

اٹھارھواں باب

پژمردگی

جمیلہ نے کہا:۔ شاید وہ ابن شمعون کا آدمی تھا"

زرقا:۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔

جمیلہ:۔ اور اس یہودی لڑکی کے متعلق کچھ معلوم ہوا۔

زرقا:۔ نہیں۔ اس کے بعد پھر میں نے اسے دیکھا ہی نہیں"

جمیلہ:۔ نہ تو نے اپنے گھر والوں سے اس معاملہ کا ذکر کیا"

زرقا:۔ بالکل نہیں"

جمیلہ:۔ اس واقعہ کے بعد ابن شمعون آیا۔

زرقا:۔ کئی مرتبہ آیا۔ مگر اس کی کسی حرکت سے یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ اس سازش میں شریک تھا۔

جمیلہ:۔ اگر تجھے وہ یہودی پکڑ کر لے جاتا تو کیا ہوتا۔

زرقا:۔ کیا کہہ دوں، کیا ہوتا۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی۔

جمیلہ:۔ اچھا بیان کر۔

زرقا نے بیان کیا۔

اب میں ہوشیار ہو گئی۔ مجھے ان بزرگ کا یہ کہنا یاد آگیا کہ مجھے چرا لے جانے کی کوشش کی جائے گی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں چوری جانے سے

بچ گئی ۔

اوّل تو یہودیوں سے مجھے کچھ پہلے ہی سے تعصب تھا۔ اب یہ تعصب اور بھی بڑھ گیا۔ اور میں یہودی لڑکیوں سے علیحدہ رہنے لگی۔ کہیں آنے جانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔

جب میری عمر بارہ سال کی ہوگئی تو میں نے مدرسہ جانا چھوڑ دیا۔ جی تو پڑھنے کو چاہتا تھا۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس کی وجہ سے مجبور ہو کر تعلیم چھوڑنی پڑی۔ ہوا یہ کہ میں ایک روز گاڑی میں سوار جارہی تھی کہ ہوا سے پردہ کھل گیا۔ سامنے ایک عیسائی نوجوان جارہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بت بن گیا۔ کھڑا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میں جھروکوں سے دور تک دیکھتی چلی گئی۔ اُس نے حرکت نہیں کی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ کہیں کوئی دیوانہ تو نہیں ہے۔ اسی روز جب میں مدرسہ سے واپس آرہی تھی تو کم بخت پردہ پھر اُٹھ گیا۔ دیکھتی ہوں تو سامنے وہی صبح والا عیسائی کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے پردہ ٹھیک کرلیا۔ پہلے تو اس بات پر غصّہ آیا کہ پردہ کیوں کھل کھل جاتا ہے۔ پھر یہ وہم ہوا کہیں وہ عیسائی جادوگر تو نہیں ہے۔ میں نے کتابوں میں جادوگروں کے کچھ حالات پڑھے تھے۔

کئی روز کے بعد پھر ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ پردہ کھل گیا اور میں نے اس عیسائی کو پھر کھڑے دیکھا۔ بہت حیران ہوئی۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ایک ہی مقام پر کیوں کھڑا رہتا ہے۔

ایک روز یہ عقدہ بھی حل ہوگیا۔ ایک بیگم امّی جان سے ملنے آئیں۔ انہوں نے امّی سے کہا۔ سنا ہے۔ چند سرپھرے نوجوان زرقا کی گاڑی کے منتظر رہتے ہیں۔ اور اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک عیسائی نوجوان کا بہت بُرا حال بتایا جاتا ہے۔

اتفاق سے میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ میں سن ہو کر رہ گئی۔ ڈری کہ کہیں امّی جان یہ نہ سمجھیں کہ میں مدرسہ تاک جھانک کرنے جایا کرتی ہوں۔ چنانچہ امّی جان نے کہا "وہ بچی ہے شاید جھانکتی ہوئی جاتی ہو۔"

میں بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ بیگم نے کہا "ایسی بات تو نہیں سنی۔ زرقا بڑی شائستہ اور شرع کی پابند لڑکی ہے۔ وہ خود نہیں جھانکتی۔ البتہ کسی وقت ہوا سے

پردہ کھل جاتا ہو تو کہا نہیں جا سکتا۔

میں نے اسی وقت یہ طے کر لیا کہ اب میں مدرسہ نہیں جایا کروں گی۔ نہ گاڑی میں سوار ہو کر جاؤں گی۔ نہ کوئی تاک جھانک کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اسی روز شام کے وقت میں نے ابا جان سے کہہ دیا "اب میں مکتب میں نہیں جایا کروں گی۔

امی نے پوچھا۔ کیوں بیٹی؟"

میں نے عرض کیا۔ میں نے کافی پڑھ لیا ہے اور زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے"

امی:۔ میں چاہتی تھی یہ سال پورا کر لیتی۔

میں:۔ آپ کے حکم سے مجھے کوئی انکار نہیں مگر امی مولینا کہہ رہے تھے کہ زرقا تم گھر پڑھا کرو تو اچھا ہے"

یہ بات میں نے غلط نہیں کہی تھی۔ ایک مرتبہ مولینا نے مجھ سے علیحدگی میں کہا تھا۔ اس وقت میں ان کی اس بات کا کوئی مطلب نہیں سمجھی تھی۔ البتہ میں نے یہ ضرور خیال کیا تھا کہ ابا جان میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ وہ کسی مولوی صاحب کو میرے پڑھانے کیلئے مقرر کر سکیں۔ اس لیے یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ اور پڑھ کر پڑھنا چھوڑ دوں گی۔

مگر ان بیگم کی باتیں سنکر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ شاید مولینا کو بھی کوئی اسی قسم کی بات معلوم ہوئی ہو گی۔ اس بات کو خیال کر کے میں اپنے دل میں بڑی خجل ہوتی۔

امی جان نے میری بات مان لی۔ معلوم نہیں انہوں نے ابا جان سے کیا کہا کہ انہوں نے بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں مدرسے کیوں نہیں جاتی۔

میں بڑی دھان پان تھی۔ مگر مدرسہ جانے، پڑھنے اور وہاں کچھ جسمانی ورزش کرنے سے صحت اچھی رہتی تھی۔ اب مدرسہ جانا بند ہوا تو جسمانی ورزش بھی چھوٹ گئی۔ اس کا اثر میری صحت پر پڑا اور بیمار نظر آنے لگی۔ طبیعت کسلمند اور پژمردہ رہنے لگی۔

شروع شروع میں نے یہ سمجھا کہ مدرسہ کی سہیلیاں چھوٹ گئی ہیں ان کے جانے کا ملال ہے لیکن رفتہ رفتہ طبیعت زیادہ بدمزہ ہونے لگی۔ خوراک کم ہو گئی۔ بھوک میں بہت زیادہ کمی آ گئی۔ حیران تھی۔ الٰہی یہ کیا مصیبت پیش آئی۔

ابا جان۔ نے ایک روز مجھے غور سے دیکھا۔ وہ سیدھے امی جان کے پاس پہنچے میں بھی ان کے پیچھے ہی پہنچی اور دروازہ سے لگ کر سننے لگی۔ ابا جان نے امی جان

سے کہا۔ "تم نے زرقا کو دیکھا ہے؟"

وہ نہ معلوم کس خیال میں غرق تھیں۔ ایک دم ہول گئیں۔ پوچھنے لگیں۔ "کیا ہوا۔"

ابا جان مسکرائے۔ انہوں نے کہا۔ تم تو گھبرا گئیں۔

امی جان نے تیکھی چتون سے دیکھ کر کہا۔ خوب ہو تم بھی۔ میں سمجھی خدا نہ کرے اُسے کوئی حادثہ پیش آگیا۔"

ابا جان:۔ حادثہ کوئی نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں وہ دبلی ہوتی جارہی ہے۔ چہرہ ملایا ہوا رہتا ہے۔ اسے کوئی مرض تو نہیں لاحق ہوگیا ہے۔

امی:۔ کئی روز سے میں بھی یہ دیکھ رہی ہوں کہ وہ کھانا کچھ کم کھاتی ہے۔ عجب نہیں اسے کوئی مرض ہوگیا ہو۔

اس سے اگلے روز صبح کے وقت ابا جان ایک مشہور حکیم کو لے آئے۔ حکیم جی نے میری نبض دیکھی۔ دیر تک دیکھتے رہے۔ انہوں نے چند باتیں پوچھیں۔ میں نے جواب دیئے۔ حکیم جی نے ابا جان سے کہا۔ خدا کے فضل سے مرض کوئی نہیں ہے۔ یہ ورزش کم کرتی ہیں۔ وہ چھوٹ گئی ہے۔ انہیں صبح اور شام کسی سبزہ زار میں ٹہلایئے۔ چند ہی روز میں ٹھیک ہو جائیں گی۔

اسی روز سے ابا جان مجھے اپنی کار میں باغ میں لے جاتے اور میرے ساتھ ٹہلتے۔ ایک ہی ہفتہ میں طبیعت پہلے کی طرح بشاش ہوگئی۔ بھوک کھل گئی۔ کھانا خوب کھانے لگی۔ ابا جان کو اطمینان ہوگیا۔

کوئی دو مہینہ تک تو ابا جان برابر میرے ساتھ جاتے رہے اور کبھی بھائی جان مگر کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہو جاتا کہ کوئی بھی ساتھ نہ جاتا۔ میں تنہا جاتی۔ اور چہل قدمی کرکے چلی آتی۔

ایک روز میں تنہا گئی۔ اور چہل قدمی کرنے لگی۔ باغ میں جاکر میں تتلی بن جاتی تھی۔ کبھی اس کیاری میں کبھی اس کیاری میں۔ کبھی اس پھول کو چھوا۔ کبھی اس پھول کو توڑا۔

اس روز میں نے بہت سے پھول توڑے اور اپنے بالوں میں قرینے سے لگائے۔ اب میں گاڑی کی طرف چلنے ہی والی تھی کہ کسی نے ٹھنڈا سانس لیا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا

تو ایک جواں عیسائی سامنے کھڑا تھا۔ بہت غصہ آیا۔ میں نے للکارا" کیسے آئے تم اس باغ میں؟"

وہ چوروں کی طرح بھاگ گیا۔ میں چلی آئی۔ اور پھر بھائی جان کے ساتھ جانے لگی۔ مگر ایک روز پھر ایسا اتفاق ہوا کہ میں تنہا گئی۔ پھر مجھے وہ عیسائی وہاں ملا۔ میں نے اُسے ڈانٹ بتائی۔ اس نے کہا،" بے رحم سنگ دل، یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دُور ہی سے دیکھ لیا کروں۔
مجھے بڑا غصہ آیا۔ مگر وہ چلا گیا۔ اس بات کو آبا جان یا بھائی جان سے کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر اس روز بغیر آبا جان یا بھائی جان کو ساتھ لیے باغ میں نہ جاتی۔

انیسواں باب ۱۹

الیسٹر کا بھائی

زرقا نے بیان کیا۔

اب میں باغ میں تنہا جاتے ڈرنے لگی۔ اس لیے نہیں کہ میں ان علیسائیوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی جو کم بخت مجھے گھورنے آجاتے تھے بلکہ اپنی بدنامی کے خوف سے ڈر گئی تھی۔ اگر آبا جان اور بھائی جان کو میرے ساتھ چلنے کی فرصت نہ ہوتی تو میں بھی نہ جاتی۔

اب میں نے بھائی جان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مجھے تیر اندازی۔ شمشیر زنی اور خنجر چلانا سکھا دیں۔ وہ تیار ہو گئے اور روزانہ باغ میں میرے ساتھ جا کر مجھے مشق کرایا کرتے۔ اس میں جو محنت اور مشقت کرنی پڑتی۔ اس سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی۔ جسم مضبوط ہو گیا ــــ!

جمیلہ ہنسی۔ اُس نے کہا جسم مضبوط ہو گیا۔ کی بھی خوب ہی رہی۔ ارے پگلی۔ جسم مضبوط ہو کر سخت ہو جاتا ہے تو ٹھہری پھول، پھول میں بھی کہیں سختی آسکتی ہے؟"

زرقا:۔ خیر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ میں دیر تک خنجر کی مشق کرتی۔ تلوار چلاتی اور تیر پھینکتی کبھی تھکان نہ ہوتی۔ اب مجھے یہ حوصلہ ہو گیا کہ اگر خدا نخواستہ مجھے کوئی اٹھا لے جانے کی کوشش کرے تو میں اسے ڈھیر کر دوں۔

جمیلہ نے مسکرا کر کہا "کیوں نہیں، یہ نازک ہاتھ پاؤں اور یہ حوصلہ۔

زرقا:۔ کم بخت میں ہر وقت اپنے پاس خنجر رکھنے لگی تھی"۔

جمیلہ :۔ بیوقوف، کیا تو نہیں جانتی کہ پھول کے پاس کانٹے ہوتے ہیں مگر کیا گلچین کانٹوں سے ڈر جاتے ہیں۔ کانٹے موجود رہتے ہیں۔ اور وہ پھول توڑ لیتے ہیں۔

زرقا :۔ ہے نہ کوڑھ مغز، اتنا نہیں جانتی کہ پھول کانٹوں سے کام نہیں لے سکتے۔ نہ کانٹے اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس لیے پھول توڑنے والے کانٹوں سے نہیں ڈرتے پھول توڑ لیتے ہیں۔

جمیلہ :۔ اور تیرے فدائی تیرے خنجر سے ڈر جاتے۔ پاگل تو اگر کسی کی دست درازی کے جواب میں خنجر نکال لیتی یا تلوار کھینچنا چاہتی تو وہ ہنس کر کہہ دیتا ؎

اُٹھیں گے نہ خنجر، نہ تلوار ان سے　　　　یہ بازو، مرے آزمائے ہوئے ہیں

زرقا :۔ اس کا بھی موقع آ گیا تھا۔ تو سنتی رہ۔"

جمیلہ : اچھا سنا۔

زرقا نے بیان کیا۔

ایک روز پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ابا جان اور بھائی جان میں سے کوئی بھی میرے ساتھ نہ جا سکے۔ میں تنہا چلی گئی۔ میرا خیال ہے لوگ روزانہ ہمارے باغ میں جاتے تھے۔ یا تو باغ اچھا اور فرحت بخش تھا۔ اس لیے اس کی سیر کرنے جاتے تھے یا مجھے دیکھنے جاتے ہوں"

جمیلہ :۔ یہ پچھلی بات صحیح ہے۔"

زرقا :۔ خیر کوئی بات ہو۔ ایک روز ایسا ہوا کہ میں صبح کی نماز پڑھ کر گاڑی میں سوار ہوئی اور باغ میں پہنچ گئی۔

سورج نکل رہا تھا اور اس کی سنہری شعاعیں سبز درختوں کے پتوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ میں سبزہ زار پر ننگے پیر ٹہلنے لگی۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ صبح کے وقت ٹھنڈا سبزہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا۔ تلووں سے لیکر دماغ تک ٹھنڈک پہنچ جاتی۔ بڑی فرحت ہوتی ـــــ

ابھی میں ٹہل ہی رہی تھی کہ ایک یہودی نوجوان آ نکلا۔ اس نے کہا "دوستو میں نے دنیا میں بہشت دیکھی ہے اور اس بہشت میں ایک حور کو مصروف خرام دیکھا ہے۔"

اُس نے اس مطلب کا ایک شعر پڑھا تھا۔ وہ شعر تو مجھے یاد نہیں رہا مطلب یاد رہ گیا تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا نکل اے یہودی۔ کہیں تیری ماں تجھ پر بین نہ کرتی پھرے۔

اس کی ڈھٹائی دیکھو اُس نے کہا۔ مجھے رونے والی میری ماں نہیں ہے۔ صرف ایک بہن ہے۔ الیسٹر تمہاری طرح نازک اور حسین ہے

الیسٹر کا نام لیتے ہی مجھے وہ واقعہ یاد آگیا۔ جب درگاہ عالیہ میں ایک روز میں گئی تھی اور مجھے میری سہیلی کھینچ کر درگاہ سے باہر لے گئی تھیں۔ میری سہیلیاں مجھ سے بچھڑ گئیں تھیں۔ اور ایک یہودی لڑکی میرا ہاتھ پکڑ کر زیتون کے درختوں کی طرف لے گئی تھی۔ کسی درخت سے ایک یہودی نکلا تھا۔ اور اُس نے اسی یہودی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ الیسٹر آگئیں تم "

کمبخت الیسٹر نے اسی یہودی کی طرف مجھے دھکیل کر کہا تھا۔ لو سنبھالو اپنی زرقا کو "
الیسٹر واقعی حسین اور نازنین تھی۔ مگر وہ مجھ سے کافی بڑی اور بہت چالاک تھی۔ میں نے کہا۔ تم نے ہی شاید الیسٹر کو درگاہ میں مجھے لانے کے لیے بھیجا تھا "

یہودی نے ۔ ہاں میں نے ہی بھیجا تھا۔ میں تمہیں ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ اس وقت سے جب تم الھڑپنے کی شوخی سے فتنہ قیامت کو بیدار کرتی ہوئی مدرسہ جایا آیا کرتی تھیں۔ میں اسی وقت سے تم پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ تمہارے سن کے ساتھ ساتھ میری محبت بھی پروان چڑھنے لگی۔ مگر تم نے یہ ستم کیا کہ گاڑی میں سوار ہو کر آنے لگیں۔ ابھی چند روز ہوئے الیسٹر نے مجھے بتایا کہ تم روزانہ سیر کرنے اس باغ میں آیا کرتی ہو۔ میں اسی روز سے یہاں آنے لگا۔ مگر تمہارے ساتھ تمہارے بھائی یا والد آتے تھے۔ آج اتفاق سے تم تنہا آئی ہو ــــــ آج میں داستانِ دل تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گا ــ

میں نے کہا۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ ــــ

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ تمہارا حکم سر آنکھوں پر لیکن پہلے میری داستان سُن لو "

مجھے طرارہ آگیا۔ میں نے کہا۔ خاموش۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی "

یہودی۔ "مگر میں سنانا چاہتا ہوں "

میں :۔ "کیا زبردستی "

یہودی :۔ "یہ مجال نہیں۔ تم نہیں جانتی ہو زرفا کہ تم کیسے میرے دل میں داخل ہوئیں۔ ایک روز میں جامع قیردوئین کے قریب سے گذر رہا تھا۔ تم وہاں سے نکلیں ایک اور لڑکی تمہارے ساتھ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے چاند نکل آیا۔ میں حیران ہوکر تمہیں دیکھنے لگا۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں بھولنے کی کوشش کی۔ مگر نہ بھول سکا۔ اب میرا یہ دردہو گیا ہے کہ روزانہ جامع قردوئین کے پاس کھڑا ہوا اور تمہیں آتے جاتے دیکھا کرتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ صرف میں ہی تمہارے فدائیوں میں نہیں ہوں۔ اور بھی کئی یہودی اور عیسائی ہیں۔ میں نے تمہارا ذکر اپنی بہن ایستر سے کیا۔ اور ایک روز اسے اپنے ساتھ لاکر تمہیں دکھا بھی دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے ایسی حسین اور پیاری لڑکی آج تک نہیں دیکھی ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ میں تمہارا خیال چھوڑ دوں۔ کیونکہ تم عرب اور مسلمان ہو۔ اگر کسی عرب کو اس بات کی سن گن ہوگئی تو تمہاری زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ بات ٹھیک تھی مگر میں محبت میں وہیں پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے واپس آنا ناممکن تھا۔ مجھ پر اس کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے جان پر کھیل کر تمہیں اڑانے کی کوشش کی۔ ایستر تمہیں درگاہ کے باہر لائی۔ لیکن تمہاری آواز سن کر چند مسلمان دوڑ آئے۔ بڑی مشکل سے میں ان سے بچ پایا مالدار یہودی ہوں۔ خاندانی ہوں۔ اگر تم کہو گی تو میں اپنا مذہب بھی چھوڑ دوں گا مسلمان ہو جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میری ہو جاؤ۔ ورنہ میری جان تم پر سے تصدق ہو جائے گی۔ اور ماں سے "

میں نے اس کی بکواس بہت کچھ سن لی تھی۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ بہت بک لیا۔ تم نے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً چلے جاؤ۔

اس نے بے حیا بن کر کہا "یہ تو میری بات کا جواب نہیں ہے۔

میں نے غصہ میں آکر خنجر کھینچ لیا۔ وہ ذرا بھی نہیں ڈرا۔ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "یہ سینہ حاضر ہے خنجر چلاؤ۔ "

دل میں آیا کہ مار دوں خنجر۔ مگر ہاتھ نہ اُٹھ سکا۔ صرف یہ کہا۔ جاؤ اسوقت میں تم پر رحم کرتی ہوں۔

اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے ڈپٹا۔ شرافت سے کام لو۔"

اس نے کہا۔ اب میں اس وقت تک انتظار کروں گا۔ جب تک خدا تمہارے دل میں رحم و کرم کا جذبہ پیدا کرے۔

وہ چلا گیا۔ مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ اس بات پر کہ میں کیوں جھجک گئی میں نے خنجر کیوں نہ مار دیا۔ مگر اب اُس کا خیال کرنا بے سود تھا۔

میں تھوڑی دیر اور باغ میں گھومتی رہی اور جب سیر سے طبیعت سیر ہو گئی تو گاڑی میں سوار ہو کر واپس چلی آئی۔

بیسواں باب ۲۰

مغرب اقصیٰ کی حور

جمیلہ نے کہا۔ تو بھی سوچتی ہوگی۔ حسین ہو کر کس آفت میں پھنس گئی۔
اس نے مسکرا کر اس مضمون کا عربی شعر پڑھا ؎

یہ ان کو ہے اپنے حسن آفریں سے گلہ
غضب میں ڈال دیا لاجواب کر کے مجھے

زرقا:۔ جب میرے حسن کی تعریف ہوتی تھی۔ میں خوش ہو جاتی تھی اور جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ میں ایک بات سوچا کرتی تھی کہ مسلمانوں نے بھی مجھے دیکھا ہے۔ عیسائیوں نے بھی اور یہودیوں نے بھی۔ لیکن کسی مسلمان نے کبھی کوئی نامناسب حرکت میرے ساتھ نہیں کی۔ ایک دفعہ دیکھ کر۔ دوبارہ دیکھا تک بھی نہیں۔ لیکن عیسائی اور یہودی وہ پیچھے ہی پڑ گئے۔ ایسا کیوں ہے؟"

جمیلہ:۔ جو شخص پکا مسلمان ہے۔ اسلامی شرع پر عمل کرتا ہے۔ خدا سے ڈرتا ہے وہ خدا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ نامحرم لڑکیوں اور عورتوں کو چاہے، وہ کسی مذہب کی ہوں دیکھنا گناہ سمجھتا ہے۔ دوسرے مذہب والے اپنے مذہب کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔

زرقا:۔ میری سمجھ میں بھی یہی بات آئی تھی۔ اس کے بعد میں یہ سوچنے لگی کہ جن قوموں میں پردہ نہیں ہے ان کی حسین لڑکیوں کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ان کے پیچھے

تو عیاش اور بے حیا لڑکوں کی پلٹن کی پلٹن بھرتی ہو گی۔

جمیلہ:۔ ہر قوم میں بُرے اور بھلے سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بُروں کی اصلاح بھلے لڑکے کرتے رہتے ہیں اور بھلوں سے بُرے ڈرا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماج کا خوف ہوتا ہے۔ اس لیے برائیاں نہیں پھیلنے پائیں۔ اور حسین لڑکیوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

زرقا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر جو لوگ دوسری قوم کی لڑکیوں کو تنگ کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی لڑکیوں کو کیوں تنگ نہ کرتے ہوں گے۔

جمیلہ۔ وہ اپنی قوم کی لڑکیوں سے ڈرتے ہوں گے۔ میں ایسی کئی عیسائی لڑکیوں سے واقف ہوں۔ جنہوں نے اپنی قوم کے نوجوانوں کو ایسی ڈانٹ بتائی کہ انہیں ان لڑکیوں کو دوبارہ چھیڑنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

زرقا:۔ ضرور ایسا ہو گا۔ ورنہ سماجی نظام کیسے قائم رہے؟

جمیلہ:۔ میں تیری وہ داستان سننا چاہتی ہوں جس نے تجھے مشہور کر دیا اور تو ہے کہ اور اور قصے سنا رہی ہے؟

زرقا:۔ اب وہ داستان شروع ہونے والی ہے؟

جمیلہ:۔ تو کر شروع؟

زرقا نے بیان کیا۔

"دن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ میری عمر چودہ سال کی ہو گئی۔ لڑکپن رخصت ہونے لگا اور شباب کا آغاز ہو گیا۔ میرے اندر کئی تبدیلیاں ہو گئیں۔ شرارت کی جگہ سنجیدگی نے اور شوخی کی جگہ حیا نے لے لی۔ پہلے میں اچھلتی کودتی پھرا کرتی تھی کہ اب قدم قدم چلتی تھی۔ گویا بڑی نزاکت آ گئی تھی۔ اب میں جب آئینہ دیکھتی تو خود حیران رہ جاتی تھی جی چاہتا تھا اپنی صورت دیکھے جاؤں۔

ایک روز میں نے سنا کہ فاس میں نمائش ہونے والی ہے۔ شاید ایک مہینے تک رہے گی۔ تمام مغرب اقصیٰ افریقہ، مصر اور اندلس سے سوداگر آئیں گے۔ قیمتی اور عجیب عجیب چیزیں ساتھ لائیں گے۔ ملک ملک کے لوگ نمائش دیکھنے آئیں گے خوب رونق ہو گی۔

اس نمائش کا حال سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہمارے شہر فاس میں ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ درگاہ عالیہ کے قریب آٹھ یا دس روز رہتا تھا۔ تمام شہر میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ اور میلہ کی رونق کا تو کچھ ٹھیک ہی نہیں رہتا تھا۔ دُور دُور سے سوداگر آتے تھے۔ تمام بربری اور عرب قبیلے اکٹھا ہوتے تھے۔ پہلوانی اور جنگی فنون کے کرتب دکھاتے تھے۔ گھوڑ دوڑ ہوتی تھی۔ بچوں کی دوڑ اور کود ہوتی تھی۔ اول رہنے والوں کو بڑے بڑے انعام ملتے تھے۔

جی چاہتا تھا کہ یہ میلہ کچھ زیادہ دن رہا کرے مگر میلہ کے مہتمم آٹھ یا دس دن میں ختم کر دیتے تھے۔ یہ دن ہوا کی طرح گذر جاتے تھے۔ میلہ ختم ہونے پر بڑا افسوس ہوتا تھا۔

یہ نمائش پورے ایک مہینہ کے لیے ہونے والی تھی۔ میں نمائش کے دن گننے لگی۔ بھائی جان مجھے روزانہ بتاتے رہتے تھے کہ دوکانیں بننے لگی ہیں۔ صفائی ہونے لگی ہے۔ باغات کی آراستگی شروع کر دی گئی ہے۔ خود ہمارے باغ بھی صاف اور آراستہ ہونے لگے ہیں۔

جوں جوں نمائش کے دن قریب آتے جاتے تھے۔ میری خوشی بڑھتی جاتی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ جلدی سے دن گذر جائیں اور نمائش کی تاریخیں آجائیں۔ آخر بھائیجان نے بتایا کہ قبیلوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ اور سوداگر بھی آنے لگے ہیں۔ قافلوں پر قافلے چلے آرہے ہیں۔

ایک روز معلوم ہوا کہ ابن شمعون بھی آیا ہے تو اس عرصہ میں تازہ چلی گئی تھی۔ لیکن نمائش دیکھنے تو بھی آگئی کئی برس کے بعد میں اور تو ملی تھیں۔ بڑی خوشی ہوئی تھیں۔

جمیلہ۔ بھئی سچ پوچھتی ہے۔ میں تو تجھے اس وقت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی تو تو حسن مجسم۔ پیکر نور اور سرو ناز بن گئی تھی۔ میں خود تجھ پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی تھی۔ خدا کی قسم تیرے پسینہ میں ایسی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی کہ کسی عطر میں ایسی خوشبو نہیں تھی۔

زرقا۔ اور تو کیا بن گئی تھی۔ تو بھی تو پری پیکر ہو گئی تھی۔ اب میں آئینہ میں دیکھ

تو کیا بن گئی ہے۔ بالکل گلاب کا پھول۔

جمیلہ:۔ خیر میں تو جیسی ہوں، ہوں۔ البتہ تو مغرب اقصیٰ کی حور ہو گئی ہے۔ تیرا جلوہ دیکھ کر کون اپنے حواس میں رہ سکتا ہے۔

زرقا:۔ تو تھوڑا بہت سچ کہہ رہی ہے۔

جمیلہ۔ اچھا سنا۔

زرقا:۔ اب تو ہی بیچ میں باتیں شروع کر دیتی ہے۔ سناؤں کیسے۔

جمیلہ:۔ اگر باتیں نہ کروں تو پیٹ میں درد نہ ہونے لگے مگر کہہ اب تو میں حتی الامکان نہ بولوں گی۔

زرقا نے پھر بیان کیا۔

"تو بھی نمائش ہی دیکھنے آئی تھی اور جب میں نے تجھے بتایا کہ ہمارے باغ آراستہ کیے گئے ہیں تو تو نے انہیں دیکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ ایک روز شام کے وقت تو اور میں دونوں چلیں۔ باغ میں پہنچیں۔ اور اس قدر گھومیں کہ میں تھک گئی۔ نہ معلوم اس روز تیرے پیروں میں کہاں سے طاقت آ گئی تھی تو نہیں تھکی۔ میں حوض کے کنارہ پر بیٹھ گئی۔ تو پھولوں کے تختوں میں جا گھسی اور کافی پھول توڑ لائی۔ تو نے ان پھولوں کے زیورات بنا کے مجھے پہنائے۔ میں نے حوض کے پانی میں جھانک کر دیکھا پھولوں کی ملکہ معلوم ہونے لگی۔ تو مجھے تکتی رہ گئی۔

جمیلہ نے کہا۔ میری نگاہوں میں تیری وہ تصویر اب بھی پھر رہی ہے۔ خدا کی قسم تجھ پر ایسا روپ آیا تھا کہ تجھ پر سے قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔

زرقا:۔ اور میں تیری آنکھوں سے سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس روز مجھے خود اپنی صورت بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

اُس نے داستان بیان کرتے ہوئے کہا۔

"تو کچھ دیر تو کھڑے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر خدا جانے تیرے دل میں کیا بات آئی کہ تو چل دی۔ میں روکتی بھی رہی مگر تو نہ رکی۔ میں پھر حوض کے کنارہ پر بیٹھ گئی۔ ابھی مجھے بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ آواز آئی "اے حورِ مراکش" یہ خادم سلام عرض کرتا ہے"

پلٹ کر دیکھتی ہوں تو ابن شمعون سامنے کھڑا ہے۔ میں بے نقاب تھی۔ نقاب ساتھ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ دوپٹہ اتنا باریک تھا کہ چہرہ نہیں چھپ سکتا۔ ہک دہک رہ گئی۔

وہ بڑھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور مجھے کچھ الیسی نظروں سے گھورنے لگا۔ کہ میں شرم سے کرا گئی۔

اس نے کہا۔ تم تو اس سے بھی زیادہ حسین اور ماہرو ہوگئی ہو۔ جتنا میں نے خیال کیا تھا۔ حقیقت میں تمہاری جھلک دیکھ کر کوئی بھی اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا۔ مہربانی کیجئے ـــــ"

اُس نے کہا۔ تم خفا ہوگئیں۔ خدائے موسیٰ کے لیے خفا نہ ہو جانا ورنہ میری زندگی دشوار ہو جائے گی۔ میں کیا جواب دیتی اسے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر میں نے اسے ڈپٹ دیا یا ترشروئی سے پیش آئی تو کہیں وہ خفا نہ ہو جائیں۔ جانتی تھی کہ میرے باپ اس کے مقروض ہیں۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی خلافِ انسانیت باتوں اور حرکتوں کو گوارا کر لیتی۔ چنانچہ میں نے کہا۔" معاف کیجئے میں الیسی باتیں سننا گوارا نہیں کر سکتی۔"

یہ کہتے ہی میں کھڑی ہوگئی۔ اُس نے کہا۔ اے گلستان جہاں کے بینظیر پھول۔ میں ضرور تجھے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں وہاں سے گاڑی کی طرف بڑھی تھوڑی ہی دُور چلی تھی کہ تو نے آواز دی۔ میں کھڑی ہوگئی۔ تو نے پاس آ کر کہا۔ ابھی سے چلی۔

میں کیسے کہہ دیتی کہ ابن شمعون آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میری طبیعت خراب ہے تو ہول سی گئی۔ اور میرے ساتھ چلی آئی۔

اکیسواں باب

ابن شمعون کی شرارت

زرقا نے بیان کیا۔

اس واقعہ کو کئی روز گذر گئے۔ کوئی خاص بات اس عرصہ میں نہیں ہوئی۔ نمائش کی تاریخیں قریب آرہی تھیں۔ نہ معلوم کیوں۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ بھائی جان روزانہ بتاتے رہتے تھے کہ اب فلاں جگہ سے سوداگر آئے ہیں۔ اب فلاں جگہ سے معزز لوگ آئے ہیں۔ نمائش کے قریب خیموں کا شہر آباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ایک روز انہوں نے بتایا کہ تازا کا سب سے بڑا دولت مند آنے والا ہے۔ وہ ایسا دولت مند ہے کہ مغرب اقصیٰ کا بڑے سے بڑا رئیس بھی اس کا مقروض ہے۔ اراکین سلطنت۔ وزرا، امراء اور شہر فاس کے تمام شرفا حتیٰ کہ سلطان مغرب بھی اس کے قرضدار ہیں۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں اس کی تجارتی کوٹھیاں ہیں۔ اندلس۔ افریقہ اور مصر میں اس کی تجارت ہوتی ہے۔ دولت اس کی غلام ہے۔ تمام رئیس امیر حکام وزیر یہانتک کہ سلطان مغرب بھی اس کا بڑا ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس سے دبتے اور لچتے ہیں اگرچہ مراکش میں حکومت سلطان مغرب کی ہے مگر حکم تازا کے دولت مند یہودی کا چلتا ہے۔" مجھے یہ باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ مراکو کے سلطان کو سلطان مغرب کہتے تھے۔ شاید اس مناسبت سے کہ وہ مغرب اقصیٰ کے سلطان تھے۔

لیکن میں نے اس دولت مند یہودی کا حال اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ تعجب اس پر ہوا کہ مغرب اقصیٰ کے تمام دولت مند۔ سارے رئیس۔ سب شریف، وزیر احکام اور سلطان تک اس کے مقروض ہیں۔ اس سے دبتے اور اس کا لحاظ کرتے ہیں۔ حکومت سلطان کی ہے۔ لیکن حکم مالدار یہودی کا چلتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اس یہودی کا نام کیا ہے ؟"

بھائی جان نے بتایا۔ اس کا نام ابنِ مشعل ہے۔

یہ نام میں نے پہلے بھی سنا تھا مگر صرف اتنا کہ شہر تازا میں ایک دولت مند یہودی ابنِ مشعل رہتا ہے۔ یہ نہیں سنا تھا کہ اس کا اتنا دبدبہ ہے اس کی اتنی عزت و عظمت ہے۔ اس سے سلطان تک دبتے ہیں اور حکومت میں اسکا ہاتھ ہے

بھائی جان نے یہ بھی بتایا کہ ابنِ مشعل حکومت کا مہمان ہوگا۔ اس کی رہائش کیلئے ایک بڑا کیمپ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس کی آراستگی شاہی سامان سے کی جا رہی ہے۔ تمام احکام اور وزیر رات دن کیمپ کی آرائش میں لگے رہتے ہیں اور کبھی کبھی سلطان بھی اس کیمپ کو دیکھنے آتے ہیں۔

یہ باتیں سُن سُن کر میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ سوچتی تھی۔ الٰہی کیسا بڑا آدمی ہے۔ وہ جس کے کیمپ کی آرائش میں امیر وزیر سلطان تک حصّہ لے رہے ہیں۔

بھائی جان نے یہ بھی بتایا کہ اس کا کیمپ اتنا بڑا تیار کیا گیا ہے جس میں ہزاروں آدمی آسکیں گے۔ میں نے پوچھا۔ آخر وہ کتنے آدمی ساتھ لا دے گا۔"

بھائی جان نے جواب دیا۔ پانچسو سے زیادہ تو اس کے ساتھ غلام آدیں گے۔ دوسو کنیزیں ہونگی۔ خادم ہوں گے۔ اور پانچسو سواروں کا دستہ ہوگا۔ ممکن ہے اُسکے دوست اور دوستوں کے غلام اور کنیزیں، بیوی اور بچے بھی ساتھ ہوں۔"

میں۔ تو یہ کہو کہ شاہانہ کروفر کے ساتھ آئے گا۔

بھائی جان۔ ہاں معلوم ہے۔ دو ڈھائی ہزار تو اُس کے غلام ہیں۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب کنیزیں ہیں۔ ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیدل ہیں۔ اُس کے غلام عام رئیسوں سے اچھا لباس پہنتے ہیں۔

میں یہ سمجھ گئی کہ وہ اس زمانہ کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ اس کے پاس بیشمار

دولت ہے۔ مگر میں نے دل ہی میں کہا۔ ہوگا۔ مجھے اس سے کیا۔

چند روز کے بعد بھائی جان نے بتایا "ابن مشعل کے غلاموں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ غلام کیا ہیں۔ رئیس معلوم ہوتے ہیں جو سامان وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں وہ بہت ہی بیش قیمت ہے۔ ایسے ایسے خوش رنگ قالین ہیں کہ دیکھا ہی کریں۔ اور اتنے دبیز کہ پیران میں دھنس جائیں۔ خیموں کے پردے بہت ہی خوبصورت اور بڑھیا ریشم کے ہیں۔ سائبان زردوزی کے اور نہایت ہی قیمتی ہیں۔ سچ پوچھو تو سلطان کے پاس ایک بھی ایسا سائبان نہیں ہے۔

غرض انہوں نے ابن مشعل کے غلاموں کی اور سامان کی بڑی ہی تعریف کی"۔

جمیلہ نے کہا "خدا کا شکر ہے اب تو نے اصل قصہ شروع کیا۔

زرقا: "ہاں اصل قصہ اب شروع ہوتا ہے۔ کاش ابن مشعل نہ آتا! ابا جان فضول خرچ نہ ہوتے حالانکہ وہ فضول خرچ نہیں تھے۔ میں نے فضول خرچ اسلئے کہا کہ انہوں نے چادر دیکھ کر پیر نہ پھیلائے۔ آمدنی کے موافق خرچ نہیں کیا۔ خرچ بڑھا لیا۔ اور اس خرچ کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

کچھ وقفہ کے بعد زرقا نے بیان کیا۔

"ایک روز میں نے دیکھا کہ ابا جان سخت پریشانی کے عالم میں گھر میں داخل ہوئے مجھے ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ان کی کیفیت دیکھ کر میرا دل سنسنانے لگا۔ جی چاہا بڑھ کر ان کی پریشانی کی وجہ پوچھوں۔ لیکن جرأت نہ ہوئی۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں ادھر ادھر دو تین کمروں میں گھوم کر ابا جان کے کمرہ میں جا پہنچی۔ میں نے دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ اس روز میں نے انہیں صبح کا سلام نہیں کیا تھا۔ میرا ورد تھا کہ صبح کی نماز پڑھ کر روزانہ ابا جان اور امی جان کو سلام کیا کرتی تھی۔

میں نے ابا جان کو سلام کیا۔ انہوں نے حسب دستور مجھے دُعا دی اور میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں گہرے غم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ بہت اداس تھا۔ بلیساختہ میری زبان سے نکل گیا "ابا جان کیا بات ہے؟

اور ان کی آغوش میں جا پڑی۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نرم لہجہ میں کہا۔ کوئی بات نہیں ہے بیٹی "

میں :۔ ابا جان آپ غمگین اور پریشان کیوں ہیں "

میں نے آہستہ آہستہ اُٹھ کر ان کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اب اُن کے چہرہ سے پریشانی کے آثار ظاہر نہیں تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں میری نگاہوں نے غلطی تو نہیں کی۔ میں نے کہا۔

مجھے ایسا ہی خیال ہوا تھا"

وہ مسکرائے۔ اور انہوں نے کہا۔ تجھے وہم ہوا ہو گا "

اس وقت امی جان آ گئیں۔ انہوں نے کہا۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں لاڈلی سے "

ابا جان نے ہنس کر کہا۔ تمہیں کیا ہو رہی ہیں کچھ باتیں "

امی جان :۔ میں بتا دوں۔ نمائش کی باتیں ہو رہی ہوں گی"

ابا جان :۔ حقیقت یہ ہے کہ نمائش قابلِ دید ہو گی "

امی جان :۔ خوب گھماتے پھرنا زرقا کو "

اباجان :۔ یہ بھی چلے گی اور تم بھی چلو گی "

میں کمرہ سے باہر نکل آئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے کمرہ میں چلی جاؤں۔ لیکن جیسے کسی نے قدم پکڑ لیے۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس لیے نہیں کہ باتیں سنوں۔ بلکہ چلا ہی نہ گیا۔ امی جان نے کہا۔ ابن شمعون سے باتیں ہوئیں "

ابا جان نے کہا۔ ہاں ہوئیں۔ ہم اسے بڑا نیک اور خدا ترس انسان سمجھتے تھے۔ مگر وہ تو یہودی ہی نکلا۔

اب میرے کان کھڑے ہوئے اور میں سانس روک کر کھڑی ہو گئی اور باتیں سننے لگیں۔ امی جان نے کہا۔ یہودی تو یہودی ہی ہوتے ہیں۔ پیسہ کے غلام۔ مگر باتیں کیا ہوئیں۔

ابا جان۔ ہم نے اس سے کہا۔ ہم سر دست تمہارا قرضہ ادا نہیں کر سکتے۔ البتہ سال بھر کے اندر اندر ضرور ادا کر دیں گے۔ رہا سود وہ ہم نمائش کے بعد دیدیں گے۔ خیال تھا وہ اس بات کو مان لے گا۔ کیونکہ قرضہ اس نے اپنی خوشی سے دیا تھا۔ اور

ہم جتنا چاہتے تھے۔ اس نے اصرار کر کے اس سے زیادہ دیا تھا۔ سود کی شرح بھی بہت کم مقرر کی تھی۔ اور ہمیشہ ہمارے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ مگر آج اس نے طوطے کی طرح بالکل آنکھیں بدل لیں۔ کہنے لگا" مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے۔ فوراً ادا ہونا چاہیئے"۔ ہم نے اسے باغات دینے چاہے۔ اُس نے اُن کے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ حیران ہیں کہ وہ ایک دم کیوں بدل گیا۔

میں سمجھ گئی ابن شمعون نے کیوں یہ شرارت کی ہے۔ اور اب یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ اس نے ابا جان کو قرضہ کیوں دیا تھا۔ وجہ فساد یہ تھی۔ مگر میں اس کے متعلق کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

امی جان نے کہا" پھر اب کیا ہو گا۔؟"

ابا جان۔ کل ہم وزیر اعظم سے ملیں گے۔ ان کے سامنے تمام واقعات رکھیں گے شاید وہ کوئی حل نکال دیں"۔

امی جان:۔ لیکن ابن شمعون بدل کیسے گیا"۔

ابا جان۔ ہمیں بھی حیرت ہے"۔

میں نے امی جان کے قدموں کی چاپ سنی۔ خیال ہوا۔ وہ آنے والی ہیں۔ میں چھلانگ لگا کر دوسرے کمرہ میں ہو رہی۔

بائیسواں باب

ایک اور یہودی

زرقا نے بیان کیا۔

"اس کے دوسرے دن جب میں اٹھی تو طبیعت پژمردہ تھی۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی۔ اور گاڑی میں سوار ہو کر باغ میں چلی گئی۔

صبح کا سہانا سماں تھا۔ شبنم کے ننھے ننھے قطرے سبزہ پر اور پھولوں کی ڈالیوں پر جھول رہے تھے۔ کلیاں اور پھول شبنم سے منہ دھو کر نکھر گئے تھے۔ فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے تمام باغ کو طبلہ عطار بنا دیا تھا۔

باغ میں پہنچتے ہی طبیعت بشاش ہو گئی۔ میں روشوں پر سبزہ پر اور پھولوں کے تختوں میں خوب اچھلتی اور سیر کرتی پھری۔ پھر میں نے پھول توڑے اور فوارہ کے حوض پر بیٹھ کر پہنچیاں ہار گلوبند اور بازوبند بنائے۔ ایک تاج بنایا۔ سب زیور پہن کر تاج سر پر رکھا۔ اب جو پانی میں جھانک کر دیکھا تو پھولوں کے زیورات اور تاج نے میرے چہرے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ میرے سر پر زریں تاج سے بہتر پھولوں کا تاج سج رہا تھا۔ اور میں پریوں کے ملک کی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔

فوارہ کے قریب ایک پھولوں کا کنج تھا میں اس کنج میں جا کھڑی ہوئی۔ اس وقت میں پھولوں کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں میرے چہرہ کو چوم رہی تھیں۔ میرے دل میں خیال آیا۔ کاش اس وقت کوئی مصور یہاں ہوتا اور وہ

میری تصویر کھینچ کر مجھے دکھاتا۔

میں جانتی تھی کہ تصویر کھینچوانا اور تصویر رکھنا گناہ ہے۔ لیکن یہ خیال میرے دل میں ضرور پیدا ہوا کہ میری تصویر کھینچی بلاوجہ میں دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ اور فوارہ کو ٹکٹکی لگاتے دیکھتی رہی۔ نہ معلوم میں کتنی دیر کھڑی رہی اور کب تک کھڑی رہتی کہ باتوں کی آوازیں آئیں۔ میں نے چونک کر دیکھا تو دو آدمی سامنے کھڑے تھے۔ دونوں یہودی تھے۔ ان میں سے ایک یہودی کا لباس نہایت فاخرہ تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی داڑھی میں کوئی کوئی بال سفید تھا۔ دوسرا آدمی ذرا زیادہ عمر کا تھا۔ اس کی داڑھی کھچڑی تھی۔ وہ ایک کاغذ ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے پوچھا۔ خاکہ تیار کر لیا۔

دوسرے آدمی نے جواب دیا "جی ہاں"۔

پہلا۔ ٹھیک ہو گیا؟

دوسرا۔ جی ہاں ٹھیک ہو گیا"

پہلا۔ اچھا تم جاؤ۔ اور اسے تیار کرو۔ آج ہی شام کے وقت ہمیں دکھانا"

دوسرا۔ بہت اچھا۔

اسی نے پہلے یہودی کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ اور کاغذ لپیٹ کر چلا گیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کیسا خاکہ تھا۔ کیا چیز تیار کرے گا۔ یہ بھی نہ معلوم ہو سکا۔ وہ دونوں کون ہیں۔

بعض اوقات انسان کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ کیا کر رہا ہے اور کس حالت میں ہے۔ یہی حالت میری ہوئی میں بے نقاب کھڑی تھی۔ پھولوں کے زیورات پہنے اور تاج اوڑھے تھی۔ لیکن مجھے بالکل یہ خیال نہیں ہوا کہ وہ بے پردہ ہے اور ایک یہودی میری طرف بڑھ رہا ہے۔

معزز یہودی میرے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا۔ اے مغربِ اقصیٰ کے چاند تو نے میرے دل کو مسخر کر دیا ہے۔

میں ایک دم چونکی اور کچھ شرما گئی۔ اُس نے کہا۔ خدائے موسیٰ کی قسم تم جیسی حسینہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ یا تو تم پرستان سے آئی ہو۔ یا خدا نے دنیا میں

بہشت کی حور بھیج دی ہے ۔"

ان یہودیوں اور عیسائیوں سے میں اپنے حسن کی تعریفیں سن سن کر تنگ آگئی تھی۔ مجھے غصہ آجاتا تھا۔ میں نے کچھ ترشروئی سے کہا "تم کون ہو۔؟"

اس نے جواب دیا۔ تم نے میرے لباس سے پہچان لیا ہوگا کہ میں یہودی ہوں۔"

میں۔ اس باغ میں کیسے آئے۔

یہودی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ باغ حسن کی ملکہ کا ہے اور ملکہ کی اجازت کے بغیر اس باغ میں آنا سزا کا ستوجب ہے۔"

میں۔ دیکھئے آپ سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔"

یہودی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ کیا مہربانی کر کے اپنا نام بتاؤ گی؟

میں اس سے جلدی اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ میرا نام زرقا ہے۔"

یہودی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "زرقا ۔۔ یہ نام میں نے سنا ہے ۔۔۔ اوہ یاد آگیا۔ مجھے میرے ایک بھائی نے تمہاری تعریف کی تھی۔ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟"

میں۔ شیخ صالح۔"

اس نے کئی دفعہ "شیخ صالح" "شیخ صالح" کہا۔ گویا وہ اس نام کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنی دل کی دنیا کو برباد کر کے ایسی روشنی دیکھ کر جس نے مجھے چکا چوند کر دیا ہے۔ تم مجھے کیوں یاد رکھو گی۔ لیکن میں تمہیں نہ بھول سکوں گا۔ ایک بات میں ضرور کہے دیتا ہوں۔ میں ایک رند شراب تھا۔ مگر آج سے نیک بننے کی کوشش کروں گا۔ تمہاری پیاری اور معصوم صورت نے میرے دل پر یہ اثر کیا ہے۔

وہ چلا۔ اس نے کئی ہار موتیوں اور جواہرات کے پہن رکھے تھے وہ گلے کو کھجاتا ہوا جا رہا تھا۔ اتفاق سے اس کا ایک ہار گر پڑا۔ اسے خبر نہیں ہوئی۔ میں کنج میں سے نکل آئی تھی۔ اور اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ میں نے آواز دے کر کہا۔ "دیکھئے۔ آپ کا قیمتی ہار گر پڑا ہے۔

اس نے پہلے ہار کی طرف پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ یہ ہار تمہیں مبارک۔ میرے پاس ایسے بیشمار ہار ہیں۔

وہ چلا گیا۔ میں نے ہار اٹھایا۔ دیکھا۔ نہایت قیمتی موتیوں کا ہار تھا۔ سوچنے لگی۔ اسے

ڈال دوں یا پہلوں۔ میں نے ہار ڈال دیا۔ اور چل پڑی۔ یہودی، نارنگی کے درختوں کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ وہ بڑھ کر آگے آیا۔ اُس نے کہا۔ زرا ٹھہرو۔"

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں دنیا کی دولت سے محبت نہیں ہے۔ مگر میری ایک درخواست منظور کر لو۔ میں نے کہا۔" کیا؟"

اُس نے ہار اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوتے کہا۔ یہ تحفہ میری طرف سے قبول کرو۔"

میں۔ معاف کیجئے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔

یہودی۔ تب میں اسے یہیں ڈالے جاتا ہوں۔ کوئی اور اٹھالے گا۔ میں یہ بتادوں کہ یہ ہار اگرا نہیں تھا۔ میں نے خود گرایا تھا۔ تمہارا امتحان لینے کے لیے تم اس امتحان میں پوری اتریں۔ میں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر تم اس امتحان میں میرے معیار پر پوری اتریں تو یہ ہار تمہیں ہی تحفہ میں دیدوں گا اور اگر تم انکار کروگی تو اسے یہیں ڈال جاؤں گا۔

چنانچہ اُس نے ہار ڈال دیا اور چلا گیا۔ میں بھی کئی روشوں پر بڑھتی چلی گئی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ پھر آتا ہے یا نہیں مگر وہ نہیں آیا۔ چلا ہی گیا۔

اب میں کشمکش میں پڑ گئی کہ ہار اٹھاؤں یا نہیں۔ سوچتی رہی کہ اگر میں نے اس قیمتی ہار کو نہ اٹھایا تو کوئی اور اٹھا کر لے جائے گا۔ پھر میں ہی کیوں نہ اٹھالوں اور امی جان کے پاس لے چلوں۔ ان سے سب حال کہہ دوں۔ اگر وہ خفا ہوں گی تو ابھی واپس آکر اس ہار کو یہیں ڈال جاؤں گی۔

چنانچہ وہ لوٹی۔ اور میں نے ہار اٹھالیا۔ پھولوں کے زیورات اور تاج بھی اتار ڈالے۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس لے آئی۔

میں سیدھی امی جان کے پاس گئی۔ اتفاق سے وہ تنہا بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں تمام حال یہودی کے آنے اور ہار گرانے کا سنایا۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہیں۔ میں نے ہار دکھایا۔ وہ دنگ رہ گئی۔ کہنے لگیں۔ بڑا قیمتی ہار ہے۔ یہ یہودی بڑے مالدار ہوتے ہیں۔

اسی وقت ابا جان آگئے۔ انہوں نے ہار دیکھ لیا۔ پوچھا۔" یہ کہاں سے آیا ہے۔ امی جان نے انہیں سب حال سنایا۔ وہ کچھ غوطہ میں چلے گئے۔ امی جان

نے کہا۔ کیا سوچنے لگے تم ؟"

ابا جان ۔ میں سوچ رہا ہوں ۔ اتنا قیمتی ہار کیسے پھینک گیا۔ وہ یہودی ۔

امی جان ۔ تم نے یہ نہیں سنا کہ جب زرقا نے اسے لوٹانا چاہا تو اس نے نہیں لیا۔ یہ کہہ دیا کہ میں نے تمہارا امتحان لیا تھا۔ امتحان میں تم پوری اتریں۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ زرقا نے پھر بھی ہار نہیں لیا۔ وہ پھینک کر چلا گیا۔ زرقا دوسری طرف چلی گئی۔ اور دیکھتی رہی کہ یہودی آتا ہے یا نہیں۔ مگر وہ نہیں آیا۔ یہ ہار اس خیال سے اٹھا لائی کہ کوئی اور نے جائے گا۔ اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا اگر تم خفا ہو تو میں اس ہار کو وہیں ڈال آؤں۔

ابا جان ۔ یہ یہودی کچھ عجب دِل ودماغ کے ہوتے ہیں دولت میں کھیلتے ہیں دولت کو پھینکتے انہیں دردبھی نہیں ہوتا۔ یہ کچھ عقلمندی نہیں ہوگی کہ اس ہار کو پھر وہیں پھینکوا دیا جائے۔ وہ تو اب لیتے آنے سے رہا۔ اسے رکھ لو۔ مگر بیٹی زرقا۔

میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ جی ۔

ابا جان جب تک یہ نمائش ہے۔ اس وقت تک تم باغ میں جانا چھوڑ دو۔ تمام باغوں میں غیر مرد آنے جانے لگے ہیں۔

میں نے خود بھی سوچا ہے۔ اب باغ میں میں نہ جاؤں گی۔

تیئسواں باب ۲۳

نیا قرضہ

زرینا نے بیان کیا۔

"مجھے فکر تھا کہ ابن شمعون کے قرضہ کا کیا انتظام ہو گا۔ غالباً والد کو بھی یہی فکر ستا رہا تھا۔ اس روز ان کا دل کسی کام میں لگتا ہی نہ تھا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ لیکن نہ ان سے کچھ کہہ سکتی تھی۔ نہ پوچھ سکتی تھی۔

ابا جان میرے باغ سے آنے کے کچھ دیر بعد ہی چلے گئے تھے۔ اور ابھی تک جب کہ ہم ظہر کی نماز پڑھ چکے تھے۔ واپس نہیں آئے تھے۔ امی جان بھی ان کی منتظر تھیں اور میں بھی انتظار کر رہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا کہ وہ آ گئے۔ میں نے دیکھا ان کا چہرہ بشاش تھا۔ خوشی ٹپکی پڑتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ ان کی باتیں سنوں۔ ابا جان سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امی جان بھی جلدی سے پہنچ گئیں۔ میں بھی گھومتی پھرتی دروازے سے جا لگی۔ باتیں کرنے کی آواز صاف آ رہی تھی۔ بھائی جان ظہر کی نماز پڑھ کر کہیں گئے تھے۔ میں نے سنا امی جان کہہ رہی تھیں وہ خدا تمہیں ہمیشہ بشاش رکھے۔ بہت خوش ہو۔

ابا جان:۔ ہاں ہم بہت خوش ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام مرحلے طے ہو گئے۔

امی جان:۔ کس طرح۔؟"

ابا جان :- خدا کی مہربانی سے یہ بات ہم دیکھتے چلے آئے ہیں کہ جب ہم پر کوئی مصیبت آئی۔ ایک دو روز تو ہم پریشان رہے۔ اور پھر خدا نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دی۔

امی جان :- آخر سید ہو۔ گلشن سادات کا پھول۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول کر لیتا ہے۔"

ابا جان :- ہاں یہ اس کا ہم پر بڑا کرم ہے۔ مگر ہمیں بھی یہ فخر ہے کہ ہماری کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوتی۔"

امی جان :- یہ نماز ہی کی برکت ہے کہ تمہاری ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بتاؤ یہ موجودہ مشکل کیسے حل ہوئی۔

ابا جان :- اس مشکل کے حل کی کوئی امید نہیں تھی۔ مگر قربان جایئے اس پروردگار عالم کے جو حلِ مشکلات ہے۔ یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ ہوا یہ ــــ

ابا جان نے بیان کرنا شروع کیا۔

ہم یہاں سے سیدھے وزیر اعظم کے پاس پہنچے۔ معلوم ہوا۔ وہ نمائش میں گئے ہیں ہم انہیں تلاش کرتے نمائش میں پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ ابھی اپنے مکان پر چلے گئے۔ ہم پھر ان کے مکان پر پہنچے۔ وہ مل گئے۔ بڑے تپاک سے پیش آئے پوچھنے لگے کیسے آئے؟"

ہم نے عرض کیا۔ ایک بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس مشکل نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔

وزیر اعظم ہماری حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم نے انہیں تمام حالات سنا ڈالے۔ وہ بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ بھی کچھ فکر مند ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔ روپے کا معاملہ بڑا کٹھن ہے۔ اس وقت کہاں سے انتظام ہو سکتا ہے۔ ہم مایوس ہو گئے اور ہمیں بڑا قلق ہوا۔ انہوں نے دیکھ لیا۔ بولے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے۔

ہم نے پوچھا کیا۔ ؟

انہوں نے کہا۔ اس وقت مغرب اقصیٰ کا سب سے بڑا دولت مند یہاں آیا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے کسی کو دے دینا تو اس کے نزدیک کوئی بات

ہی نہیں ہے۔ کیا تم سمجھ گئے ۔ اسے ۔ ؟"

ہم ۔ غالباً آپ ابن شعل کا ذکر کر رہے ہیں۔"

وزیر اعظم ۔ ہاں ابن شعل ہی کا ذکر کر رہے ہیں ہم ۔ وہ شہر تازہ کا ایسا سرمایہ دار ہے جس کے سرمایہ کا کوئی جواب حد و حساب ہی نہیں ہے۔"

ہم ۔ مگر وہ ہم سے واقف نہیں ہے۔ ہمیں کیوں روپیہ دے دے گا۔

وزیر اعظم ۔ ہم سے تو واقف ہے وہ۔ ہم تمہاری سفارش کریں گے ۔ آؤ۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیں۔

اگر وہ یہ اُمید نہ دلاتے تو ہم کھانا نہ کھا سکتے۔ جب سے ابن شمعون نے ہم پر تقاضا کیا تھا۔ ہماری بھوک اور پیاس اڑ گئی تھی۔ غم فکر اور پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ ہماری پریشانی کا احساس زرقا کو بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ہم سے پریشانی کی وجہ پوچھی ۔ دل میں آیا اسے سب حال بتا دیں مگر طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ یہ خوف ہوا کہ وہ یہ سُن کر ہم غریب اور مقروض ہیں۔ غمزدہ ہو جائے گی۔ اور ہم اسے غمگین دیکھنا نہیں چاہتے ۔ اسے اس مغالطہ میں مبتلا رہنا چاہیئے کہ امیر ہیں۔ دولتمند ہیں

انہیں کیا خبر تھی کہ مجھے تمام حالات معلوم ہیں۔ وہ مجھ پر یہ بات ظاہر کرنا نہیں چاہتے کہ ہم غریب ہیں۔ اور میں ان پر یہ بات ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مجھے یہ بات معلوم ہے۔

ابا جان نے کہا ۔

وزیر اعظم کے اطمینان دلانے پر اُمید کی شعاع ہمارے دل میں چمکی کچھ کچھ پریشانی دُور ہو گئی ۔ کچھ غم ہلکا ہو گیا۔ ہم کھانا کھانے کے لیے تیار ہو گئے چنانچہ کھانا آیا۔ اتنے میں اور بھی کئی آدمی آ گئے ۔ اور ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وزیر اعظم دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے لگے ہم چاہتے تھے وہ جلدی سے ابن شعل کے پاس چلیں۔ لیکن لوگ اپنی اپنی عرضداشتیں عرض کر رہے تھے اور وہ انہیں تسلی بخش جواب دے رہے تھے۔

خیر وہ تھوڑی دیر میں ان سے فارغ ہو گئے۔ اور ہم سے بولے یا لیدی چلیئے۔

ہم نے عرض کیا۔ میں ایک مفلس سید ہوں اس طرح خطاب نہ کیجئے۔"

وزیراعظم۔ کیا مفلس ہونے سے تمہارا خاندانی وقار کم ہوگیا؟ یہ بات نہیں ہے ہمیں خوشی ہوگی کہ ہم تمہارے کسی کام آسکیں۔

ہم نے کہا۔ آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں"

انہوں نے گاڑی تیار کرائی اور ہم دونوں سوار ہوکر چلے۔ ابن مشعل کی قیام گاہ پر پہنچے۔ اس کا کیمپ خوب آراستہ تھا۔ غلاموں کی پلٹن کی پلٹن پھر رہی تھی۔ ایکطرف اس کے رسالہ کے لوگ پڑے اینڈ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ سب وزیراعظم سے واقف تھے۔ کیونکہ انہیں دیکھتے ہی وہ بڑے ادب سے کھڑے ہوگئے۔ اور ان کی سلام کے لیے جھکتے چلے گئے۔

ابن مشعل کو وزیراعظم کے آنے کی اطلاع ہوئی وہ ان کی پیشوائی کے لیے خیمے کے دروازے تک آیا اور ہمیں ساتھ لیکر خیمے میں پہنچا۔

خیمہ کا شاہانہ ساز وسامان دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ وہ مسند کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ وزیراعظم کو صدر کی جگہ بٹھایا۔ ہم دوسری طرف بیٹھ گئے۔

ایک عرصہ سے ہم ابن مشعل کا نام اور اس کی دولت کا چرچہ سن رہے تھے مگر اسے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کئی گل اندام یہودی لڑکیاں اس کے خیمے میں موجود تھیں۔ وہ شاید کنیزیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم کیمپ میں آئے تو وہ اسوقت اپنے خیمہ میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ہماری آمد کی خبر سن کر اس نے شراب اور ساغر وصراحی سب ہٹوا دیئے تھے۔

آج پہلی مرتبہ ہم نے ابن مشعل کو دیکھا۔ نہایت فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے وزیراعظم سے کہا۔ "اسوقت کیسے تکلیف فرمائی۔

وزیراعظم ایک خاص ضرورت سے حاضر ہوا ہوں"

ابن مشعل۔ فرمایئے"

وزیراعظم میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ انہیں کچھ روپے کی ضرورت ہے"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اور وزیراعظم سے مخاطب ہوکر بولا۔ آپ کی تعریف"

وزیراعظم۔ آپ عالی نسب ہیں۔ خاندانی سادات سے ہیں۔ آپ کا نام شیخ

صالح ہے۔"

"شیخ صالح" اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ سوچنے لگا۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید ابن شمعون نے اس سے ہمارا کوئی ذکر کیا ہے۔ وزیر اعظم نے کہا۔ "جی ہاں شیخ صالح۔ کیا آپ نے ان کا نام سُنا ہے۔"

اس نے کہا۔ نہیں میں نے یہ نام نہیں سُنا۔ مجھے اس نام سے اس لیے تعجب ہوا کہ صالح سے پہلے شیخ کا لفظ ہے اور آپ انہیں سید بتاتے ہیں۔"

وزیر اعظم۔ عرب میں سب پہلے شیخ ہیں۔ پھر اپنے قبیلہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔"

ابن مشعل۔ کس قدر روپے کی ضرورت ہے انہیں۔

ہم نے وزیر اعظم کو تیار کھا تھا۔ انہوں نے کہا۔ کچھ زیادہ نہیں۔ صرف دس ہزار دینار چاہئیں۔

ابن مشعل۔ آپ سفارش کے لیے آئے ہیں۔ میں انہیں دس ہزار دینار دے دوں گا۔ سود بھی نہیں لوں گا۔ بشرطیکہ یہ روپیہ ایک سال میں ادا کر دیں۔"

ہم نے جلدی سے کہا۔ یقین رکھیے۔ میں ایک سال میں روپیہ ادا کر دوں گا۔"

ابن مشعل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اگر ایک سال میں ادا نہ کر سکے تو۔"

ہم۔ جو تاوان آپ کہیں گے ادا کروں گا۔"

ابن مشعل۔ مجھے منظور ہے۔"

وزیر اعظم۔ مگر روپیہ انہیں اسی وقت چاہیئے۔"

ابن شعل۔ ابھی دیدیا جائے گا۔

ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ آپ دستاویز لکھ دیجیے۔"

اس نے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ وہ کاغذ اور قلمدان لے آئیں۔ وہ بولتا رہا اور ہم لکھتے رہے۔ اس نے لکھایا دس ہزار دینار بطور قرض ہم نے ابن مشعل سے بلا سود لیے ہیں۔ اقرار یہ ہے کہ ایک سال میں یہ روپیہ بلا سود کے ادا کر دیا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ ادا نہ ہو سکے تو تاوان میں ابن شعل جو کچھ طلب کریں گے وہ ادا کروں گا۔

ہم نے لکھ دیا۔ اس نے اُسی وقت دس ہزار دینار دے دیئے۔ ہم اور

وزیراعظم اس کا شکریہ ادا کر کے چلے آئے۔ ہم ابنِ شمعون کے پاس پہنچے۔ اس کے قرضہ کا حساب کیا۔ اس سے تمام دستاویزیں واپس لیں۔ اور قرضہ کی بیباقی کی رسید بھی لے لی۔ اُس کا قرضہ بیباق کر کے ایک ہزار دینار باقی بچے۔ یہ لو سنبھالو۔ اب تم اور زرقا خوب نمائش دیکھنا۔

امی جان نے پھر ٹھنڈا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔ گویا ان کے سر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اُٹھ گیا۔ انہوں نے کہا۔ خدا ابنِ شعل کو خوش رکھے اس نے اسوقت ہماری عزت بچالی۔

ابا جان۔ واقعی اس نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے بغیر سود کے اتنی بھاری رقم دے دی۔

امی جان۔ مگر تم ایک سال کے اندر ہی اسے یہ روپیہ ادا کر دینا۔

ابا جان۔ انشاءاللہ۔

میں وہاں سے چلی آئی۔

چوبیسواں باب ۲۴

ایک تصویر

زرقا نے بیان کیا۔

"مجھے بڑا تعجب تھا کہ ابن شغل نے اتنی بھاری رقم بغیر سود کے بلا جانے پہچانے وزیر اعظم کی ذرا سی سفارش پر کیسے دیدی۔ خیال ہوا۔ بڑا نیک ہے بیچارا۔ مگر فوراً ہی خیال آیا۔ یہودی پیسہ کا غلام۔ کوڑی کوڑی جمع کرنے والا یہ بغیر کسی غرض کے اتنی رقم کیوں دینے لگا۔ کہیں اس میں کوئی چال تو نہیں ہے۔ اس کی بہت غور کیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے دیکھا کہ امی جان بھی خوش خوش پھرنے لگیں۔ ابا جان تو خوش خوش آتے ہی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد امی جان میرے کمرہ میں آئی۔ کہنے لگی۔ زرقا تیرے ابا نے تیرے نمائش کے خرچ کے لیے کچھ روپے الگ کر دیتے ہیں۔ جو چیز پسند آئے خرید لینا۔

میں ساری باتیں سن چکی تھی۔ ابا جان کی بہت زیادہ متشکر تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے۔ یہ احساس ہو کہ ہم غریب ہیں۔ کسی خرچ میں کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ حالانکہ میں خود محتاط ہو گئی تھی۔ زیادہ خرچ نہ کرتی تھی۔

میں نے کہا۔" ابا جان بہت ہی اچھے ہیں ــ بہت ہی اچھے۔

امی جان نے مسکرا کر کہا۔ "اور میں"

میں۔ تم بھی بہت اچھی ہو۔ میرے ابا جان اور امی جان دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔

امی ہنسنے لگی۔ اس وقت بھائی جان آگئے۔ انہوں نے کہا۔ ابا جان و امی جان تو اچھے ہیں اور میں ___

" بھائی جان بھی اچھے ہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی مسکرائے۔ میں نے پھر کہا نمائش تو مجھے بھائی جان ہی دکھا دیں گے۔

بھائی جان۔ انشاء اللہ جب کہو گی۔ دن کو یا رات کو گھما لایا کروں گا۔"

ہم تینوں ہنسنے لگے۔ اسی روز سے ہمارے گھر میں شادمانی آگئی۔ ہم ہنسنے اور ہنسانے لگے۔ ہر وقت قہقہے اور چہکتے رہنے لگے۔ فارغ البالی سے ہی انسان خوش و خرم رہ سکتا ہے۔

آخر نمائش کی افتتاح کی تاریخ آگئی۔ ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں وزیر اعظم نے نمائش کا افتتاح کیا۔ نمائش کھل گئی۔ سوداگروں نے دوکانیں پہلے ہی سے سجائی تھیں۔ سُنا ہے کہ بازاروں میں بڑی گہما گہمی تھی۔

جب بھائی جان دوپہر کا کھانا کھانے آئے تو بہت خوش تھے کہنے لگے ایسی نمائش میں نے آج تک نہیں دیکھی ہے۔ دوکانیں بڑی قرینہ سے لگی ہوئی ہیں اور بڑے سلیقہ سے سجائی گئی ہیں۔ دیس دیس کی اور طرح طرح کی چیزیں ہیں۔ ہر قسم کے کپڑے ہر قسم کے زیور۔ ہر قسم کے جواہرات۔ ہر قسم کے میوے غرض قسم قسم کی نادر چیزیں ہیں۔ اور یہ انتظام رکھا گیا ہے کہ ہر قسم کی چیزوں کی دوکانیں ایک ہی جگہ ہیں یعنی کپڑے کی دوکانیں ہیں تو کپڑے ہی کی ہیں۔ ہر قسم کا کپڑا۔ سوتی۔ ریشمی اور اونی۔ زیورات کی ہیں۔ تو زیورات ہی کی ہیں۔ جواہرات کی ہیں تو جواہرات ہی کی۔ میووں کی ہیں۔ تو میووں کی۔ کھلونوں کی ہیں تو کھلونوں کی ہیں۔ عجیب عجیب نادر چیزیں اور ملک ملک کی بہترین صنعتیں آئی ہیں۔ اندلس کے پتھر کے بہترین برتن جیسے شیشے کے ہوں۔

غرض بھائی جان نے نمائش کی چیزوں کی دوکانوں کی۔ ساز و سامان کی کچھ ایسی تعریف کی کہ مجھے نمائش دیکھنے کا اسقدر اشتیاق پیدا ہوا کہ جی چاہا ابھی چل کر دیکھوں۔ میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بھائی جان نے کہا۔ تاتاریوں کا ایک مصور آیا ہے۔ بڑی بھی اچھی تصویریں لایا ہے۔ شاید وہ سیاحی بھی کر چکا ہے۔ کیونکہ اندلس کے مشہور شہر

قرطبہ کی جامع مسجد اور قصر الحمرا اور شہر طلیطلہ کی جامع مسجد اور قصر الزہرا کی تصویریں اس نے بنائی ہیں۔ سُنا ہے۔ بڑی اچھی ہیں۔ وہ ملک ملک کی عورتوں کی تصویریں بھی لایا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک تصویر ایسی نادر نایاب ہے کہ اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ وہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔ پھولوں کے زیورات پہنے اور پھولوں کا تاج سر پر رکھا شہزادیوں کی شان سے پھولوں کے کنج میں کھڑی ہے۔ ایسی حسین لڑکی یا تو پرستان میں ہو سکتی ہے یا بہشت کی حوروں میں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ایسی کوئی لڑکی ہے اور وہ اپنا جلوہ دکھا دے تو دیکھنے والے بے خود ہو جائیں۔

بھائی جان اس تصویر کی تعریف کر رہے تھے اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک نامعلوم خوف سے میں ان کا منہ تک رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا "تم نے وہ تصویر نہیں دیکھی"

انہوں نے جواب دیا "نہیں"

میں۔ دیکھنا بھی نہیں۔

انہوں نے ہنس کر پوچھا "کیوں نہ دیکھوں؟"

میں۔ اس لیے کہ تصویر دیکھنا گناہ ہے"

وہ ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں یہ بات بالکل نہیں جانتا چلو۔ میری عالمہ اور فاضلہ بہن نے بتا دیا۔

یہ انہوں نے طنزاً کہا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ پڑھے ہوئے تھے۔ عالم کہلانے کے مستحق تھے۔ مجھے ایک شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس تصویر کو دیکھیں۔

انہوں نے امی جان سے بھی نمائش کی تعریف کی۔ میری طرح انہیں بھی اسکے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

نمائش ہمارے باغات کے قریب تھی۔ ایک باغ میں ابا جان نے نہایت خوشنما اور شاندار کوٹھی تیار کرائی تھی۔ ہم عام طور پر گرمی کے زمانہ میں اس کوٹھی میں چلے جاتے تھے۔ اور کئی مہینے رہتے تھے۔ اب بھی ابا جان نے اس کوٹھی کی صفائی کرا دی تھی۔ اور یہ بات ہماری مرضی پر چھوڑ دی تھی کہ جب چاہیں اس میں چلے جائیں۔

میں نے امی جان سے پوچھا۔ باغ میں کب چل کر رہیئے گا۔

انہوں نے جواب دیا جب تو کہے۔ تیرے ابا جان نے کہہ رکھا ہے کہ جب زرقا کہے باغ میں چلی جانا۔

میں ۔ تو چلئے ابھی ۔"

امی جان ہنس پڑیں۔ انہوں نے کہا۔ اس طرح چلنا ہنسی کھیل ہے۔ یہاں کا انتظام کر کے کل یا پرسوں چلیں گے۔

اسی روز میں مغرب کی نماز پڑھ کر امی جان کے پاس جا بیٹھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ابا جان بھی آ پہنچے۔ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر گئے تھے۔ اور اب آئے تھے۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو امی جان نے مسکرا کر کہا۔ سارا دن ہی نمائش میں لگا دیا۔

ابا جان ۔ ہاں رہے ہم سارا دن نمائش ہی میں۔ لیکن چند بازار دیکھ سکے ہیں۔

امی جان ۔ کیا کیا دیکھا ۔"

ابا جان ۔ وہ دیکھا کہ جس کے دیکھنے کی پھر تمنا ہے۔ ہر چیز نادر۔ ہر چیز نایاب اور ہر چیز قابلِ دید۔ بس یہ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ خرید لوں۔

امی جان کوئی خاص چیز بھی دیکھی۔

ابا جان ۔ دیکھی نہیں۔ سنی ہے۔ کسی لڑکی کی تصویر ہے۔ دنیا اسے دیکھ رہی ہے اور حیران ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ مصوّر نے ایسا کمال کیا ہے کہ اس کی قلمکاری کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ایک ہزار درہم اس تصویر کی قیمت لگ چکی ہے "۔ مگر مصوّر دینے کو تیار نہیں۔

میں پھر ایک نامعلوم خوف سے ڈر گئی۔ وہی تصویر کا ذکر لگی کیا ساری نمائش میں ایک تصویر ہی نادر نایاب آئی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر تصویر ہی کا ذکر ہے۔ مجھے تصویر کے ذکر سے خوف معلوم ہونے لگا۔

امی جان نے کہا۔ تمہاری یہ لاڈو۔ ہمیشہ ابا جان سے میرا ذکر ان ہی الفاظ سے کیا کرتی تھیں کہ رہی ہے ابھی باغ میں چلو۔"

ابا جان بھی ہنس پڑے۔ انہوں نے کہا۔ آج نہیں بیٹی۔ کل چلی جانا (امی جان سے مخاطب ہو کر بولے۔) تم کل سب انتظام کر لینا اور شام کے وقت چلی جانا۔

امی جان نے کہا۔ یہی میں نے کہہ دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ کل ہی چلنا۔

اس روز میں نے امی جان اور ابا جان کے ساتھ کھانا کھایا۔ لیکن تصویر کے خیال نے کچھ ایسا خوفزدہ کر دیا کہ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا گیا۔

پچیسواں باب ۲۵
کشمکش

زرقا نے بیان کیا۔

جس تصویر کی تعریف کی جا رہی تھی۔ اُس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ایک لڑکی پھولوں کے زیورات پہنے پھولوں کا تاج اوڑھے پھولوں کے کنج میں شہزادیوں کی سی شان سے کھڑی ہے۔

ایک روز اسی عالم میں میں بھی باغ میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسی روز جب ایک مالدار یہودی نے مجھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور یہودی تھا۔ مالدار یہودی نے اسے پوچھا تھا۔ خاکہ تیار کر لیا؟ اُس نے جواب دیا تھا۔ جی ہاں۔

مجھے رہ رہ کے خیال آتا تھا۔ کہیں وہ دوسرا یہودی مصور تو نہیں تھا۔ اس نے میری تصویر کا خاکہ تو نہیں کھینچا تھا۔ مگر فوراً ہی یہ خیال آ جاتا کہ کیا میں ایسی خوبصورت ہوں کہ دنیا دیکھ کر حیران ہو جاتے۔ وہ تصویر میری نہیں ہو سکتی۔ کسی اور ہی کی ہوگی۔

جب اس خاکہ کا خیال آتا دل دھک سے ہو جاتا۔ بھوک اور پیاس اڑ جاتی اور جب یہ خیال آتا کہ وہ تصویر میری نہیں ہو سکتی تو دل کو اطمینان ہو جاتا۔

وہ رات اسی کشمکش میں گزاری۔ دوسرے روز صبح ہی سے امی جان نے باغ میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ میں بھی ہاتھ بٹانے لگی۔ میرے دل کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ تصویر میری نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ اطمینان تیرے آنے سے درہم برہم ہو گیا۔

——— تجھے یاد آیا۔

جمیلہ - یاد آگیا۔ اب میں خاموش ہوں تو تو مجھے بلانا چاہتی ہے۔ حالانکہ چپ بیٹھے بیٹھے میرا پیٹ۔ ابھرنے لگا ہے۔ میں اسی لیے چپ بیٹھی ہوں کہ تو اپنی داستان جلد ختم کرے۔ زرقا :۔ تو سن

اس نے بیان کرنا شروع کیا۔

میں خوشی خوشی باغ میں جانے کی تیاری میں تھی کہ ظہر کی نماز کے بعد تو آگئی۔ اس وقت میں ظہر کی نماز پڑھ کر ذرا ستانے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ تجھے دیکھ کر میرے دل میں خوشی کا دریا موجزن ہوگیا۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تو نے نقاب کرسی پر ڈالا۔ اور بے تکلفی سے میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اور میری ٹھوڑی پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی۔ یہ بتا۔ تو نے تصویر کیوں کھنچوائی۔؟"

میں دبک سے ہوگئی۔ کلیجہ پر گھونسا لگا۔ میرے شبہات قوی ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ تیرے یہ پوچھتے ہی میرے چہرے کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر میں نے تجھ سے کہا۔ کس نے کہا یہ تجھ سے۔؟

تو برابر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میں جھوٹ بولتی ہوں یا سچ کہتی ہوں۔ تو نے کہا۔ تجھے معلوم ہے ایک نادر و نایاب تصویر ایک مصور کی دوکان پر رکھی ہے "۔

میں کمبخت تصویر ہی کے ذکر سے مجھے ہول چڑھتی تھی۔ میرا خون سوکھتا تھا۔ اور اسی کا ذکر میرے سامنے بار بار ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔ ہاں میں نے سنا ہے کوئی تصویر ایسی ہے جس کی قیمت ایک ہزار درہم لگ چکی ہے۔

تو نے کہا۔ وہ ایک ہزار دینار (اشرفی) میں بھی سستی ہے۔ میرے پاس اتنا زر ہوتا تو میں خرید لیتی ــــ جانتی ہے۔ وہ تصویر کس کی ہے "۔

میں - مجھے کیا خبر۔ میں نے وہ تصویر دیکھی ہی نہیں "۔

تو نے میری ران میں چٹکی بھر کر کہا۔ ننھی نہ بن۔ وہ تصویر تیری ہے۔ تو نے اس لیے تصویر کھنچوائی ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر دیوانے ہو جائیں۔

میں - تو دیوانی ہے میں غیر مرد کے سامنے کھڑی ہو کر تصویر کھنچواتی "۔

تو - میں تیری تصویر کو نہیں پہچان سکتی۔ مجھ سے نہ اڑ سچ سچ بتا کس طرح

کھینچوائی یہ تصویر تو نے ۔

میں ۔ تو نے تصویر دیکھی ہے ؟"

تو ۔ ہاں دیکھی ہے کئی دفعہ دیکھی ہے ۔ اس نظر سے دیکھی ہے کہ کہیں مجھے شبہ تو نہیں ہوا ۔ وہ تصویر تیری ہے ۔ ایک دفعہ کہلائے تب تیری ہے اور ہزار دفعہ بھی کہلائے تب بھی تیری ہے ۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ تو اس قدر چل نکلی ہے کہ اپنی تصویر کھینچوائے گی ۔ اور اسے نمائش میں رکھوائے گی ۔ کیا دیا تھا تجھے اس مصوّر نے ؟

تو کہے جا رہی تھی اور میں بھی جا رہی تھی ۔ تیری بات پر کیسے یقین نہ کرتی ۔ تو میری تصویر بنا رہی ہے ۔ تیرا یہ خیال تھا کہ میں نے کچھ لیکر اپنی تصویر کھینچوائی ہے ۔ اگر بھائی جان اس تصویر کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے اور ابا جان کیا خیال کریں گے ۔ میں اس وقت موت کی خواہش کرنے لگی ۔ اور خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں ضرور خودکشی کر لیتی ۔ اگر زمین پھٹ جاتی اور مجھے نگل لیتی تو میں بہت خوش ہوتی ۔ کیسی نمائش اور کس کی نمائش ۔ میرا خون سوکھ گیا ۔ جسم میں خوف سے کپکپی پڑ گئی ۔ تو نے پھر کہا تھا ۔ یہ تصویر کیسے کھینچوائی ۔

میں نے مناسب سمجھا کہ تجھے سب حال سنا دوں اگر تو یقین کر لے تو ایک آدمی تو ایسا ہو جائے جو میری صفائی میں کچھ کہہ سکے ۔

چنانچہ میں نے کہا ۔ میں تجھے سب حال سنائے دیتی ہوں ۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تیرا کام ہے ۔

میں نے سب حال تجھے سنا دیا ۔ خدا کا شکر ہے تو نے یقین کر لیا تو نے جوش اور غصّہ کے عالم میں کہا ۔ بدمعاش یہودی ؟"

میں نے تجھ سے کہا ۔ پہلے یہ بتا جمیلہ ۔ تجھے اس بات کا یقین آگیا یا نہیں ؟"

تو نے کہا ۔ میں تجھے بچپن سے جانتی ہوں تو جھوٹ نہیں بولتی ۔ مجھے یقین آگیا ۔

میں ۔ ابھی تک وہ تصویر بھائی جان یا ابا جان نے نہیں دیکھی ہے مگر انہوں نے تعریف سنی ہے ۔ میرا خیال ہے وہ ضرور دیکھیں گے ۔ کیا کہیں گے مجھے ؟"

تو ۔ تو نے ایسی حرکت ہی کیوں کی ؟"

میں۔ سب کچھ سُن چکی اور پھر مجھ پر الزام لگاتی ہے"
تو۔ مگر تجھے یہ کیا سوجھی کہ پھولوں کی ملکہ بن کر پھولوں کے کنج میں جا کھڑی ہوئی۔
میں۔ شامتِ اعمال کہہ لو۔ اب تدبیر بتا میں ابا جان اور بھائی جان کو کیا جواب دوں"

تو۔ کہہ دینا کہ میں مشہور رہونا چاہتی تھی۔
میں۔ مردار۔ مذاق کیے جاتی ہے"
تو۔ پھر اور کیا کہے گی تو"
میں۔ جمیلہ یا تو مجھے کوئی تدبیر بتا نہیں تو سن لینا تیری زرقا مر گئی۔ یہ سن کر تو بہت گھبرائی۔ شاید تو میری خودداری سے واقف تھی۔ تو نے کہا۔ پگلی کہیں ایسا نہ کرنا"

میں۔ پھر بتا میں کیا کروں"
تو نے کہا۔ ہمیں تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اگر جھوٹ نہیں بولتے تو تیری جان جاتی ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنا نامناسب نہیں ہے۔ خدا معاف کریگا تو ابھی سے اپنی امی جان کو سب حال بتا دے۔ اور یہ کہہ دے کہ اس روز میرے ساتھ جمیلہ بھی تھی۔ جمیلہ نے ان یہودیوں کو بہت ڈانٹا تھا۔ میں اقرار کر لوں گی۔
میں۔ میں اس یہودی کے آنے اور موتیوں کا ہار پھینک جانے کا حال تو امی جان کو سنا چکی ہوں۔
تو نے مشورہ دیا کہ خاکہ کا ذکر اور کر دے۔ اتفاق سے اسی وقت امی جان بھی وہاں آگئیں تو نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے دُعا دیکر کہا۔ بڑی چپ چاپ آئی تو تو جمیلہ"
تو نے کہا۔ آپ بھی تو چپ چاپ باغ میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں"۔
امی جان ۔ میں سمجھتی تھی زرقا نے تجھے اطلاع دیدی ہوگی۔
تو بولی ۔ زرقا مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ ایک روز میں اور یہ دونوں باغ میں گئی تھیں۔ میں نے اسے پھولوں کے زیور بنا کر پہنائے اور پھولوں کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ اور ضد کر کے اسے پھولوں کے کنج میں جا کھڑا کیا۔ یہ اس وقت مجھے بہت بھلی اچھی معلوم ہوئی۔ میں اسے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد زرقا کو شبہ

ہوا کہ کوئی آدمی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ کنج میں سے نکل آئی۔ میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو
ایک یہودی وہاں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ کاغذ میں تصویر کا خاکہ تھا۔
میں نے اسے ڈپٹا اور اس سے کاغذ چھیننے کو دوڑی مگر وہ بھاگ گیا۔ زرقا کا خیال ہے
کہ وہ کوئی مصور تھا۔ اور اس نے تصویر لے لی ہے۔ یہ اس وقت سے مجھ سے ناراض
ہے کہتی ہے۔ تو نے مجھے کیوں پھولوں کے زیورات پہنائے۔ کیوں کنج میں کھڑا کیا۔
امی جان بولی۔ مگر اس میں تیرا کیا قصور ہے۔ تو نے کہا یہ مجھے قصور وار ٹھہرا رہی
ہے۔ ہر چند میں نے خوشامد کی۔ مگر اس کی خفگی دور نہیں ہوتی۔"
امی جان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیٹی اس سے کیوں ناراض ہے۔ اس کا
کیا قصور ہے میں۔ کمبخت یہودی نے اگر میری تصویر کھینچ لی۔ اور نمائش میں لا رکھی تو کیا میں
بدنام نہ ہو جاؤں گی۔
امی جان۔ کھینچنے دے تصویر۔ کسے معلوم ہو جائے گا۔ تصویر تیری ہے۔
میں۔ ابا جان اور بھائی جان کو تو معلوم ہو جائے گا وہ کیا کہیں گے۔
امی جان۔ تو نے مجھ سے ذکر پہلے نہیں کر دیا۔ ورنہ میں ان سے کہہ دیتی اب
کہہ دوں گی۔ کوئی تجھے کچھ نہ کہے گا۔ چل اور تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ وہ بھی کر لے۔
میں اٹھنے لگی۔ تو نے میرا دامن پکڑ کر کہا۔ "زرقا معاف کر دے مجھے۔ تو نے کچھ ایسی
بھولی صورت بنا کر کہا کہ امی جان بے چین ہو گئیں۔ کہنے لگیں ارے معاف بھی کر دے۔
میں۔ مگر اس نے ایسی ضد کیوں کی۔
امی جان۔ اب اسے معلوم تھا وہاں کوئی آجائے گا۔ الہڑ پنے میں کر بیٹھی ضد
مگر تو تو ایسی بے رحم اور سنگدل کیوں بنی جا رہی ہے کہ معاف ہی نہیں کرتی۔
میں نے گویا امی جان کے کہنے سے تجھے معاف کر دیا۔ تو کتنی چالاک تھی۔ مجھ
سے اس طرح لپٹ گئی۔ جیسے میرے معاف کرنے سے تجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے
دل سے بھاری بوجھ اتر گیا۔ اور میں اور تو امی جان کے ساتھ ان کا ہاتھ ہٹانے کیلئے
چلی گئیں۔

چھبیسواں باب ۲۶

نمائش

رزقا نے بیان کیا:

"جمیلہ، تیری ہوشیاری اور چالاکی سے بگڑی ہوئی بات بن گئی۔ جس غم سے میں گھلی جا رہی تھی۔ وہ دور ہو گیا۔ میں تیری بہت شکر گذار ہوں تو بھی ہمارے ساتھ اس روز باغ میں چلی گئی۔ لیکن اگلے روز تیرے خالو عبداللہ آکر تجھے لے گئے۔

اسی روز شام کے وقت بھائی جان آئے۔ اس وقت میں امی جان کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بڑے خفا معلوم ہوتے تھے۔ امی جان سے بولے "تم نے سُن لیا امی جان وہ تصویر کس کی ہے؟"

میرے دل پر گھونسہ لگا۔ سمجھ گئی کہ ضرور وہ کمبخت تصویر میری ہے۔ امی جان نے کہا "کس کی ہے؟"

انہوں نے طیش میں آکر کہا۔ اس بے حیا کی جو تمہارے پاس بیٹھی ہے۔"

امی جان۔ "کہیں تو دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے؟"

بھائی جان۔ "میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ کیا ہوگا اس رسوائی کا جو ہونے والی ہے۔ ہمارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ اس چڑیل کو کیا سزا دینی چاہیئے؟"

میں نے بھائی جان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ ایسے بیگانے ہو گئے تھے۔ جیسے میں ان کی بہن نہیں ہوں۔ میں ڈر گئی کہ وہ ضرور کوئی

مجھے سزا دیں گے۔

امی جان نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تجھے واقعات کی خبر نہیں ہے ممکن ہے۔ وہ تصویر اسی کی ہو۔ اس کی کوئی خطا نہیں ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے وہ تمام قصہ جو جمیلہ نے اور میں نے ان سے کہا تھا بھائی جان کو سنایا۔ وہ توجہ سے سنتے رہے۔ سب کچھ سننے کے بعد بولے۔ "مگر رسوائی تو ہو گئی۔ ہمارے خاندان کی۔ کیا ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہ گئے ہیں۔

میں رونے لگی اور اسقدر روئی کہ امی جان بے چین ہو گئیں۔ انہوں نے کہا ارے تو کیوں رونے لگی۔ زرقا تیرا اس میں کیا قصور ہے۔ کیا لڑکیاں باغوں میں نہیں جاتیں۔ کیا پھولوں کے زیورات نہیں پہنتیں۔ مگر یہ کہو کہ آجکل برائے نام حکومت مسلمانوں کی ہے۔ طاقت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کمبخت یہودیوں کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو باغوں میں گھستے پھرتے ہیں۔ پرائی بہو بیٹیوں کو رسوا کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو کمزور دیکھ کر ان پر تیز ہونے لگتے ہیں۔"

بھائی جان۔ "میں اس یہودی مصور ہی کی آج ناک اڑا دوں گا۔"

امی جان۔ "اور بھی دیوانہ پن ہو گا۔ ابھی تک تو کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہے کہ تصویر کس کی ہے۔ مگر جب تم یہودی مصور کی ناک اڑا دو گے تو سب سمجھ جائیں گے کہ تمہاری بہن کی تصویر تھی۔ عقلمندی یہی ہے کہ خاموش رہو۔"

غرض انہوں نے سمجھا بجھا کر بھائی جان کو ٹھنڈا کر دیا۔ میں برابر روتی رہی جب بھائی جان کا غصہ جاتا رہا تو ان کی وہ محبت عود کر آئی جو انہیں مجھ سے تھی۔ انہوں نے کہا۔ "زرقا۔ مت رو۔ مجھے واقعات معلوم ہو گئے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ایسی باتیں تجھے کیوں کہیں۔ جس سے تیرے دل کو ٹھیس لگی۔ تو بے قصور ہے۔"

غرض وہ مجھے منانے لگے۔ اور جب تک مجھے ہنسا نہ لیا۔ انہیں چین نہ آیا۔ امی جان نے کہا۔ اب تو نے انسے اتنا رلایا ہے تو آج نمائش بھی دکھا کر لا۔

بھائی جان۔ "ضرور۔ میں اپنی بہن کو نمائش دکھاؤں گا۔"

میں۔ "میں نمائش و مائش نہیں دیکھتی۔ باغ میں جانے اور چڑیل جمیلہ کی ضد سے پھول پہننے سے تو جان پر بن گئی تھی۔ نمائش میں جاؤں گی تو خدا جانے کیا ہو گا۔

بھائی جان۔ کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک سعید زندہ ہے انشاءاللہ کچھ نہ ہوگا۔

میں۔ تم ہی مجھ سے بدظن ہو گئے تھے“!

بھائی جان۔ یہ میری غلطی تھی۔ اب کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا“

میں۔ شکریہ۔ مگر میں نمائش نہیں جاؤں گی“!

بھائی جان۔ میں ضرور لے جاؤں گا۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتے گی تو“!

یہ کہہ کر انہوں نے میرے گدگدی شروع کی اور اس قدر ہنسایا کہ میں بے حال ہوگئی۔ کہنے لگے چلے گی نمائش میں“!

میں نے کہا ضرور چلوں گی۔

مجھے خود نمائش دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ لیکن کمبخت تصویر کا ایسا قصہ پیش آ گیا تھا جس نے میری خوشی اور امنگ کو ملیامیٹ کر کے رنج وغم میں گرفتار کر دیا تھا۔ آج وہ غم دُور ہوگیا تھا۔ اور دل کو خوشی ہوتی تھی — بھائی جان نے نمائش دکھانے کا اقرار کر ہی لیا تھا۔ میں نے تیاری شروع کر دی

مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھایا اور عشا کی نماز پڑھ کر بھائی جان کے ساتھ نمائش دیکھنے چلی۔ ہمارے باغ کے قریب ہی۔ سے نمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے چہرہ پر نقاب ڈال لیا تھا۔

چاندنی رات تھی۔ چاند آسمان میں تیر رہا تھا۔ چاندنی چمک رہی تھی۔ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس نور میں درخت اور درختوں کی شاخیں پتے۔ سبز پودے۔ ریت اور پتھر سب نہا رہے تھے۔

نمائش میں بیس بیس قدم کے فاصلہ سے فانوس روشن تھے۔ دوکانوں میں بہت زیادہ روشنی ہو رہی تھی۔ چاندنی کے ساتھ اس روشنی نے مِل کر دن کا سا سماں کر رکھا تھا۔ ہر دوکان خوب آراستہ تھی۔ اور ہر دوکان کی ہر چیز روشنی میں چمک رہی تھی۔ عورتوں اور مردوں کی بڑی بھیڑ تھی۔

نمائش واقعی قابلِ دید تھی۔ ایسی نمائش فاس میں کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میں تو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ملک ملک کے دوکاندار تھے۔ اور اپنے اپنے ملک کا لباس پہنے گاہکوں کو سامان دکھا رہے تھے۔ خرید اور فروخت ہو رہی تھی عورتیں زیادہ خرید رہی

تھیں۔ عورتیں زیادہ خرید رہی تھیں۔ بھائی جان نے مجھ سے کہا۔ جو چیز پسند ہو خرید لو۔

میں۔ شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے"

بھائی جان۔ اچھا ـــ معلوم ہوتا ہے ابھی تک تم مجھ سے ناراض ہو"

میں ان سے بالکل بھی ناراض نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ نہیں، میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ کوئی بہن اپنے بھائی سے بھی ناراض ہوتی ہے"

بھائی جان۔ ناراض نہیں ہو تو کچھ خریدو"

کیا خریدوں۔ وہاں تو ہر چیز خریدنے کے قابل تھی۔ میں نے کہا۔ یہ وعدہ کرو" کہ روزانہ مجھے نمائش دکھانے لایا کرو گے"

بھائی جان۔ وعدہ کرتا ہوں"

میں۔ بس تو کسی روز خرید لوں گی۔

ہم دونوں گھومتے پھرتے مصوّر کی دوکان پر پہنچ گئے۔ بھائی جان نے کہا۔ دیکھو گی وہ تصویر۔

میں۔ دکھاؤ"

وہ مجھے لے کر دوکان کے اندر گھس گئے۔ ایک تصویر سنہرے چوکھٹے میں ایک میز پر رکھی تھی۔ مرد اور عورتیں اسے دیکھ رہے تھے۔ دوکان کے اندر اچھا خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ میں نے تصویر دیکھی۔ میری ہی تھی۔

کمبخت مصوّر نے ایسے رنگ بھرے تھے۔ کہ بے اختیار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ اگرچہ تصویر میری تھی۔ مگر میں بھی اسے دیکھنے میں محو تھی۔ میں نے کئی نوجوانوں کو یہ کہتے سنا تھا "خیالی تصویر ہے۔ دنیا میں ایسی حسین لڑکی نہیں ہو سکتی"

انہیں کیا خبر تھی کہ جس کی یہ تصویر ہے وہ اسی مجمع میں موجود ہے۔ مگر مجھے شرم آئی کہ میری تصویر موجب خلائق بنی ہوئی ہے۔ میں بھائی جان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل آئی۔ ہم دونوں آدھی رات تک گھومتے رہے۔ نمائش کی سیر سے طبیعت نہ بھرتی تھی اگر تھک نہ جاتی تو واپس نہ آتی۔ جب تھک کر بدن چور چور ہو گیا تب واپس آئی۔

ستائیسواں باب ۲۷

رشید

زرقا نے بیان کیا۔

"نمائش ایسی تھی کہ جتنا اسے دیکھتے تھے اتنا ہی اور دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ دِن میں بھی دیکھا۔ اور رات کو بھی دیکھا۔ دن سے زیادہ رات کو رونق ہوتی تھی۔ اور رات سے زیادہ دِن کو رونق رہتی تھی۔ میں نے دن کو بھی نمائش دیکھی اور رات کو بھی صبح اور شام کو بھی دوپہر کو بھی رات کو بھی آدھی رات کو بھی ہر وقت مجمع کا یہ عالم رہتا تھا کھوے سے کھوا چلتا تھا۔ دوکانوں کے سامنے عورتیں اور مردوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ بازاروں کے راستے اگرچہ بہت زیادہ کشادہ رکھے گئے تھے۔ مگر لوگوں کے ہجوم کیوجہ سے تنگ ہو گئے تھے۔ بعض وقت تو ایسی گہما گہمی ہو جاتی تھی۔ اور طبیعت پریشان ہونے اور دِل اُلٹنے لگتا تھا۔

مصوّر کی دوکان کافی لمبی اچوڑی اور بڑی تھی۔ وہ کافی سامان لے کر آیا تھا۔ اس کی دوکان میں عمارتوں کی تصویریں۔ جانوروں کی تصویریں، مردوں کی تصویریں، عورتوں کی تصویریں۔ بچوں کی تصویریں۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی تصویریں۔ مرغزاروں اور آبشاروں کی تصویریں۔ غرض ہر قسم کی تصویریں تھیں۔ اور یہ تصویریں فروخت بھی ہو رہی تھیں۔ مگر مجمع رہتا تھا میری تصویر کے پاس مصوّر نے اب اس تصویر کو ایک خوبصورت شامیانے کے نیچے۔ نمایاں جگہ پر رکھ دیا تھا۔ سنا تھا۔ اس تصویر کی قیمت

دو ہزار درہم تک لگ چکی تھی۔ مگر مصور فروخت نہیں کرتا تھا۔

مسلمان تو اس تصویر کو ایک نظر دیکھ کر چلتے پھرتے تھے۔ لیکن یہودی اور عیسائی۔ گھنٹوں کھڑے دیکھا کرتے۔ میں بھی اکثر دیکھنے چلی جاتی۔ جب جاتی اس تصویر کے متعلق لوگوں کو کچھ نہ کچھ کہتے سنتی۔ کوئی کہتا "کس قدر معصوم ہے۔ ایسی بھولی بھالی جیسے اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں ہے۔" کوئی کہتا "پھول والی حسینہ پھولوں سے زیادہ نازک" اور کوئی کہتا "حسن مجسم۔ پیکر ناز۔ جس کے ادنیٰ اشارہ پر سلطنتیں قربان کر دی جائیں۔" کوئی کہتا۔ "ایسی دیوی جو پرستش کرنے کے قابل ہے۔"

غرض تصویر کو دیکھ کر لوگ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے۔ میں سنتی اور دل ہی دل میں خجل ہوتی۔ کبھی کبھی اس مصور پر غصہ بھی آتا۔ جس نے میری تصویر منظر عام پر لا کر میری تشہیر کی تھی۔ لیکن کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ اگر میرا بس چلتا اور حکومت میں وہ قوت و طاقت ہوتی تو میں مصور کو سزا دلائے بغیر نہ رہتی۔

مگر سلطنت کمزور تھی۔ اس وقت عبدالملک معتصم سلطان تھے۔ مگر وہ یہودی سرمایہ داروں سے دبتے تھے۔ خصوصاً ابن مشعل سے معلوم یہ ہوا تھا کہ سلطان ابن مشعل کے مقروض ہیں۔ یہ بات بھی مشہور تھی کہ یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں غنڈے ہیں۔ وہ جب اور جہاں چاہیں فساد کرا دیں۔ حکمران ان سے دبتے ہیں اور سلطان ان سے ڈرتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ احکام اور افسر امیر اور جاگیر دار وزیر اور سلطان سب ابن مشعل کے مقروض تھے۔ اس لئے اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اور اس سے دبتے تھے۔ اس کی وجہ سے اس کی قوم بنی اسرائیل کو تمام مغرب اقصیٰ میں بڑی مراعات حاصل تھیں۔ ایک ادنیٰ یہودی کی رسائی حکام سے لیکر وزیروں اور سلطان تک تھی اور ابن مشعل کے پاس تو وزیر خود جاتے تھے۔ سلطان اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ قانون کے خلاف بھی جو چاہتا تھا کرا لیتا تھا۔

جب سلطنت مغرب اقصیٰ اور سلطان مغرب کی یہ حالت تھی تو کسی یہودی کو سزا دلانے کا خیال کرنا بھی حماقت نہیں تو اور کیا تھا۔

یہودیوں کے اقتدار بڑھے ہوئے ہونے کی وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ سلطان

عبدالملک معتصم کے ایک بھتیجے تھے۔ ان کا نام عبداللہ متوکل علی اللہ تھا۔ وہ سلطان کے خلاف تھے۔ انہیں سلطنت سے الگ کر دینے کی سازشیں کرتے رہتے تھے اور خود سلطنت حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ کچھ یہودی ان کے طرفدار تھے۔ لیکن بڑے بڑے سرمایہ دار یہودیوں کے ایماء پر ہی۔ ابو عبداللہ متوکل علی اللہ سلطان کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ چچا بھتیجا میں اتفاق ہو جائے۔ کیونکہ ان میں اتفاق ہوتے ہی یہودیوں کا اقتدار ختم ہو جاتا اور مغرب اقصیٰ میں ان کی کوئی عزت باقی نہ رہتی۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض سمجھدار اور دیندار مسلمانوں نے اور ان کے بھتیجے میں صلح و صفائی کی کوشش کی مگر جب معاملات طے ہونے لگے اسی وقت یہودیوں نے بنا بنایا نقشہ بگاڑ دیا۔ نئی نئی باتیں نکال کر کھڑی کر دیں اور صلح کی بات چیت ٹوٹ گئی۔

میں محض نمائش دیکھنے جاتی تھی۔ کوئی چیز خریدنے نہیں۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ ہم غریب ہیں۔ ہمارے اخراجات قرضہ سے چل رہے ہیں۔ میں اپنے لیے کوئی چیز خرید کر قرضہ کو اور بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ اباجان۔ امی جان اور بھائی جان نے بہت کچھ کہا کہ میں کچھ خرید لوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو کہہ دیا۔ کوئی چیز پسند نہیں آئی۔

حالانکہ نمائش کی ہر چیز لائق پسند اور قابل خریدنے کی تھی۔ پھر بھی بھائی جان اور اباجان نے چند زیورات اور چند ریشمی تھان خرید کر لا دیئے۔ نہایت اچھے زیور اور بڑا اچھا کپڑا تھا۔ بہت پسند آئے۔ مگر جب یہ خیال آتا کہ یہ چیزیں قرضہ لیکر خریدی گئی ہیں تو طبیعت مکدر ہو جاتی۔ اور دل بیٹھ جاتا۔

میری حالت عجیب تھی۔ میں یہ بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کارخانہ قرضہ سے چل رہا ہے۔ اور جب کوئی چیز مجھے خرید کر دی جاتی تھی تو باوجود اس رنج کے یہ چیز قرضہ لے کر آئی ہے۔ خوشی کا اظہار کرنا پڑتا تھا۔

امی جان کا یہ خیال تھا کہ میری تصویر کی جو تشہیر کی جا رہی ہے۔ مجھے اس کا بڑا ملال ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست بھی تھی۔ مجھے اس بات کا رنج ضرور تھا لیکن بڑا رنج تو قرضہ کا تھا۔ اور امی سمجھتی تھیں کہ تصویر کی تشہیر نے میرے دل پر ایسا اثر ڈالا

ہے کہ میری شوخی جاتی رہی ہے۔ اور میرا دل بجھ کر رہ گیا۔۔۔۔ ہے۔

انہوں نے اور ابا جان نے اشاروں میں کئی مرتبہ اس بات کا ذکر بھی کیا اور مجھے سمجھایا بھی کہ تو فضول رنج و افسوس کرتی ہے۔ اس میں تیرا قصور کیا۔ ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ تصویر تیری ہے۔

نمائش شروع ہوئے بیس بائیس دن ہو گئے تھے۔ صرف ایک ہفتہ باقی ختم ہونے میں رہ گیا تھا۔ اب اور بھی زیادہ بھیڑ رہنے لگی۔ شاید نمائش دیکھنے کے لیے دُور دُور سے قبائل آ گئے تھے۔

ایک روز میں اور بھائی جان عشا کی نماز پڑھ کر نمائش دیکھنے گئے ایک جگہ ایسی بھیڑ آئی کہ بھائی جان الگ ہو گئے۔ اور میں عورتوں کے ساتھ بہہ گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ اپنی جگہ لوٹ آؤں اور بھائی جان کو تلاش کر لوں۔ مگر ممکن نہ ہوا۔ آخر میں عورتوں کے ساتھ چلتی رہی۔ ایک جگہ مجھے موقعہ ملا۔ میں لوٹی میں نے بھائی جان کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔

میں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ عورتوں میں گھستی ہوئی چلی۔ آخر نمائش سے نکل کر باہر آئی۔ اپنے باغ کی طرف روانہ ہوئی۔ نمائش سے باغ تک ایک سڑک گئی تھی۔ اس سڑک پر آمد و رفت کم رہتی تھی۔ رات زیادہ آگئی تھی۔ میں تنہا چلی جا رہی تھی۔ بدقسمتی سے میں نے نقاب الٹ لیا تھا۔ سڑک کے کنارے سے دو یہودی نوجوان نکل آتے۔ وہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکے۔ میں نے نقاب ڈال لیا۔ اور کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے میرے پاس آ کر بیہودہ گوئی کی۔ میں نے انہیں ڈانٹا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان میں سے ایک نے میرا نقاب کھینچ لیا۔ اور دونوں شرارت کرنے لگے۔

اتفاق سے ایک نوجوان مسلمان آ نکلے۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے ان بدمعاشوں سے بچاؤ۔ وہ جھپٹ کر آئے اور انہوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ آتے ہی دونوں یہودیوں پر برس پڑے اور اس قدر ان کے گھونسے مارے کہ وہ بے حال ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ مجھ سے بولے "اپنے چہرہ پر دوپٹہ کا آنچل ڈال لو۔

مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ میرا نقاب بدمعاشوں نے چھین لیا تھا اور میں بے نقاب

تھی۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ میں نے دوپٹہ کا آنچل چہرہ پر کھینچ لیا۔ اور ان سے کہا۔ مجھے سامنے والے باغ تک پہنچا دیجئے۔"

وہ۔ "چلو۔ تم یہاں تنہا کیسے تھیں؟"

میں نے انہیں سب قصہ سنایا۔ وہ باغ تک آئے کہنے لگے۔ "تم شاید شیخ صالح کی بیٹی ہو۔"

میں۔ "جی ہاں۔ اور تم؟"

وہ۔ "میں جامع قرویین کا ایک طالب علم ہوں رشید میرا نام ہے۔"

میں باغ میں داخل ہوگئی۔ اور وہ چلے گئے۔

اٹھائیسواں باب

ایک شوخ یہودن

زرقا نے بیان کیا۔

"مجھے غصہ بھی تھا۔ خفت بھی تھی۔ ندامت بھی تھی اور ۔۔"

جمیلہ ۔ اور کیا۔"

زرقا ۔ چپ بیٹھی سنے جا۔"

جمیلہ ۔ یہ بات غلط ہے ۔ اور مطلب بتا۔

زرقا ۔ مطلب تو میں سب ہی کا بتاؤں گی۔

جمیلہ ۔ اچھا یونہی سہی ۔ تو رشید سے تمہاری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی۔

زرقا ۔ ہاں

جمیلہ ۔ اچھا بیان کر۔"

زرقا نے بیان کرنا شروع کیا۔

"مجھے غصہ تو بھیڑ اور بھائی جان سے آیا کمبخت بھیڑ نے بھائی جان کو الگ کر دیا ۔ اور بھائی جان پر اس لیے آیا کہ وہ میرا ساتھ چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلے گئے ۔ خفت اس لیے ہوئی کہ کمبخت یہودیوں نے اوباشی کر کے میرا نقاب چھین لیا۔ ندامت اس لیے ہوئی کہ رشید نے مجھے تنہا یہودیوں کے زغہ میں بے نقاب دیکھا۔ کیا کہا ہوگا۔ انہوں نے اپنے دل میں ۔ خدا جانے انہیں میری بات کا یقین آیا یا نہیں

مجھے "

جمیلہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ٹھہر وہ اور والی بات تو رہ ہی گئی "

زرقا :۔ اور والی بات کوئی نہیں ہے "

جمیلہ۔ غلط۔ جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ لو۔ چار دن ذرا لونڈیا اور مجھے اڑانے لگی

زرقا کو ہنسی آگئی۔ اس نے کہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو بڑھی کھوسٹ ہوگئی ہے "

جمیلہ۔ تجھ سے تو بڑی ہوں۔

زرقا۔ کہیں گھاس کھا گئی ہے۔ جب تو پڑھنے آئی تھی تو سنک چاٹتی پھرتی تھی۔

جمیلہ۔ بت تیری کی۔ سنک چاٹنی ہوگی تو میں کیوں چاٹتی۔ تیرے برابر ہی تھی میں بھی

زرقا۔ پھر بڑی کیسے بن رہی ہے او ہو۔ سمجھی۔ اب سمجھی "

اس کے چہرے سے شرارت ظاہر تھی۔ جمیلہ نے کہا۔ کیا سمجھی تو ــــ ؟

زرقا۔ رشتہ بڑا ہو جائے گا تیرا "

جمیلہ۔ دھت۔ منہ دھو رکھا ہے تو نے "

زرقا۔ مونہہ دھو دیں گے وہ۔ جن کے پلہ تو پڑے گی میں کیوں منہ دھونے لگی تیرا۔

جمیلہ۔ بڑی شریر ہوگئی ہے تو۔ اچھا ٹالنا چاہتی ہے تو۔ مگر میں ٹلنے والی نہیں۔

بتا اور کیا تھا۔

زرقا۔ یہ خوشی بھی تھی۔ ایک طالب علم نے مجھے بچایا "

جمیلہ نے دھموک مار کر کہا " مکار۔ مجھ سے بھی اڑنے لگی ہے۔ یہ نہیں کہتی کہ طالب علم پسند آگیا تھا۔

زرقا۔ کمبخت۔ تو نے تو کمر ہی توڑ دی۔

جمیلہ۔ معاف کرنا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ تو پھول سے زیادہ نازک ہے واقعی بڑا ظلم کیا۔ میں نے تجھ پر اچھا شروع کر اپنی داستان "

زرقا نے بیان کیا۔

اگرچہ میں آدھی رات کے قریب گھر واپس آئی تھی۔ کافی چلی تھی۔ تھک گئی تھی۔ آتے ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بہت کچھ کروٹیں بدلیں۔ مگر نیند نہیں آئی۔ ایک تہائی رات باقی رہی تھی کہ سو گئی۔ مجھے خبر نہیں بھائی جان کب آئے۔

صبح دیر میں اٹھی۔ قضا نماز ادا کی۔ بھائی جان بھی اسوقت اٹھے تھے۔ انہوں نے میرے پاس آکر کہا۔ "رات کہاں کھو گئی تھی تو"

میں نے جل کر کہا۔ "میں کھو گئی تھی یا تم۔ واہ اچھے بھائی جان ہو۔ خبر بھی نہ لی پھر۔"

بھائی جان۔ "ارے بہت ڈھونڈا میں نے تمہیں۔ ہر بازار کے کئی چکر لگائے۔ خدا معاف کرے۔ عورتوں کی طرف تاکتا پھرا۔ مگر تم جیسے نمائش سے گم ہو گئیں — دراصل رات بھیڑ بھی بہت تھی۔ اچھا کیسے پہنچی تم؟"

اب کیا کہتی بھائی جان سے اگر رات کا سارا واقعہ کہتی ہوں تو وہ جلالی قسم کے آدمی یہودیوں سے جا بھڑیں۔ نہیں کہتی اور کسی طرح انہیں معلوم ہو گیا تو خفت اٹھانی پڑے گی۔ میں سوچنے لگی۔ بھائی جان میری طرف سے دیکھ رہے تھے۔ دل نے کہا۔ اصل حالات ضرور سنا دینے چاہئیں۔

چنانچہ میں نے تمام حال سنا دیا۔ یہودیوں کا ذکر آتے ہی وہ بھڑک گئے کہنے لگے "ان یہودیوں کی سرکشی اور شوریدہ سری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ مسلمانوں کی کوئی عزت و وقعت ہی نہیں سمجھتے۔ تعجب یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں اور اس قدر اندھیر گردی۔ میں نپٹوں گا۔ ان یہودیوں سے۔"

اتفاق سے امی جان بھی اس وقت آگئیں تھیں اور انہوں نے میرا حال بھی سنا تھا۔ اور بھائی جان کی باتیں بھی سنی تھیں۔ انہوں نے کہا بیٹا عقل سے کام لو۔ آج حکومت برائے نام مسلمانوں کی ہے لیکن طاقت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ غصّہ کو تھوک دو۔ اور ان سے اُلجھنے کا خیال چھوڑ دو۔

کافی دیر تک بھائی جان بھڑکتے رہے۔ اور امی جان انہیں ٹھنڈا کرتی رہیں۔ آخر وہ مان گئے۔ رشید کا ذکر میں نے ان سے کر ہی دیا تھا۔ وہ اِن کے بہت مشکور ہوئے۔ اسی روز وہ رشید سے جامع قرودیئن میں جا کر ملے۔ وہ ان سے پہلے سے واقف نہیں تھے۔ نہ رشید انہیں جانتے تھے۔ بھائی جان نے رات کے واقع پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بھائی جان کی اس بات پر بہت مشکور ہوتے کہ وہ ان کا شکریہ ادا کرنے آتے۔ بھائی جان نے ان کی دعوت کرنی چاہی۔ مگر انہوں نے عذر کر دیا —

اس رات والے واقعہ کے کئی روز بعد ایک روز پھر میں عشا کی نماز پڑھ کر بھائی کے ساتھ گئی۔ اور سیر شروع کی۔ اس روز بھیڑ کچھ کم تھی۔ بھائی جان نے بتایا کہ جو لوگ شروع نمائش میں آئے تھے وہ چلے گئے ہیں۔ کیونکہ اس رات کچھ بھیڑ کم تھی۔ اس لیے سیر کرنے میں بڑا لطف آیا۔ اور اچھی طرح چیزیں بھی دیکھیں۔

میں اور بھائی جان ایک جوہری کی دوکان کے سامنے سے گذر رہے تھے کہ جوہری کو کہتے سنا ،،اگر وہ تصویر والی لڑکی واقعی دنیا میں موجود ہے اور میں اس کی ایک جھلک دیکھ لوں تو خدائے موسیٰ کی قسم اس الماری کے تمام زیورات اُسے پہنا کر اور اُس کا جلوہ بے پناہ دیکھ کر اسی کو دیدوں۔،،

میں اور بھائی جان وہاں ٹھٹھک گئے تھے۔ جس الماری کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس میں شیشے لگے ہوتے تھے۔ اور جواہرات کے زیورات جگمگا رہے تھے کئی ہزار دینار کی مالیت کے ہوں گے۔ میں عرق ندامت ہو گئی۔ سوچنے لگی کہ میری بولی بولی جانے لگی۔

میں نے دیکھا اس الماری کے قریب جس کی طرف جوہری نے اشارہ کیا تھا۔ رشید کھڑے ہیں۔ میں انہیں دیکھنے لگی۔ ان کے چہرہ پہ فانوس کی روشنی ناچ رہی تھی۔ ان کے پیچھے کئی آدمی کھڑے تھے۔

رشید ایک دم مڑے اور چل پڑے۔ بھائی جان نے بھی انہیں دیکھ لیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ان کی طرف بڑھے۔ اور ان کے پاس جا کر انہیں سلام کیا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیکر پہلی نظر بھائی جان پر اور دوسری مجھ پر ڈالی۔ میں نے ان کی نگاہوں سے سمجھ لیا کہ وہ مجھے پہچان گئے۔

وہ بھائی جان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلے میں جانتی تھی بھائی جان بڑی خشک قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ وہ اوروں کو تو کیا مجھے بھی نمائش میں بہت کم کھلاتے پلاتے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ رشید کو کچھ کھلا پلا دیں۔ میں نے ان سے آہستہ سے کہا ،،پیاس معلوم ہو رہی ہے،،

انھوں نے یا تو سُنا نہیں۔ یا سن کر ان سنی کر دی۔ غالباً رشید نے سن لیا۔ حالانکہ وہ بھائی کے دوسری طرف تھے۔ ایک قہوہ خانہ آگیا۔ وہ بھائی جان کا ہاتھ پکڑ کر اس

ہیں گھس گئے۔ میں بھی ساتھ چلی۔ اس قہوہ خانہ میں زنانہ انتظام الگ تھا۔ مجھے بھائی جان نے اس میں ڈھکیل دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک کنیز پھل اور شربت لیکر آئی میں نے پوچھا "کس نے دی ہیں یہ چیزیں؟"

کنیز کی بیباکی دیکھو۔ کہنے لگی۔ ملاّں ٹائپ کے ہیں نہ۔ شائد تمہارے منگیتر ہیں۔ انہوں نے بھیجی ہیں۔"

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ کمبخت نے کیسی بیہودہ بات کہی تھی۔ اس نے میز پر میرے سامنے پھل اور شربت رکھتے ہوئے کہا۔ خدا تے موسیٰ کی قسم جوڑی اچھی ہے ہیں تو اسلامی ملاں۔ مگر بڑے گبھرو جوان ہیں۔"

وہ کنیز یہودن تھی۔ میں نے کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا "بکواس مت کرو۔"
کنیز نوجوان اور شوخ تھی۔ اس نے کہا۔ آپ کو شاید یہ خیال ہوا کہ کہیں میری نظر نہ لگ جائے نہیں۔ میری نظر ایسی نہیں ہے۔ بالکل اطمینان رکھو تم۔"

اب میں کیا کہتی اس شریر سے خاموش ہو کر پھل کھاتے اور شربت ——
شوخ یہودن ایک دم چونک پڑی۔ اس نے کہا۔ ارے تمہاری صورت — سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ وہی — ہو بہو وہی — اوہ تم وہی ہو۔"

میں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ "خاموش رہ" اور جلدی سے وہاں سے نکل آئی۔ بھائی جان اور رشید بھی فارغ ہو گئے تھے۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ رشید نے قہوہ خانے والے کو قیمت ادا کی اور ہم تینوں وہاں سے نکل آئے۔ کچھ دیر اور گھوم کر واپس لوٹے۔ رشید ہمیں باغ تک پہنچا کر چلے گئے۔

انتیسواں باب ۲۹

دعوت

جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ یہ دوسری ملاقات تھی۔ تیری ان سے۔"

زرقا۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ باقی قصہ رات کو سناؤں گی۔"

جمیلہ۔ بس نخرے نہ کر سناتے جا۔"

زرقا۔ تو تو ہو گئی ہے۔ پگلی جانتی ہے کتنی دیر سے قصہ کہہ رہی ہوں۔ آخر آدمی ہوں۔ دماغ چکرانے لگا۔"

جمیلہ۔ تو آدمی ہے۔ آدمی نہ آدم زاد۔ پری زاد ہے یا حور زاد۔ واقعی تھک گئی ہو گی۔ اچھا اور باتیں کر۔"

زرقا۔ واقعی تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ باتیں کرنے کی طاقت ہوتی تو قصہ ہی نہ کہتی۔ اب خاموش رہ۔"

جمیلہ۔ اچھا میں خاموش رہوں گی۔ مگر ایک بات اور بتا دے۔ ملاّں ریجھ بھی گیا ہے۔"

زرقا۔ مار کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

جمیلہ۔ اجی ریجھ ہی گیا ہو گا۔ ہا بیچارہ ملاّں۔ بس اب اس کا پڑھنا پڑھانا تو ہو چکا۔ چلا تھا مولوی بننے۔ بن گیا ایک حسین ساحرہ کا غلام۔"

زرقا نے اس کی ران میں چٹکی بھری۔ وہ ایک دم اچھل پڑی اور زبان آ تو

سہلاتے ہوتے بولی۔ کمبخت کس زور کی چٹکی لی ہے۔ جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔

اس وقت زرقا کو اس کی امی نے پکار لیا اور وہ اٹھ کر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دوڑی چلی گئی۔ رات کو عشا کی نماز پڑھ کر دونوں پھر ایک جگہ جمع ہوئیں۔ جمیلہ نے کہا "بڑی مشکل سے خدا خدا کر کے دن کاٹا ہے۔ لے اب سنا"

زرقا نے بیان کیا۔

"نمائش ختم ہو گئی۔ جو لوگ نمائش دیکھنے آتے تھے وہ چلے گئے۔ سوداگر بھی رخصت ہو گئے۔ اور وہ میدان جس میں نمائش ہوئی تھی اور جو ایک مہینہ سے بھی زیادہ عرصہ تک لوگوں سے پٹا رہا تھا۔ خالی ہو کر ویرانہ بن گیا تھا۔ تو نمائش ختم ہونے سے پہلے ہی تاتا زا چلی گئی تھی۔ نمائش ختم ہونے کے بعد ہم بھی باغ سے گھر چلے آئے یہ ایک مہینہ ہوا کی طرح گذر گیا۔ اس مہینہ کے دن اور رات آتے اور جاتے معلوم ہی نہ ہوئے

جمیلہ۔ ٹھہر۔ ایک بات نہیں بتائی تو نے۔

زرقا۔ کیا؟

جمیلہ۔ تیری تصویر کا کیا ہوا؟"

زرقا۔ بھائی جان نے بتایا تھا کہ نمائش کے آخر میں وہ تصویر ابن مشعل نے چار ہزار درہم میں خرید لی۔"

جمیلہ۔ تو نے بڑی غلطی کی۔"

زرقا۔ کیا غلطی کی۔؟"

جمیلہ۔ اس جوہری کے پاس چلی جاتی جو تجھے دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ تجھے جواہرات کے زیورات پہنا دیتا۔ اور وہ ہزاروں دینار کے زیورات پہن چلی آتی۔ اس سے قرضہ ادا کر دیتی۔

زرقا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب مجھے بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے بڑی غلطی کی کہ اس جوہری کے پاس نہ گئی۔ واقعی اگر وہ ٹھیک کہتا تھا اور جواہرات کے زیورات مجھے دیدیتا تو وہ واقعہ پیش نہ آتا جس نے مجھے رسوا کر دیا۔

جمیلہ:۔ اچھا شروع کر داستان۔"

زرقا نے بیان کیا۔

ہم نہایت اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ بھائی جان اور رشید میں دوستی ہوگئی۔ رشید اکثر ہمارے گھر آتے۔ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ مگر کچھ ایسے خود دار اور غیور قسم کے آدمی تھے کہ بھائی جان کے اصرار کرنے پر بھی نہ کھاتے تھے۔ نہ پھل نہ میوے بلکہ کبھی کبھی خود پھل اور میوے لے آتے تھے۔

امی جان کو وہ بہت پسند آگئے تھے۔ انہیں اپنا بیٹا سمجھنے لگیں تھیں۔ ان سے پردہ بھی کم کرتی تھیں۔ باتیں بھی کر لیتی تھیں۔ ابا جان بھی انہیں بہت ہی نیک اور دیندار آدمی سمجھتے تھے۔ بھائی جان کے وہ دوست تھے ہی۔

جمیلہ۔ اور تیرے۔

زرقا۔ خاموش بیٹھی سُنے جا۔ ایک بات یاد رکھ۔ بات کاٹنے والے سے گرہ کاٹنے والا اچھا ہوتا ہے۔

جمیلہ نے ہنس کر کہا "یہ بات، تیرے ملّاں نے تجھے بتائی ہوگی"۔

زرقا نے پھر اُس کے چٹکی لی۔ جمیلہ نے سسکی بھر کر کہا "چڑیل" "کس زور سے چٹکی لیتی ہے۔ اچھا کہہ"۔

زرقا نے بیان کیا۔

کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ میرا ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ وہ بھائی جان کے کمرہ میں آکر بیٹھ جاتے۔ بھائی جان کا کمرہ تو جانتی ہی ہے ایسے موقع پر ہے جو زنانہ میں بھی شامل ہے اور مردانہ میں بھی مجھے خبر نہ ہوتی۔ ان کے آنے کی اور میں کمرہ میں جا نکلتی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتے۔

جمیلہ نے حسین قہقہہ لگا کر کہا۔ خوب طریقہ اختیار کیا تھا تو نے انہیں رام کرنیکا۔

زرقا۔ مردار۔ سنتی ہے یا نہیں۔

جمیلہ۔ سناتے جا۔

زرقا نے کہنا شروع کیا۔

وہ کئی مرتبہ تحفے لا چکے تھے۔ اور ہمارے گھر کا پانی تک انہوں نے نہیں پیا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھ پر احسان کیا۔ غنڈے یہودیوں سے مجھے بچایا تھا۔ نمائش میں میری اور بھائی جان کی تواضع کی تھی۔ کئی مرتبہ تحفے لا چکے تھے

میں بھی ان کی تواضع کرنا چاہتی تھی۔ امی جان بھی چاہتی تھیں۔ بھائی جان کئی مرتبہ ان کی دعوت کر چکے تھے۔ مگر انہوں نے عذر کر دیا تھا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ میں بھائی جان کے کمرہ میں جا نکلی۔ وہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بولے "کچھ کہنا چاہتی ہو مجھ سے؟"

میں گم سم ہو کر کھڑی رہ گئی تھی۔ ان کے پوچھنے پر ہمت ہوئی۔ میں نے کہا۔ یہ آپ ہم سے پرہیز کیوں کرتے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ میری یہ مجال نہیں ہے۔"

میں۔ اچھا تو آج رات کا کھانا آپ یہیں کھائیں۔"

وہ۔ میں ایک مفلس طالبعلم ہوں۔ اگر اچھے کھانوں کی چاٹ پڑ گئی تو کیا ہوگا؟"

میں دل میں ہنسی کہ نرے ملّاں ہی نہیں ہیں یہ ظرافت کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ میں نے فی البدیہہ کہا۔ روزانہ یہیں کھا لیجئے گا۔"

وہ۔ میں چند ہی روز میں بار ہو جاؤں گا۔"

میں۔ یہ آپ کا خیال ہے — اچھا دعوت منظور کر لیجئے۔"

وہ — منظور ہے۔"

"شکریہ۔ میں نے شوخی سے کہا۔ اور وہاں سے چلی آئی۔ سیدھی امی جان کے پاس پہنچی۔ انہیں بتایا کہ رشید آئے ہیں۔ اور ابھارا کہ آج ان کی دعوت کر دو۔ وہ رشید کے پاس گئیں۔ ان سے دعوت کو کہا۔ وہ مجھ سے اقرار کر ہی چکے تھے۔ انہوں نے دعوت منظور کر لی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر وہ آ گئے۔ بھائی جان کھانا لینے گئے۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں ان کے پاس کمرہ میں پہنچی۔ انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔ میں نے کہا۔ ابھی کھانا نہیں ملے گا آپ کو۔

انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا "کیوں —؟"

میں شوخی سے کہا۔ ہماری مرضی۔"

وہ — مرضی عورتوں ہی کی چلتی ہے۔"

میں۔ آپ اس بات کے قائل ہیں تو اب مل جائے گا کھانا۔"

وہ ۔شکریہ ۔ ایک بات بتائیے گا "

میں ۔ ضرور "

وہ ۔ یہ تصویر کھنچوانے کا شوق کیوں پیدا ہوا تھا تمہیں ۔؟"

اب بتا کیا جواب دیتی میں انہیں ۔ میں شرمندہ ہوگئی ۔ انہوں نے کہا ۔ معاف کرنا ، مجھے یہ بات پوچھنی نہیں چاہیئے تھی ۔

میں ۔ ضرور پوچھنی چاہیئے تھی ۔

اس کے بعد میں نے مختصراً انہیں سب حال سنایا انہوں نے دانت پیس کر کہا ۔ یہ یہودی بہت ہی بُرے لوگ ہیں "

مجھے خوف ہوا کہ کہیں بھائی جان نہ آ جائیں میں وہاں سے آئی ۔ اور باورچی خانہ میں پہنچی ۔ کھانا اتار اجا چکا تھا ۔ بھائی جان لیکر چلے ۔ میں وہیں بیٹھ گئی ۔ تھوڑی دیر میں کھانا کھا کر چلے گئے ۔

نمائش کو ختم ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے ۔ ایک روز ابا جان نے بتایا کہ وزیراعظم شہر تازا میں جا رہے ہیں ۔ انہیں بھی ساتھ لے چلیں گے ۔ امی جان بھی شہر تازا دیکھنا چاہتی تھیں ۔

اور میں بھی ۔ میں دراصل وہاں جا کر تجھ سے ملنا چاہتی تھی ۔ امی جان نے ابا جان سے کہا ۔ ہم بھی چلتے ہیں "

ابا جان بولے چلو ۔ وزیراعظم کی بیوی بچے بھی جا رہے ہیں "

امی جان ۔ مگر وہاں جا کر ٹھہریں گے کہاں "

ابا جان ۔ ابن مشعل کے مہمان ہوں گے ۔ ہم سب لوگ ۔ سُنا ہے اس کا محل اچھا خاصہ قلعہ ہے "

غرض یہ بات طے ہوگئی ۔ تجھ سے ملنے کی تو خوشی تھی ۔ لیکن دل وہاں جانے کو نہیں چاہتا تھا ۔ سفر کی تیاری شروع ہوگئی اور ایک روز ہم تازہ روانہ ہو گئے ۔

تیسواں باب ۳۰

ابنِ مشعل کا قصر

زرقا نے بیان کیا۔

تازہ۔ شہرِ فارس سے ایک منزل کے فاصلہ پر تھا۔ ہمارا قافلہ اچھا خاصہ ہو گیا۔ تھا۔ وزیرِ اعظم تھے۔ ان کے بیوی بچے تھے۔ کنیزیں اور غلام تھے۔ فوجی سپاہی تھے۔ ہم تھے غرض کئی سو آدمیوں کا قافلہ تھا۔ اگر ہم تیزی سے سفر کرتے تو ایک ہی دن میں شہر تازہ میں پہنچ جاتے۔ لیکن ہمارے سب ساتھی شکاری تھے۔ شکار کھیلتے چل رہے تھے۔ روزانہ دو چار میل کا سفر کر لیتے تھے۔ باقی وقت شکار میں گزار دیتے تھے۔

جب کسی جگہ قیام ہوتا تو عورتوں کے خیمے ایک احاطہ میں نصب ہوتے اور ان خیموں سے کچھ فاصلہ پر چاروں طرف مردانہ خیمے رہتے۔ وزیرنی بڑی نیک اور ہنس مکھ تھیں۔ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگیں۔ یا تو ہمارے خیمہ میں آ جاتیں یا مجھے بُلا لیتیں اور گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔ مجھے بھی ان سے بڑی انسیت ہو گئی۔

چار یا پانچ روز کے بعد ہم عصر کے وقت سے کچھ پہلے شہر تازہ میں داخل ہوئے اگرچہ تازہ اچھا خاصہ شہر تھا۔ لیکن فاس کے مقابلہ میں بے حقیقت تھا۔ وزیرِ اعظم کے آنے کی اطلاع وہاں پہلے پہنچ چکی تھی۔ ان کا استقبال اچھے پیمانہ پر کیا گیا۔ لیکن مسلمانوں سے زیادہ یہودی استقبال میں تھے۔

ہم ایک بڑی سڑک پر سے گذر کر ایک قلعہ کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ

خوب سجایا گیا تھا۔ اور وہاں بے شمار آدمی استقبال کے لیے موجود تھے۔ اس روز میں، ور وزیرنی دونوں ایک ہی گاڑی میں تھیں۔ وزیرنی نے کہا۔ یہ ابن مشعل کا عالیشان محل ہے۔

کچھ دیر تک سواری پھاٹک پر رکی۔ شاید اس لیے کہ ابن مشعل یا اس کے کارکنوں سے وزیر اعظم اور ابا جان مل رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جلوس کی صورت میں سواری بڑھی۔ میں گاڑی کے روزنوں میں سے جھانک کر دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایسے میدان کو طے کر رہے تھے۔ جس کے چاروں طرف عمارتیں تھیں۔ میں نے داہنی طرف بہت گھوڑے دیکھے۔ قیاس سے یہ سمجھ لیا کہ یہ ابن مشعل کا اصطبل ہے۔

گاڑی ایک قصر کے دروازہ پر رکی۔ وزیرنی اور میں اتریں۔ امی جان اور دوسری عورتیں اور لڑکیاں بھی اتر کر ہمارے پاس ہی آگئیں۔ بیشمار کنیزیں ہمارے استقبال کے لیے دروازہ پر کھڑی تھیں۔ ان میں دو یا تین تو سن رسیدہ تھیں ورنہ باقی سب کمسن۔ حسین۔ اور شوخ وطرار تھیں۔ نہایت عمدہ لباس اور سونے کے زیورات پہنے تھیں۔ سچ پوچھو تو ان کے لباس قیمتی تھے۔

ہمارے لباسوں سے اور ان کے زیورات ہمارے زیورات سے کہیں اچھے اور وہ ہمیں قصر کے اندر لے گئیں۔ بڑا عالیشان قصر تھا۔ قصر کے بیچ میں خوشنما باغیچہ تھا۔ باغیچہ کے دوسرے سرے پر چبوترہ کے سامنے کی دیوار قد آدم تھی۔ غالباً یہ پردہ کی دیوار تھی۔ اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہودیوں میں تو پردہ کا رواج نہیں یہ پردہ کی دیوار کیوں ہے۔

چبوترہ پر چڑھنے کے لیے تھوڑے فاصلہ پر لمبی لمبی اور چوڑی چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک سیڑھیوں کی طرف تو کچھ کنیزیں وزیرنی اور ان کے بچوں کو لیکر چلیں۔ چند کنیزیں دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو لے کر دوسری سیڑھیوں کی طرف چلیں۔ اور کچھ کنیزیں مجھے اور امی جان کو لیکر تیسری سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھ کر چبوترہ پر پہنچیں۔ میں نے دیکھا۔ دونوں بازوؤں کی طرف کچھ کچھ فاصلہ سے پردہ قدِ آدم دیواریں بھی بنی تھیں۔ سامنے عمارت تھی۔ بڑی عالیشان۔

جب ہم عمارت کے اندر داخل ہوئیں تو دیکھا کئی کمرے تھے۔ اور ہر کمرہ بہت ہی خوب سجا ہوا تھا۔ خوشنما قالینوں کے فرش تھے۔ خوبصورت میزیں اور کرسیاں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ میزوں پر نہایت عمدہ

میزپوش تھے۔ غرض ہر چیز نہایت اچھی اور قیمتی تھی۔ امیرانہ ٹھاٹھ تھے۔ ہر کمرہ میں گدہ دا صوفے تھے۔ امی جان تو صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ اور میں کمروں کا جائزہ لیتی پھرنے لگی۔ کنیز بھی امی جان کے پاس ہی رہ گئیں۔

تین کمرے خوابگاہ کے تھے۔ ایک کمرہ میں دو مسہریاں چاندی کے پائے کی تھیں۔ میں سمجھ گئی۔ یہ امی جان کے لیے ہے۔ دوسری طرف کے خوابگاہ کے کمرہ میں ایک مسہری تھی۔ وہاں ایک میز ایک کرسی تھی۔ اس پر مردانہ سامان رکھا تھا۔ یہ خوابگاہ بھائی جان کے لیے تھی۔ تیسری طرف ایک کمرہ خوابگاہ کا اور تھا۔ اس کی مسہری نہایت پُر تکلف تھی۔ اس میں ریشمی جالی کی نہایت خوبصورت مچھردانی لگی ہوئی تھی۔ اس کی ڈوریں کلابتوں کی تھیں۔ ایک خوبصورت صوفہ تھا۔ ایک بڑی میز تھی۔ اس میں سنگھاردان تھا۔ ایک بڑا قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ میز کے سامنے دو کرسیاں چاندی کی پڑی تھیں۔ جن پر پھولدار ریشم کے گدے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے آئینہ میں جھانکا۔ مجھے اپنا عکس نظر آیا۔ اگرچہ اس وقت اس کمرہ میں میں تنہا تھی۔ میرے سینے سے دوپٹہ ڈھلک گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُسے اُوپر کو کھینچ لیا۔ اور آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی۔

میں نے کمرہ کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ دیکھتی ہوں تو وہاں میری تصویر سونے کے فریم میں لٹکی ہوئی ہے۔ تصویر ایسی بنائی تھی۔ اس کمبخت مصوّر نے کہ اسے دیکھکر خود میرا جی دیکھتے رہنے کو چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تصویر مجھے دیکھ رہی ہے۔ اور اب باتیں کرنے ہی والی ہے۔

بھائی جان سے مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ تصویر ابن مشعل نے خریدی ہے۔ لیکن یہ خیال آیا کہ اس کمرہ میں یہ تصویر کیوں ہے؟ میں نے خود ہی یہ سمجھ لیا کہ شاید یہ تصویر پہلے سے اسی کمرہ میں لٹکی ہو گی۔ یا تو کنیزوں کو اسے اتارنے کا خیال نہیں رہا۔ یا انہوں نے کسی مصلحت سے نہیں اتاری۔

میرا خوابگاہ کا کمرہ بہت اچھا تھا۔ اس کے پردوں اور مسہری کی جھالروں میں ایسا عطر بسایا ہوا تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو نہایت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

کمرہ کی چھت میں چاندی کا ایک بڑا جھاڑ لٹکا ہوا تھا جس میں بیس پچیس فانوس تھے۔ اور ہر فانوس میں موٹی موٹی بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ کمرہ بہت پسند آیا۔ میں

مسہری پر لیٹ گئی۔ اس پر بستر بڑا ہی گدگدا تھا۔

تھوڑی دیر میں آرام کر کے اٹھی اور امی جان کے پاس آئی۔ دیکھا تو بھائی جان اور ابا جان بھی آ گئے تھے۔ اور تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ابا جان نے مجھ سے پوچھا "زرقا پسند آیا یہ محل"

میں نے عرض کیا۔ اس میں پسند نہ آنے کی کونسی چیز ہے ہر کمرہ میں امیرانہ ٹھاٹ ہے۔ میں سارے کمرے دیکھ آئی ہوں۔ ایک ایک کمرہ بڑھ چڑھ کر سجا ہوا ہے۔ اور کمروں کی یہ سجاوٹ اس حصہ کی ہے جو ہمارے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم کے کمرے خدا جانے کس قدر آراستہ اور پیراستہ ہوں گے۔

ابا جان۔ ان کے اور ہمارے کمرے تو قریب قریب یکساں ہی سجائے گئے ہیں۔ البتہ وہ قصر جس میں ابن مشعل خود رہتا ہے۔ بہت ہی زیادہ سجا ہوا ہے۔ ایسی آراستگی بادشاہوں کے محلوں کی بھی نہ ہو گی۔

میں۔ یہ سب دولت کے کھیل ہیں۔ ابن کے پاس بے شمار دولت ہے۔ اس کے مقروض عام آدمی ہی نہیں۔ امیر۔ رئیس۔ جاگیر دار۔ وزیر اور سلطان تک ہیں۔

ابا جان۔ ہاں آج مغرب اقصیٰ میں اس کے برابر کوئی دولت مند نہیں ہے۔ وہ عام لوگوں کو قرضہ دیتا بھی نہیں۔ بڑے بڑے آدمیوں کو دیتا ہے۔ البتہ مخیر ہے۔ غریب قرضہ لینے آتے ہیں تو انہیں ان کی ضرورت کے مطابق خیرات کے طور پر دیدیتا ہے۔

میں۔ تعجب ہے۔ ورنہ یہودی تو پیسہ کے غلام ہوتے ہیں۔

ابا جان۔ ابن مشعل میں کچھ انسانیت ہے اور پھر ہر قوم میں ایک ہی قسم کے سب لوگ نہیں ہوتے۔ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ برے بھی ہوتے ہیں۔

میں نے بھائی جان سے کہا۔ "آؤ میں تمہیں کمرے دکھلاؤں"

وہ میرے ساتھ چلے اور میں انہیں کمرے دکھانے لگی۔

اکیتسواں باب ۳۱

ابنِ مشعل

زرقا نے بیان کیا۔

" جس عمارت میں ہم جا کر ٹھہرے۔ اس کے دوسری طرف بھی ایک باغیچہ تھا میرے خوابگاہ کے کمرے کی ایک کھڑکی اس باغیچہ کی طرف کھلتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر میں اس کھڑکی میں جا بیٹھی۔

ابن مشعل کی طرف سے ہماری بڑی مدارت ہو رہی تھی۔ کھانا۔ پھل اور میوے اس افراط سے آتے کہ بچ جاتے۔ اور ہم واپس کر دیتے۔ میں اکثر وزیرنی کے پاس چلی جاتی اور کبھی کبھی وزیرنی بھی ہمارے یہاں آجاتیں۔

دو تین روز کے بعد میں تجھ سے ملنے گئی۔ میری سواری بڑے احتشام سے چلی کئی کنیزیں ساتھ گئیں۔ کئی غلام جلو میں چلے۔ اور ابن مشعل کے کئی سوار گاڑی کے آگے پیچھے ہو گئے۔ اس شان سے تیرے گھر پہنچی۔ میں نے دیکھا کہ تیرے ابا اور دوسرے عزیز ان سواروں اور غلاموں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔

جب انہیں میرا نام بتایا گیا۔ تب ان کے چہرے بشاش ہوتے۔ میں گاڑی سے اتر کر تیرے پاس پہنچی تو۔ تو بھی حیران ہو رہی تھی۔"

جمیلہ نے کہا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ ابن مشعل کے غلام اور سوار آئے ہیں تو ہک دہک رہ گئی۔ اس کے سواروں کا آنا معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب تیرے

آنے کی خبر سُنی تو اول یقین نہ آیا۔ ابن مشعل کی مہمان ہو کر تازہ میں آئی ہو گی۔ دوسرے یہ خوف ہوا کہ اس میں کوئی چال نہ ہو۔ کیونکہ ابن مشعل کی کٹنیاں تازہ میں یہ دیکھتی پھرا کرتی تھیں کہ کون کون سی لڑکیاں کس قدر حسین ہیں۔ معلوم نہیں ابن مشعل حسین لڑکیوں کی فہرست تیار کر رہا تھا کیا۔ صورت شکل کی میں اچھی تھی مجھے ڈر ہوا کہ کہیں کٹنیوں نے میرا ذکر تو ابن مشعل تک نہیں پہنچا دیا ہے۔

لیکن پھر بھی میں تیرے استقبال کے لیے دوڑی آئی۔"

زرقا نے بیان کیا۔

میں تجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ تو نے پوچھا۔ میں کیسے ابن مشعل کے قصر میں آگئی۔ میں نے بتا دیا کہ وزیر اعظم آرہے تھے۔ وہ ابا جان کو لے آئے ہم بھی ان کے ساتھ چلے آئے۔ تو نے اس ملاقات میں یہ نہیں بتایا تھا کہ ابن مشعل بُرا آدمی ہے اس کی کٹنیاں تازہ میں حسین لڑکیوں کو دیکھتی پھرتی رہتی ہیں۔ اگر تو مجھے اس بات سے آگاہ کر دیتی تو میں ہوشیار ہو جاتی۔ یا تو وہاں سے فوراً چلی آتی یا احتیاط کرنے لگتی۔ اور وہ واقعہ پیش نہ آتا۔ جسے تو سن رہی ہے۔

میں تجھ سے مل کر چلی آئی۔ تجھے قصر میں بلایا تو تو آئی نہیں۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔

جمیلہ نے کہا۔ میں مجبور تھی۔ اگر میں تجھے ابن مشعل کی حرکتوں سے آگاہ کر دیتی اور اس ناہنجار کو یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ مجھے زبردستی اپنے قصر میں اٹھوا منگاتا اور میرے خاندان والوں کو قید کر دیتا۔ تازہ کا حاکم اس کا پروردہ تھا۔ وہ ابن مشعل کے مقابلہ میں کسی کی داد فریاد ہی نہ سنتا تھا۔ ابن مشعل بڑا بدکار تھا۔ اس نے شہر کی کئی معصوم لڑکیوں کی جوانیاں لوٹ کر انہیں برباد کر دیا تھا۔ اگر ان لڑکیوں کے سرپرستوں نے حاکم سے شکایت کی تو الٹی آفتیں گلے پڑ گئیں۔ حاکم نے انہیں ہی شکنجہ میں کس دیا۔ اس سے لوگوں پر ابن مشعل کا رعب اور خوف طاری ہو گیا۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں تجھ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

زرقا نے بیان کیا۔

"میں تجھ سے مل کر واپس لوٹ آئی۔ دو کنیزیں جو زیادہ حسین۔ کمسن اور شوخ تھیں۔ مجھ سے بہت گھل مِل گئیں۔ وہ زیادہ تر میرے ہی پاس رہتیں ابن مشعل اکثر

وزیر اور وزیرنی کو دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ابا جان اور امی جان کو تحفے بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز اُس نے بڑے قیمتی ریشمی تھان بھیجے اور میرے لیے ایک بہت ہی خوشنما کپڑے کا جوڑا بھیجا۔ میرے دِل میں آئی کہ اسے پہن کر دیکھوں میں نے غسل کیا اور سنگھار کرکے اسے پہنا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر دیکھا۔ تو میں کچھ اور ہی بن گئی تھی۔ اس جوڑے کے پاجامہ قمیض اور دوپٹہ میں سنہرے پھول تھے۔ دوپٹہ میں چوڑی سنہری لیس ٹنکی ہوئی تھی۔ اس لباس نے مجھے پریوں سے بھی بڑھ کر بنا دیا تھا۔ میں نے امی جان کو سلام کیا تو وہ بھی دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کئی منٹ تک تکتی رہیں۔

ان دونوں کنیزوں نے میری بڑی تعریف کی کہنے لگیں۔ اگر جواہرات کے زیورات پہنو تو بالکل حور بن جاؤ۔

میں نے کہا۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ آج تم پھولوں کے زیور پہنو۔ اور تاج اوڑھو۔ دیکھو کیسی معلوم ہو گی۔

مجھے پھولوں سے بڑا شوق و شغف تھا۔ میرے دل میں بھی آئی کہ پہن کر تو دیکھوں میں ان کے ساتھ دوسری طرف باغیچہ میں چلی گئی۔ یہ باغیچہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ابن مشعل کے محل تک چلا گیا تھا۔ میں نے اور دونوں کنیزوں نے پھول توڑے اور زیورات بنائے۔ میں تاج بنایا۔ زیورات پہنے اور تاج سر پر رکھا۔ کنیزیں مجھے کھینچتی ہوئی حوض کے پاس لے گئیں۔ میں نے پانی میں جھانک کر دیکھا تو جھجک گئی۔ واقعی حُور معلوم ہوتی تھی۔

ایک کنیز تو میرے پاس رہ گئی۔ اور ایک کنیز مزید پھول لانے کے بہانے سے چلی گئی۔ جو کنیز میرے پاس رہ گئی تھی۔ وہ میرے حسن کی تعریف کے پل باندھنے لگی۔ جتنا میں اسے منع کرتی اتنا ہی وہ اور تعریف کرتی جب میں بگڑنے لگی۔ تب اُس نے دوسری باتیں شروع کیں۔

میں بڑے اطمینان سے پیر لٹکائے حوض کے کنارے پر حوروں کی شان سے بیٹھی تھی۔ دفعتاً وہ کنیز جو میرے پاس بیٹھی تھی۔ اُٹھ کر بڑے ادب سے کھڑی ہوگئی۔ میں سمجھی وہ شرارت سے میرا ادب کر رہی ہے۔ میں ہنس پڑی۔ اسی وقت قدموں

کی جاپ ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ تو ایک یہودی چلا آرہا تھا۔ نہایت فاخرہ لباس پہنے مجھے خیال ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔

میں نے حافظہ پر زور دیا۔ یکایک یاد آگیا۔ اس یہودی کو میں نے اپنے باغ میں دیکھا تھا۔ یہ وہی یہودی تھا۔ جس نے مجھے موتیوں کا ہار دیا تھا۔ بلیساختہ میری زبان سے نکلا۔" تم ـــ

وہ آنکھیں پھاڑے بے تحاشہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں انسان نہیں کوئی اور مخلوق تھی۔ مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ میں نے کہا کیسے آئے تم یہاں ؟"

کنیز نے آہستہ سے کہا۔ یہ ہمارے آقا ہیں"۔

میں کون ۔ ابن مشعل ۔

وہ ابن مشعل ہی تھا۔ اس نے کہا۔ زرقا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اتفاقیہ یہاں آگیا۔ میرا ہی نام ابن مشعل ہے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ابن مشعل جس کی دولت کا شہرہ تھا۔ جس نے میرے باپ کو بلا سود کے روپیہ قرض دیا تھا۔ جس کے ہم مہمان تھے۔ جو ہماری مدارت کر رہا تھا جس نے ہمارے لیے تحفے بھیجے تھے۔ میرے سامنے خادموں کی طرح کھڑا تھا۔

اس وقت بھی مجھے خیال نہیں رہا کہ میں بے نقاب ہوں۔ اور پھولوں کی ملکہ بنی ہوئی ہوں۔ اس کی گرم نظریں میرے رخساروں پر پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ مجھے دیکھ کر کچھ از خود رفتہ ہو گیا ہے۔

اچانک۔ مجھے بے نقاب ہونے کا خیال آیا۔ میں نے دوپٹہ کا آنچل کھینچ لیا۔ مگر دوپٹہ بہت ہی باریک تھا۔ میرے چہرہ کو نہ چھپا سکا۔ میں شرم سے گڑیا بن کر رہ گئی۔ ابن مشعل نے کہا۔ زرقا! کیا میری ایک درخواست منظور کر دگی ؟

میں نے باریک دوپٹہ کے نیچے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ کہیئے"۔

ابن مشعل۔ میری تمنا ہے کہ تمہیں چند جواہرات کے زیورات پہنا کر دیکھوں۔

میں نے اس کا قطع کلام کر کے کہا۔ مہربانی کیجئے۔ میں زیورات پہننے کی عادی نہیں ہوں۔

ابن مشعل۔ مجھے معلوم ہے۔ لیکن کیا اگر تمہارے ابا جان تم سے کوئی بات کہیں تو نہ مانو گی۔

میں چپ ہو گئی۔ اُس نے اپنی عبا کی جیب میں سے چاندی کی ایک ڈبیہ نکالی اور کنیز کو دی۔ کنیز نے کھولی۔ اس میں کئی زیور تھے۔ ہار۔ گلو بند۔ دست بند اور ایک تاج یہ سب چیزیں جواہرات کی تھیں اور قیمتی تھیں۔

کنیز میری طرف چلی۔ میں نے اسے گھورا۔ ابن مشعل نے کہا۔ منظور کر لو۔ میری یہ درخواست زرتا۔

یہ میری کمزوری تھی کہ میں انکار نہ کر سکی۔ کنیز نے وہ سب چیزیں مجھے پہنا دیں۔ تاج بھی اڑھا دیا۔ اور شوخی سے میرے چہرے سے دوپٹے کا آنچل الٹ دیا۔ ابن مشعل مجھے دیکھ کر بت کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس سے بات کرنی دشوار ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ میرا حسن بے پناہ ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو دیکھ کر خود ششدر رہ گئی۔ جواہرات نے میرے چہرے میں بجلیاں بھر دیں۔ میں زیورات اتارنے لگی۔ ابن مشعل چونکا۔ اسنے کہا۔ ان زیورات کو مت اتارو۔ تم نے میری یہ درخواست منظور کی ہے۔ میں نے یہ زیورات تمہاری نذر کیے۔

یہ کہہ کر وہ چلنے لگا۔ میں نے کہا" سنیئے"

وہ کھڑا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ یہ زیورات لیتے جایئے"

ابن مشعل۔ مجھے امید ہے تم مجھے آزردہ نہ کرو گی"

میں۔ مگر میں اتنے قیمتی زیور کیسے لے سکتی ہوں"

ابن مشعل۔ کنیزیں تمہاری امی جان کو سمجھا دیں گی اور میں تمہارے ابا جان سے کہہ دوں گا۔

وہ چلا گیا۔ میں عجب کشمکش میں پڑ گئی۔

بتیسواں باب ۳۲

ترغیب

زرقا نے بیان کیا۔

میں یہ سوچتی ہوئی کہ امی جان سے کیا کہوں گی۔ واپس لوٹی۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ زیورات اتار ڈالوں۔ چنانچہ میں نے اتارنے چاہے مگر جو کنیز میرے ساتھ تھی اُس نے روک دیا۔ اور کہہ دیا کہ میں تمہاری امی جان کو سمجھا دوں گی۔

چنانچہ وہ مجھ سے آگے بڑھ گئی۔ دوسری کنیز جو پھول لینے گئی تھی آگئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ پھول لینے نہیں گئی تھی۔ بلکہ ابن مشعل کو بلانے گئی تھی۔ وہ دونوں کنیزیں جو مجھ سے گھل مل گئی تھیں۔ ابن مشعل کی جاسوسہ تھیں۔ وہ میرے کردار کی میری باتوں کی اور میرے طور طریق کی اسے اطلاع دیتی رہتی تھیں۔

جو لباس ابن مشعل نے میرے لیے بھیجا تھا اس کے متعلق اس نے کنیزوں کو ہدایت کر دی تھی کہ جب میں وہ لباس پہنوں وہ مجھے پھولوں کے زیورات پہنے دیکھنا چاہتا تھا۔

جب اسے کنیز نے جاکر اطلاع دی تو وہ میرے لیے زیورات بھی لیتا آیا۔

زیورات بہت قیمتی تھے۔ لیکن وہ ایسا مالدار تھا کہ اُس کے نزدیک انکی کوئی بھی حقیقت نہ تھی۔ وہ ایسے زیورات نہ معلوم کتنی لڑکیوں کو دے چکا تھا۔ اور لباس اور زیورات سے رغبت اور محبت کرنے والی نہ معلوم کتنی لڑکیاں اپنی جوانی اور

عصمت اس کی نذر کر چکی تھیں۔

مگر مجھے یہ باتیں اس وقت نہیں معلوم ہوئی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوئیں۔ اگر اس وقت معلوم ہو جاتیں تو میں اس کی ایک چیز بھی قبول نہ کرتی۔ اور ایک دن بھی اس کے قصر میں نہ رہتی۔

میں سوچتی آرہی تھی کہ نامعلوم امی جان مجھے کیا کہیں۔ کس قدر مجھ پر بگڑیں۔ میں نے پھر چاہا کہ زیورات اتار دوں مگر دوسری کنیز جو ساتھ ہو گئی تھی۔ اس نے روکا اور کہا "ان زیورات کو نہ اتاریئے۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت دیکھیے گا کس قدر دلکش اور پیاری ہو گئی ہے۔"

مجھے ان زیورات میں خود اپنی صورت بہت بھلی معلوم ہوئی تھی۔ اتارنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن امی جان کا خوف اتر وا رہا تھا۔ میں رک گئی۔ زیور نہیں اتارے۔ کنیز نے کہا۔ خدائے موسیٰ کی قسم حوریں آپ سے زیادہ حسین نہ ہوں گی۔ آپ کی پھولوں والی تصویر نے تمام مغرب اقصیٰ۔ افریقہ۔ اندلس اور پرتگال میں ہلچل مچا دی ہے۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ دنیا میں ایسی حسین لڑکی موجود ہے۔ ان کا خیال ہے یہ تصویر خیالی ہے۔"

میں نے یہ خود اپنے کانوں سے یہ باتیں سنی تھیں۔ ایک جوہری نے نمائش میں کہا تھا کہ اگر تصویر والی لڑکی موجود ہے اور مجھے جلوہ دکھا دے تو میں شیشہ والی الماری کے تمام زیورات اس کی نظر کر دوں۔ کنیز نے سچ ہی کہا تھا۔ میں چپ رہی۔ کنیز نے پھر کہا۔ ابن مشعل بڑا مالدار ہے۔ اس کی دولت کا حد و حساب ہی نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی یہودی لڑکی ایسی حسین نہیں ملی جو اس کی نظروں پر چڑھ جاتی اور وہ اس سے شادی کر لیتا ـــــ وہ ایسی حسین لڑکی کو اشرفیوں میں تول سکتا ہے۔ جیسی تم ہو۔"

مجھے طرارہ آگیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ خبردار! جو میرے سامنے ایسی باتیں کیں۔

وہ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ معاف کیجیے یا تو مجھے اپنا مطلب واضح کرنے میں غلطی ہوئی۔ یا آپ نے غلط مطلب سمجھا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ ایسی حسین یہودی لڑکی چاہتے ہیں۔ جیسی آپ ہیں۔ جسے دیکھنے والے حیران رہ جائیں۔ جس کے حسن کی دھوم مچ جائے۔

میں نے اسے تیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔" بکواس مت کر۔"

وہ چپ ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ سامنے سے کنیز کے ساتھ امی جان آتی ہوئی نظر آئیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں سہم گئی۔ جی چاہا کہیں بھاگ جاؤں مگر وہ مجھے دیکھ چکی تھیں۔ بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ سر جھکائے آہستہ چلتی رہی۔ مگر دل زخم خوردہ پرندے کی طرح اچھل رہا تھا۔

میں نے دل کڑا کر کے امی جان کی طرف دیکھا۔ وہ برہم نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ بلکہ ان کے چہرے سے خوشی کے آثار ظاہر تھے۔ میں سمجھ گئی کہ کنیز نے کوئی ایسی بات بنا کر کہی ہے جس سے وہ خفا نہیں ہوئیں۔ انہوں نے قریب آکر مجھے دیکھا۔ اور کہا۔ زرقا آج تجھے کسی کی ضرور نظر لگ جائے گی۔ دیکھ تو سہی تیرا چہرہ کس قدر جگمگا رہا ہے

انہوں نے یہ پوچھا ہی نہیں کہ یہ زیورات کہاں سے آئے۔ مجھے تعجب ہوا کہ امی جان جو کسی کی کوئی چیز معمولی سے معمولی بھی لینے کی روادار نہیں ہوتیں۔ اتنے قیمتی زیورات کے متعلق کچھ نہیں پوچھتیں۔ نہ معلوم ان سے کنیز نے کیا کہا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر مسکرا پڑی۔ انہوں نے محبت سے میری پیشانی چوم لی۔ وہ اکثر محبت میں ایسا ہی کیا کرتی تھیں۔

میں اور وہ ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ کنیزیں پیچھے ہو گئیں۔ جو بڑے کمرہ میں آگئے۔ امی جان نے کہا۔ بیٹی اب یہ زیورات اتار کر رکھ دو۔

میں نے زیور اتار کر انہیں دیدیئے اور انہوں نے صندوق میں رکھ دیئے وہ میں نے لباس اتار کر سادہ کپڑے پہن لیے۔ ایک کنیز نے کہا۔ خدائے موسیٰ کی قسم تم ہر لباس میں حسین معلوم ہوتی ہو۔ یہ لباس بھی کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اسی روز شام کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ ابا جان نے ابن مشعل سے کچھ قرضہ اور لیا ہے۔ جتنا میں چاہتی کہ قرضہ نہ لیا جائے اتنا ہی ابا جان قرضہ کو اور بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ اس قرضہ کے متعلق بھی انہوں نے کوئی دستاویز لکھ دی تھی۔

اگرچہ ہمیں ابن مشعل کے قصر میں بڑا آرام تھا۔ سیر کرنے کے لیے ایک چھوڑ دو باغیچے تھے۔ رہنے کے لیے عمارت کشادہ شاندار اور آرام دہ تھی۔ خدمت کے لیے

کنیزیں تھیں۔ کوئی فکر نہیں تھا۔ کوئی کام نہ تھا لیکن پھر بھی وہاں طبیعت نہ لگتی تھی۔ دِل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ میں نے تجھے وہاں بلایا۔ تیرے ماں باپ نے تجھے آنے ہی نہ دیا۔

میں نے امی جان سے چلنے کا تقاضا کیا۔ انہوں نے کہا۔ وزیرِ اعظم کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی چلیں گے۔ میں نے وزیرنی سے کہا۔ وہ بولیں ابھی سے گھبرا گئیں۔ تم یہاں۔ اور ٹھہرو۔"

جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ وزیرِ اعظم سلطان کے لیے کچھ اور قرضہ لینے کے لیے آئے ہوتے ہیں۔ بات چیت مکمل ہو گئی ہے۔ ایک دو روز میں روپیہ مل جائے گا تو چلیں گے۔

مجھے افسوس ہوتا تھا۔ یہ سن کر کہ ایک یہودی سے مسلمان ادنیٰ اور اعلیٰ وزیر اور سلطان قرضہ لیتے ہیں۔ کیوں نہیں وہ اپنے اخراجات اس قدر کم کر لیتے جس سے قرضہ کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

مجھے ابن مشعل نے جو زیورات دیئے تھے۔ ان کا علم ابا جان اور بھائی جان کو بھی ہو گیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان میں سے بھی کسی نے برا نہ مانا بلکہ ابن مشعل کی دریا دلی کی تعریف کی۔

ایک روز میں دوسری طرف کے باغیچہ میں گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ کچھ دیر روشوں پر گھوم کر حوض پر جا بیٹھی۔ میں تنہا تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ابن مشعل آ گیا۔ اس نے کہا۔ تمہاری طبیعت یہاں نہیں لگتی زرقا۔ تم جانا چاہتی ہو۔"

میں بے نقاب تھی۔ اور میں نے اس روز ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ میں شرم سے کٹ گئی۔ کچھ نہ بولی۔ اُس نے کہا۔ تمہارے رہنے کے قابل یہ قصر نہیں ہے نہ معلوم کیوں مجھے تم سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہارے قدموں پر اپنی ساری دولت ڈال دوں۔ مگر جانتا ہوں۔ تم بڑی غیور ہو قبول نہ کرو گی۔

اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ کاش مجھے کوئی تم جیسی لڑکی ملتی اور میں اس پر اپنی دولت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔ اور خیریت یہ ہوئی کہ واپس چلا

چلا گیا۔ میں بھی چلی آئی اور اس روز سے میں پھر اس طرف نہیں گئی۔

چند روز کے بعد ہم نے واپس چلنے کی تیاری شروع کی۔ ابن مشعل نے ہم سب کو تحفے دیئے۔ میرے لئے کئی ریشمی پھولدار اور خوشنما تھان بھیجے۔ ایک روز ہمارا قافلہ وہاں سے فاس کی طرف روانہ ہوا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایسی جیسے میں قید سے آزاد ہو کر چلی ہوں۔

تینتسواں باب

رشید کی خفگی

زرقا نے بیان کیا۔

"ہم فاس میں آ گئے۔ یہاں آکر مجھے اطمینان ہوا۔ اگرچہ یہ ہمارا گھر ابن مشعل کے قصر کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ مگر اُس قصر سے مجھے یہ گھر بدرجہا اچھا معلوم ہوا۔

ہمارے تعلقات وزیر اعظم کے گھرانے سے اچھے خاصے ہو گئے۔ وزیرنی کو مجھ سے کچھ ایسی انسیت ہو گئی کہ ہر ہفتہ یا تو وہ ہمارے گھر آجاتی تھیں یا مجھے اور امی جان کو بلا لیتی تھیں۔

اس میں شہر تازا سے آتے ایک مہینہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا۔ جو تھان ابن مشعل نے چلتے وقت دیئے تھے۔ اس میں سے امی جان نے میرے لیے کئی جوڑے کپڑوں کے بنا دیئے تھے۔ وہ ریشم بہت بڑھیا اور خوشنما تھا۔ جب میں ان میں سے کوئی جوڑا پہنتی تھی۔ تو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں جامہ زیب ہوں۔ جو کچھ پہن لیتی ہوں۔ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں شلوار بھی پہنتی ہوں۔ اور چست پاجامہ بھی اور دونوں ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن ریشمی کپڑے پہن کر تو میں کچھ اور ہی ہو جاتی تھی۔ خود مجھے وہ لباس اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس لباس میں مجھے دیکھنے والیاں دیکھتی رہ جاتی تھیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب میں ریشمی لباس پہنتی تو یہ خیال ہوتا کہ رشید ہوتے اور وہ یہ لباس پہنے مجھے دیکھتے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا یہ خیال عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ بُرا بھی تھا۔ مگر تھا۔ اور میں اس خیال کو بدل نہ سکی۔

ہم رجب کے مہینہ میں تازا سے واپس آئے تھے۔ اور اب رمضان شروع ہو گیا تھا۔ ہمارے یہاں سب روزے رکھتے تھے۔ میں بھی رکھتی تھی۔ روزے رکھنے سے میری صورت اور نکھر جایا کرتی تھی۔ چنانچہ اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ نکھر گئی تھی۔

رمضان کی انتیسویں تاریخ آگئی۔ میں روزہ افطار کر کے چاند دیکھنے کے لیے کوٹھے پر جا چڑھی۔ اور چاند دیکھنے لگی۔ چاند نظر آگیا میں دُعا مانگنے لگی۔ اسی وقت توپیں دغنے لگیں — اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی — پڑوس کی عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھی۔ چاند دیکھ رہی تھیں۔

میں چلنے لگی۔ ایک لڑکی زہرہ تھی۔ پڑوس ہی میں رہتی تھی۔ تجھے یاد ہو گا۔ ایک زمانہ میں وہ بھی پڑھنے آتی تھی۔ مگر سال ہی بھر کے بعد اُٹھ گئی تھی اور طنجہ چلی گئی تھی۔ اس کے باپ شائد ملازم ہو گئے تھے۔ کوئی سال بھر کے بعد وہ پھر اپنے مکان پر آگئی تھی — وہ چھتوں کو پھلانگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر کہنے لگی — تم تازہ گئی تھیں — ؟"

میں نے کہا "ہاں"

زہرہ :۔ ابن مشعل نے بلایا تھا"

میں :۔ نہیں۔ وزیر اعظم کسی کام سے تازہ گئے تھے ہم بھی ان کے ساتھ چلے گئے تھے"

زہرہ ۔ مگر مشہور تو یہ ہو رہا ہے کہ تمہیں ابن مشعل نے بلایا تھا"

میں ۔ ابن مشعل مجھے اور میں ابن مشعل کو کیا جانوں"

زہرہ ۔ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں"

میں :۔ بُرا کیوں مانوں گی۔ کہو —

زہرہ ۔ کچھ اس قسم کے چرچے ہو رہے ہے کہ ابن مشعل تم پر فریفتہ ہو گیا ہے"
مجھے غصہ آگیا۔ میں نے برہم ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ جیسا

میں نے سُنا تھا کہہ دیا۔ ممکن ہے یہ بات غلط ہو۔"

میں۔ اس یہودی کی کیا مجال ہے جو میری طرف دیکھ بھی سکے۔

زہرہ۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اس یہودی کے فریب میں آنے والی نہیں ہو۔"

وہ چلی گئی۔ میں سوچنے لگی۔ بات تو زہرہ نے پتہ کی کہی ہے۔ ابن مشعل کی نوازشیں بلاوجہ نہیں ہیں۔ اس نے بلاسود کے قرضہ دیا ہے۔ مجھے زیورات دیئے ہیں۔ ریشمی تھان دیئے ہیں۔ یہ سب کچھ بلاسبب نہیں کیا ہے۔ اس نے پھر یاد آیا۔ اس نے صاف طور پر میری محبت کا اقرار بھی کیا تھا۔ مجھے تم سے بڑی محبت ہو گئی ہے جی چاہتا ہے تمہارے قدموں پر اپنی ساری دولت ڈال دوں۔ اور بھی اسی قسم کی باتیں کہی تھیں اُس نے۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔

میں یہ سب کچھ سوچتی کوٹھے سے نیچے اتر آئی۔ امی جان ابا جان اور بھائی جان کو سلام کیا۔ عید کی خوشی میں میرے ذہن سے ابن مشعل کا خیال بالکل اُتر گیا۔ اور رشید کا خیال آگیا۔ خدا جانے وہ فاس میں ہیں یا اپنے وطن چلے گئے۔

ہم سب کھانا کھا رہے تھے کہ امی جان نے بھائی جان سے پوچھا۔ سعید تمہارے دوست رشید آج کل کہاں ہیں ۔۔ ؟"

میں ان کے ذکر سے خوش ہوئی۔ اور جواب پر کان لگا دیئے۔ لیکن بظاہر لاپرواہی سے کھانے کی طرف متوجہ رہی۔ بھائی جان نے کہا۔ یہیں ہیں۔ انہوں نے ابھی امتحان دیا ہے۔ اول نمبر پاس ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہو گئے ہیں۔ ان کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہو گئی ہے۔"

امی جان۔ بڑا ہی نیک بچہ ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے چھوٹی سی عمر میں فارغ التحصیل ہو گیا۔"

سعید:۔ جی ہاں۔ انہوں نے فوجی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔"

امی جان۔ کہیں فوج میں بھرتی ہونے کا خیال ہے اس کا۔"

سعید:۔ یہ معلوم نہیں ہوا اب وہ جامع قرویین کے طالب علموں کو فوجی تعلیم دے رہے ہیں۔"

امی جان۔ اب تو وہ یہاں آتے بھی نہیں۔"

سعید۔ وہ آزاد خیال آدمی ہیں۔ کل ملے تھے۔ کہتے تھے عید کے روز ضرور آؤں گا۔"

مجھے یہ بات سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر میں خاموش بیٹھی رہی۔ کھانا کھا کر اپنے کمرہ میں چلی آئی اور صبح پہننے کے لیے سب سے اچھا جوڑا نکال کر رکھ لیا۔ زیورات بھی امی جان نے دیدیے۔ وہ بھی رکھ لیے۔

وہ رات بڑی مشکل سے کٹی۔ کئی سنہرے خواب دیکھے۔ کئی مرتبہ آنکھ کھلی ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ رات لمبی ہو گئی ہے۔ عید کی رات مختصر ہوجایا کرتی تو اچھا ہوتا۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھی۔ تلاوت کی۔ اور غسل کرنے چلی گئی۔ خوشبودار ابٹن مل کر خوب نہائی۔ بال سکھائے سنگھار کیا۔ کپڑے بدلے اور تمام زیورات پہنے۔ جب میں امی جان کے سلام کو گئی۔ تو انہوں نے میری پیشانی چوم کر مجھے دعا دی۔

بھائی جان اور ابا جان نماز پڑھنے چلے گئے۔ نماز پڑھ کر آئے تو ابا جان تو وزیر اعظم کے پاس چلے گئے اور بھائی جان یار دوستوں سے ملنے روانہ ہو گئے۔ مجھے رشید کے آنے کا انتظار تھا۔ مگر اب کوئی امید نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گیا۔ جی میں آیا یہ بھاری جوڑا اتار کر سادہ لباس پہن لوں۔ ابھی میں یہ ارادہ کر ہی رہی تھی کہ رشید آکر بھائی جان کے کمرہ میں بیٹھ گئے۔

میں ادھر ادھر گھومتی گھامتی بھائی جان کے کمرہ میں داخل ہو گئی۔ رشید اچھے کپڑے پہن کر آئے تھے۔ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اٹھایا۔ اور مجھے دیکھا۔ میں ایسے جھجکی جیسے اتفاقیہ ان کا سامنا ہو گیا ہو۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ معاف کیجیے۔ مجھے آپ کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔" وہ سنبھلے۔ انہوں نے کہا۔ غلطی مجھ سے ہوئی میں نے اطلاع نہیں کر دی۔" اور نظریں جھکا لیں۔

میں:۔ اب تو آپ نے آنا ہی چھوڑ دیا۔"

انہوں نے پھر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ اگر آیا تو معلوم ہوا تم سب تازہ گئے تھے۔ میں۔ مگر ہمیں تازہ سے آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے۔"

رشید :۔ مجھے آنے کی جرأت نہیں ہوئی ۔

میں ۔کیوں ۔۔ ؟"

رشید ۔ میں ایک مفلس طالب علم اور ۔۔۔"

وہ چپ ہو گئے ۔ میں نے کہا" اور کیا ۔۔ ؟"

رشید ۔ تم امیر گھرانے کے لوگ ۔ امیر ۔ امیروں سے ملا کرتے ہیں ۔غریبوں سے نہیں ۔

میں سمجھ گئی ۔ انہوں نے مجھے طعنہ دیا تھا ۔ ابنِ مشعل کا مہمانداری کا کیا کہتی ۔ میں ان سے ۔مگر پھر بھی میں نے کہا ۔ ہم خود غریب ہیں ۔ تارا صرف سیر کرنے کے لیے چلے گئے تھے ۔

رشید :۔ ٹھیک ہے ۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے ۔ میں نے کہا ۔ آپ خفا معلوم ہوتے ہیں ہم سے وہ مسکرائے ۔ انہوں نے کہا ۔ میری یہ مجال ہے ۔"

مجھے کچھ کھٹکا ہوا ۔ میں نے آہستہ سے کہا ۔ شائد کوئی آرہا ہے ۔

اور لپک کر وہاں سے نکل آئی ۔ میری یہ تمنا پوری ہو گئی کہ وہ مجھے یہ لباس اور زیورات پہنے دیکھتے ۔ انہوں نے دیکھ لیا ۔ نہ معلوم کیوں مجھے خوشی ہوئی ۔ میں نے امی جان کو بتایا کہ رشید آئے ہیں ۔ وہ ان کے پاس چلی گئیں ۔ اور ان سے باتیں کرنے لگیں ۔ میں نے جلدی جلدی شیر اور میوے ایک خوان میں رکھے اور لے چلی ۔ کمرہ کے دروازہ پر پہنچکر کھٹکا کیا ۔ امی جان آئیں ۔ میں نے انہیں خوان پکڑا دیا ۔ وہ لے گئیں ۔ انہوں نے رشید کو کھلایا ۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی ۔

چونتیسواں باب

بھائی جان کی ملازمت

زرقا نے بیان کیا۔

دن گذرنے لگے۔ کبھی کبھی رشید دسویں پندرھویں روز آجاتے تھے اُن کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی۔ مگر وہ کچھ بڑی ہی خشک طبیعت کے آدمی تھے۔

جمیلہ نے قطع کلام کر کے کہا۔ ملّاں ہیں نا۔ ان مُلّانوں میں یہی تو بات ہے کہ اگر کوئی ان کی طرف توجہ کرنے لگے تو یہ دور بھاگنے لگیں اور اگر ان سے کھینچنے لگے تو یہ اس کی طرف کھنچ آئیں۔ تو بھی پگلی ہی تھی۔ باتیں ہی نہ کرتی۔ ان سے پھر دیکھتی۔ کیسی کیسی خوشامدیں کرتے تیری"

زرقا:۔ "پھر بولی تُو"

جمیلہ۔ "بھئی جہاں بولنے کی بات ہوگی ضرور بولونگی۔ کب تک چپ بیٹھی رہوں۔ تو نے غلطی کی تجھے سمجھا رہی ہوں"

زرقا:۔ "مہربانی کر"

جمیلہ:۔ "جانے دے۔ اچھا کہہ"

زرقا نے بیان کیا۔

ایک روز رشید دوپہر کے وقت آئے۔ بھائی جان اتفاق سے اس روز بھی نہیں آئے تھے۔ اور ابا جان بھی کہیں گئے تھے۔ امی جان اپنے کمرہ میں گھسی شاید سو

رہی تھیں۔ میں نے انہیں بھائی جان کے کمرہ میں جاتے دیکھ لیا۔ میں آہستہ آہستہ کمرہ کی طرف چلی۔ دیکھا تو وہ حسب عادت نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے نگاہیں اُٹھاکر دیکھا۔

جمیلہ نے جلدی سے کہا "پھر کی غلطی چڑیل اب نہ جاتی تو اچھا تھا"

زرقا۔ پھر بولی تو"

جمیلہ:۔ کمبخت تو غلطی پر غلطی کیے جارہی تھی اور سمجھتی نہیں تھی ـــــ مگر تو بھی کیا کرتی دل سے مجبور تھی"

زرقا:۔ دِل، دِل کا کوئی معاملہ نہیں تھا"

جمیلہ نے ہنس کر کہا۔ بالکل بھی نہیں۔ وہ ملّاں یاد بھی آتا تھا۔ اسے کپڑے اور زیور پہن کر بھی دکھانا چاہتی تھی۔ دِل دِل کا معاملہ بھی نہ تھا۔ اچھا پھر کیا تھا۔

زرقا:۔ اب تو سنتی ہے یا کروں ختم۔

جمیلہ۔ اچھا سنا"

زرقا نے بیان کیا۔

اس روز میں بالکل سادہ لباس میں تھی۔ سفید چست پاجامہ تھا۔ سفید قمیض تھی۔ گلابی دوپٹہ تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ شاید بھائی سعید نہیں ہیں یہاں"

میں:۔ جی نہیں۔ کہیں گئے ہیں"

وہ کہاں گئے ہیں"

میں۔ کچھ کہہ کر نہیں گئے"

وہ برابر میری صورت تکتے جارہے تھے۔ میں جانتی تھی کہ ایسے سادہ لباس میں میرے چہرے کی رنگت گلِ چاندی کی طرح سفید ہوجاتی تھی۔ جس میں ہلکا گلابی رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ معلوم نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتی ہو"

ان کا یہ فقرہ ناگوار گزرا۔ وہ مجھے جھوٹا بنا رہے تھے۔ جی میں آیا خفا ہو کر چلی جاؤں۔ مگر جانتی تھی۔ وہ اڑنچھو ہوجائیں گے اور شاید پھر اس طرف کا رُخ بھی نہ کریں ـــــ

جمیلہ نے کہا "ارے جا بھی کچدلی۔ ذرا اپنے دِل کو مضبوط کرلیتی۔ آنکھیں

دکھاتی اور بگڑ کر چلنے لگتی۔ وہ ملاں بھاگتا تو کیا۔ تیرے قدموں پر آ پڑتا۔"

زرقا۔ "پھر بولی تو۔

جمیلہ۔ اب نہ بولوں تو کیا کروں۔ تیری بیوقوفی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا ہے۔ کمبخت، جو تیری طرف جھکتے تھے۔ انہیں تو تو ٹھکراتی تھی اور جو تجھ سے بھاگتا تھا۔ اس کے تو پیر پکڑتی تھی۔

زرقا۔ مردار۔ میں کیوں کسی کے پیر پکڑتی۔"

جمیلہ۔ اچھا ۔۔۔ ابھی وہ ملاں موجود ہے۔ ایسی پٹی پڑھاؤں کہ تو پیر بھی پکڑے تو نہ مانے۔

زرقا نے مسکرا کر کہا۔ تجھ جیسی سے تو وہ بات کرنا بھی گوارا نہ کریں۔

جمیلہ۔ اوہو۔ یکلی انگلی پر نچا دوں تیرے ملاں کو۔"

زرقا۔ کمبخت تو ایسی باتونی کب سے ہو گئی۔"

جمیلہ۔ اچھا کہ تو۔"

زرقا نے کہا۔

"مگر مجھے طرارہ آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ گویا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

وہ۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں بتایا نہیں جا سکتا۔

میں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

جمیلہ نے ہنس کر کہا۔ ہت تیری کی۔ دب گئی تو ملاں سے جب تجھے ملا وہ آیا تھا تو کمبخت تھوڑی دیر تو منہ پھلائے کھڑی رہتی۔ پھر دیکھتی ملا گڑگڑانے لگتا۔"

زرقا۔ پھر بولی تو۔"

جمیلہ۔ کیوں نہ بولوں۔ کمبخت تو نے تو اپنی صنف کی توہین کر ڈالی۔ دب دب گئی۔ اس ملاں سے۔ یہ نہ ہوا اسے دباتی۔ اس سے ہاتھ جڑواتی۔"

زرقا نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ اچھا باقی حال کل سننا۔ اسوقت تیرا دماغ ٹھیک نہیں رہا۔

جمیلہ۔ مجھ سے یہ نخرے نہ کر۔ اس ملاں ہی سے کرنا۔ میں تو تجھے یوں بھی پیٹ کر رکھ دوں گی۔"

یہ کہتے ہی اُس نے ایک دھمک زرقا کے مارا۔ وہ کمر سہلاتی ہوئی اٹھی اور بولی مردار۔ کس زور سے مارا ہے تو نے۔"

جمیلہ۔ نخرے چھوڑ اور بیان کر۔

زرقا:۔ جا مجھے تجھ پر رحم آتا ہے نہیں تو ــــ"

جمیلہ:۔ رحم کیا یوں ہی آتا ہے۔ جانتی بھی ہے۔ ایک کے جواب میں دو دونگی۔ اچھا باتیں بند کر اور سُنا۔"

زرقا۔ تو سُنتی تو ہے ہی نہیں۔"

جمیلہ۔ بالکل سن رہی ہوں۔"

زرقا نے کہا۔

"وہ بولے، تب شائد تمہیں معلوم نہیں ہے۔"

میں۔ کیا بات ہے۔؟

وہ۔ تمہارے بھائی آج ملازم ہو گئے ہیں۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ابا جان ان کی ملازمت کے لیے ایک عرصہ سے کوشش کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہاں؟"

وہ ــ فوج میں۔"

بھائی جان فوج ہی کی ملازمت پسند کرتے تھے۔ اور اسی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا ــ؟"

وہ۔ مجھے قاضی جی نے ابھی بتایا ہے۔ میں انہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔

میں۔ انہیں شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔

وہ ــ ممکن ہے۔ انہیں مراکش جانا پڑے گا۔"

میں ــ مراکش کیوں؟

وہ۔ کوئی مصلحت ہوگی اس میں فوجی افسران کی یا سفارش کرنے والے کی۔

میں۔ کس نے سفارش کی ہے ان کی۔"

وہ۔ گویا تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

میں۔ آخر آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔"

وہ۔ اس لیے کہ یہ کوشش اور سفارش کا سلسلہ کئی مہینے سے جاری ہے۔"

میں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔"

وہ۔ ابن مشعل کی سفارش پر انہیں ملازمت ملی ہے۔"

مجھے خدشہ ہوا۔ کہیں انہیں بھی تو یہ بات معلوم نہیں ہوگئی کہ ابن مشعل نے مجھے تحائف دیئے ہیں اور یہ کہا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ ابنِ مشعل اچھا آدمی نہیں ہے۔ مگر یہ درست ہے کہ سفارش اُس نے ہی کی ہے۔ میں تم سے بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

میں۔ کہیئے۔"

وہ۔ ابن مشعل سے ہوشیار رہنا۔

میں۔ میں اس پیر خرتوت کا منہ بھی دیکھنا گوارا نہ کروں گی۔"

وہ۔ میں ایک مفلس طالب علم ہوں۔ لیکن ضرورت کے وقت تمہارے لیے اپنی جان تک دینے سے دریغ نہ کروں گا۔

یہ کہکر انہوں نے جلدی سے اس طرح سر جھکا لیا جیسے کوئی بُری بات کہدی اور میں ان سے خفا ہو جاؤں گی۔

میں نے شوخی سے کہا شکریہ۔"

وہ شرمندہ سے ہونے لگے۔ اُٹھ کھڑے ہوتے کہنے لگے۔" اب اجازت چاہتا ہوں ——

میں۔ بھائی جان سے مِل کر جایئے گا۔

وہ —— پھر ملوں گا۔ اس وقت میری زبان سے وہ باتیں نکل گئیں جو کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور مناسب بھی نہیں تھیں۔"

میں۔ کوئی بات نہیں۔"

اسی وقت امی جان نے مجھے آواز دی۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ آئی۔ وہ بھی چلے گئے۔ میں نے امی جان کو بتا دیا کہ رشید آتے تھے۔ کہتے تھے۔ بھائی جان ملازم ہو گئے ہیں۔"

وہ بھی اس خبر کے سننے سے خوش ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں ابا جان بھی آ گئے۔

انہوں نے مفصل طور پر سنایا کہ ابن مشعل کی کوشش سے بھائی جان فوج میں ملازم ہو گئے ہیں۔ ان کا تقرر شہر مراکش کی فوج میں ہوا ہے۔"

بھائی جان بھی آ گئے۔ انہیں بھی یہ خبر سن کر خوشی ہوئی۔ لیکن میری خوشی کافور ہو گئی تھی۔ جب ابن مشعل کا نام آتا تھا تو میرا دل لرز جاتا تھا۔ نہ معلوم کیوں میرے دل کی یہ کیفیت ہوتی تھی۔"

چند روز کے بعد بھائی جان نے مراکش جانے کی تیاری شروع کی۔ ہم سب کو ان کے ملازم ہونے کی تو بڑی خوشی تھی۔ لیکن ان کی جدائی کا ملال تھا۔ مراکش شہر فاس سے کافی دور تھا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جب بھائی مراکش جانے کے لیے رخصت ہونے لگے۔ میں نے ہر چند ضبط کیا مگر میرے آنسو نکل ہی آئے۔ بھائی جان نے مجھے تسلی دی اور چلے گئے۔

زرقا نے کہا۔ اب میں تھک گئی ہوں۔ نیند بھی آنے لگی ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔ واقعی اب رات زیادہ آ گئی ہے۔ سونے کی تیاری کرنی چاہیئے۔"

دونوں سونے کی تیاری کرنے لگیں۔

پینتیسواں باب ۳۵

تقاضا

صبح کو دونوں بہت سویرے بیدار ہوئیں ضروریات سے فراغت کر کے وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ قرآن شریف کی تلاوت کی اور کمرہ میں جا گھسیں۔

جمیلہ نے پوچھا۔ تیرے بھائی جان کہیں گئے ہیں کیا۔؟"

زرقا نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ کیوں؟ کیا مطلب ہے تیرا ان سے۔"

جمیلہ۔ مطلب کیا ہوتا۔ میں پوچھ رہی ہوں۔"

زرقا۔ مجھے کیا معلوم ان کے کمرہ میں جا کر دیکھنا۔ موجود ہیں یا کہیں گئے ہیں۔"

جمیلہ۔ اچھا ـــ تو مجھے بھی اپنے ہی جیسا سمجھتی ہے۔ میں دیکھ آؤں گی۔"

زرقا۔ منع کون کرتا ہے۔

جمیلہ چل پڑی۔ اُس نے کمرے سے نکل کر دیکھا زرقا تو نہیں آ رہی ہے۔ زرقا اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔ وہ بڑھی۔ اور سعید کے کمرہ کے دروازہ پر پہنچکر جھانکنے لگی۔ سعید سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔"

زرقا جلدی سے اٹھی۔ اور پنجوں کے بل تیزی سے دوڑ کر جمیلہ کے پاس آئی اُس نے بڑی پھرتی سے جمیلہ کو کمرہ کے اندر دھکیل دیا۔ جمیلہ سعید کے اوپر جا پڑی۔ سعید اس طرح ہڑبڑا کر اُٹھے جیسے ان پر کوئی بلا آ پڑی ہو۔ مگر جب انہوں جمیلہ کو دیکھا تو جلدی سے اٹھا کر کھڑا کیا اور کہا۔ یہ تم گیند کی طرح مجھ پر کیوں آ پڑیں۔

جمیلہ شرم و حیا کی پتلی بن کر کھڑی رہ گئی ۔ اس کی ساری شوخی اور شرارت جاتی رہی ۔ وہ نظریں جھکا تے دوپٹہ کا آنچل انگلی پر لپیٹنے لگی ۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ سعید نے پھر کہا۔" یہ مجھے کیوں تختۂ مشق بنایا گیا ہے ۔"

جمیلہ نے شرمیلے لہجہ میں کہا۔ معاف کرنا یہ غلطی مجھ سے نہیں ہوئی ہے ۔"

سعید۔ شاید کسی نے تمہیں پھینک دیا ہے ۔"

جمیلہ :۔ جی زرقا نے ۔"

سعید۔ تعجب ہے ۔ زرقا سے اور تم اُٹھ گئیں ۔ کہاں سے اٹھالائی تھی وہ تمہیں ۔"

جمیلہ حیا سے سمٹنے لگی ۔ کیا جواب دیتی وہ اس بات کا کہ زرقا اسے کہاں سے اُٹھالائی ۔ وہ چپ رہ گئی ۔ سعید نے پوچھا ۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی ۔"

جمیلہ نے ان کی طرف دیکھا ۔ شرم سے اُس کی پلکیں جلد جلد جھپکنے لگیں ۔ اُس نے کہا ۔ شکر ہے ۔ آپ کو اب خیال آیا میری چوٹ کا ۔

سعید ۔ خیال تو پہلے ہی آیا تھا ۔ مگر اس حیرت کو دُور کرنا تھا کہ تم مجھ پر آ کیسے پڑیں ۔"

جمیلہ ۔ آپ کس خیال میں بیٹھے تھے ؟"

سعید ۔ اگر سچ بتا دیا تو شاید تم خفا ہو جاؤ ۔"

جمیلہ ۔ سچ کہنے سے کوئی خفا نہیں ہوا کرتا ۔"

سعید ۔ تمہارا خیال آرہا ہے ۔"

جمیلہ کو جیسے یہ فقرہ بہت ہی ناگوار گزرا ۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا ۔" معاف کیجئے ۔"

اور وہاں سے چلی ۔ سعید نے کہا ۔ خفا ہو گئیں نہ تم ۔"

جمیلہ نے جیسے سُنا ہی نہیں ۔ وہ چلی آئی ۔

زرقا دیوار سے لگی کھڑی تھی ۔ جمیلہ کے آنے کی چاپ سنکر تیزی سے بھاگی ۔ اور کمرہ میں جا کر دم لیا ۔ جمیلہ بھی لپک کر وہاں آئی ۔ اُس نے ایک دھموکا زرقا کے مار کر کہا ۔" چڑیل ، یہ کیا کیا تھا تو نے ۔"

زرقا۔ مردار میں نے کیا کیا تھا۔ تو جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا قریب جا کر اچھی طرح دیکھ لے گی۔ میں نے ذرا اندر جانے کا اشارہ کیا اور تو کود گئی۔

جمیلہ۔ صورت سے کیا بھولا پن ظاہر ہوتا ہے اور لچھن شیطان کی خالہ جیسے۔ بھلا کیا کہتے ہوں گے وہ۔"

زرقا۔ وہ تو پوچھ رہے تھے۔ بتا کیوں نہیں دیا۔ تمہیں دیکھنے آئی تھی۔"

جمیلہ:۔ بہت ہی شریر ہے تو۔"

زرقا۔ کیسی کھڑی ہوگئی تھی۔ بیچاری جیسے بہت ہی شرمیلی ہو۔ جی میں تو آیا کہ بڑھ کر ایک دھمک دوں اور کہوں کمبخت گڑیا سی کیوں کھڑی ہے کر شرارت شروع کر باتوں کا سلسلہ۔"

جمیلہ۔ وہ بیچارے ہکا بکا رہ گئے اور گھبرا کر اس طرح کھڑے ہو گئے۔ جیسے کوئی بلا ان پر جا پڑی۔"

زرقا:۔ جب خوبصورت بلا کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ یہ تو بتا یہ تو ان سے باتیں کیوں کرنے لگی تھی۔"

جمیلہ۔ تیرا سر۔ یاد رکھنا کسی روز ایسا بدلہ لوں گی کہ یاد کرے گی۔

زرقا۔ اچھا اب تو اچھی طرح دیکھ لیا تو نے۔ بتا پسند ہیں۔"

جمیلہ۔ چپ مردار۔

زرقا۔ اب رشتہ بڑا ہو گیا نہ تیرا۔

جمیلہ۔ مار کھانے کو جی چاہتا ہے تیرا۔"

زرقا۔ مگر جمیلہ میرے بھائی جان بڑے سیدھے ہیں اور تو ہے شیطان کی خالہ۔ جمیلہ اسے مارنے کے لیے بڑھی۔ اُس نے بازو میں چٹکی لی۔ جمیلہ سی کر کے بازو سہلانے لگی۔ کچھ دیر کے بعد بولی، چڑیل۔ کہیں بوٹی اتار لی کیا۔"

جمیلہ:۔ تیرے ملاں سے اچھا ہے۔"

زرقا نے تالیاں بجا کر ہنستے ہوتے کہا۔ آہا پسند آگئے۔ پسند آگئے۔

اسوقت زرقا کی امی جان نے انہیں ناشتہ کے لیے آواز دی۔ دونوں بڑی متین

اور سنجیدہ بن گئیں۔ ناشتہ کیا۔ اور امی جان سے باتیں کرنے لگیں۔

دوپہر کا کھانا کھا کر دونوں زرقا کے کمرہ میں پہنچیں۔ بیٹھیں اور کچھ دیر ہنستے ہنسانے کے بعد جمیلہ نے کہا۔ اچھا شروع کر اپنی داستان "۔

زرقا نے کہا اچھا۔ اور اس طرح بیان کرنا شروع کیا "۔

بھائی جان کے چلے جانے سے ہمارا گھر خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ کئی روز تک تو میرا کسی کام میں جی نہیں لگا۔ امی جان بھی کچھ آزردہ سی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خیال بٹنے لگا۔

اگرچہ وہ قہقہے پیچھے تو نہ رہے جو بھائی جان کے سامنے تھے مگر غم اور پریشانی بھی نہ رہی۔ کچھ سکون سا ہو گیا۔

نمائش کو سوا سال کے قریب ہو گیا تھا۔ اور بھائی جان کو ملازمت پر گئے ہوئے بھی کئی مہینے ہو گئے تھے۔ انہوں نے پانچسو درہم بھیجے۔ ابا جان اور امی جان نے خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ بھائی جان اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے تھے۔ بھائی جان کے بھیجے ہوئے درہم امی جان نے ان کی شادی کے لیے رکھ دیئے۔

ہم لوگ اس بات سے بہت خوش تھے کہ بھائی جان فوج میں جلد ترقی کر کے کوئی معقول عہدہ حاصل کریں گے۔ اور پھر آسانی سے قرضہ ادا کر دیا جائیگا۔

مگر ایک روز یہ خوشی خاک میں مل گئی۔ وزیر اعظم نے ابا جان کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم نے ابن مشعل کا روپیہ اب تک ادا نہیں کیا۔ حالانکہ ایک سال کے اندر ادا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اب سوا سال سے بھی زیادہ گذر چکا ہے "۔

ابا جان نے کہا۔ میں نے قرضہ کی ادائیگی کی بہت کوشش کی۔ لیکن کوئی سبیل نہ ہو سکی "۔

ابا جان نے یہ سچ کہا تھا۔ انہوں نے ہر چند روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ باغات بیچنے چاہے۔ مکان فروخت کرنا چاہا۔ زیورات پر قرضہ لینا چاہا لیکن کسی نے بھی نہ باغات خریدے۔ نہ مکان خریدا اور نہ زیورات لیے۔

وزیر اعظم نے کہا۔ ابن مشعل نے سخت تقاضا کیا ہے اس کا ایک کارندہ آیا ہے۔ میں اسے تمہارے سامنے بلاتا ہوں "۔

چنانچہ انہوں نے کارندہ کو بلایا۔ وہ بوڑھا یہودی تھا۔ وزیر اعظم نے کہا۔" یہ ہیں شیخ صالح۔"

کارندہ نے ابا جان سے کہا۔ آپ ایک ہفتہ کے اندر روپیہ کا بندوبست کر دیں ۔

ابا جان نے کہا۔ میں کئی مہینے سے روپیہ کے بندوبست کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر نہیں ہو سکا۔ ایک ہفتہ میں کیسے ہو جائے گا۔"

کارندہ ۔ میرے آقا وعدہ خلافی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ سے وعدہ خلافی ہو گئی ہے انہوں نے اب بھی تم پر یہ مہربانی کی ہے کہ ایک ہفتہ کی مہلت دے دی ہے۔ جس طرح اور جہاں کہیں سے بھی ہو اس عرصہ میں روپیہ فراہم کر کے لا دو۔

ابا جان کو بڑا فکر ہوا۔ انہوں نے کہا۔ میں پھر کوشش کرتا ہوں۔"

چنانچہ وہ چلے آئے۔ سخت پریشان اور غمزدہ تھے۔ میں اور امی جان ایک ہی جگہ بیٹھیں تھیں۔ امی جان نے کہا۔ خیر ہے۔ اس طرح پریشان اور غمگین کیوں ہو۔؟"

ابا جان نے تمام واقعہ میرے سامنے ہی بیان کر دیا۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ اب تک مجھ سے اس بات کو چھپا رہے ہیں۔ مجھے اور امی جان کو بھی بے حد قلق ہوا۔ امی جان نے کہا۔ پھر اب کیا ہو گا۔"

ابا جان نے مرے دل سے کہا۔ کوشش کریں گے۔ اور انہوں نے اسی وقت سے کوشش شروع بھی کر دی۔

چھتیسواں باب ۳۶
غم میں خوشی

زرقا نے بیان کیا۔

"قرضہ لینا آسان ہے اور ادا کرنا مشکل ہے۔ قرض ایسی دلدل ہے کہ انسان جب ایک دفعہ اس میں پھنس جاتا ہے تو نیچے ہی دبتا چلا جاتا ہے۔ ابھرنا اور نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ میں مانتی ہوں کہ دنیا میں لین دین ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور ہوتا ہی رہے گا لیکن جو لوگ اپنی بساط کے موافق قرضہ لیتے ہیں۔ اور اپنی آمدنی بڑھا کر اور اخراجات گھٹا کر قرضہ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ادا کر دیتے ہیں۔

اور جو اخراجات نہیں گھٹاتے نہ آمدنی بڑھاتے ہیں۔ ان کا قرضہ ادا ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ انہیں آئے دن اور قرضہ لینے کی ضرورت لاحق ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ قرضہ کے بار کے نیچے ایسے دب جاتے ہیں کہ نکل ہی نہیں سکتے۔ اگر ان کے پاس کچھ اثاثہ ہوتا ہے تو وہ فروخت یا نیلام ہو جاتا ہے اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فاقہ کشی کی نوبت آجاتی ہے۔ ان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

عقلمند لوگ قرض نہیں لیتے جتنی آمدنی ہوتی ہے۔ اتنا ہی خرچ رکھتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ خرچ آمدنی سے بڑھنے نہ پائے۔ ایسے محتاط آدمی

ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔

میرے ابا جان کی آمدنی اتنی ضرور تھی کہ اگر وہ انتظام کے ساتھ خرچ کرتے تو قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور زندگی آرام سے گذر جاتی۔ لیکن نہ معلوم انہیں کیسے اور کب قرض کی ضرورت لاحق ہوئی۔ انہوں نے قرض لے لیا۔ بس یہ قرض لینا غضب ہو گیا۔ ادائیگی ہو نہ سکی اور بڑھتا رہا۔

جب تک ابراہیم سے لین دین رہا۔ اسوقت تک قرضہ زیادہ نہیں بڑھا۔ وہ بہت کم قرض دیتا تھا۔ اور تقاضا کر کے کچھ نہ کچھ وصول بھی کر لیتا تھا۔ مگر جب ابن شمعون سے قرضہ لیا تو کافی بڑھ گیا۔ اور اُس کے قرضہ میں کچھ ادائیگی بھی نہ ہو سکی۔ اِس نے جب ادائیگی کا تقاضا کیا تو ابن مشعل آمرا۔ اور اسنے اتنا قرضہ دیدیا جس کی ادائیگی ناممکن ہو گئی۔

ابا جان نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے کہیں پورا انہیں تو تھوڑا بہت ہی روپیہ فراہم ہو جائے۔ اور وہ کچھ نہ کچھ تو ابن مشعل کے قرضہ میں دیدیں مگر کہیں سے ایک پائی بھی نہ ملی۔

ابا جان نے یہ بات بتائی کہ جو لوگ ابن مشعل سے قرضہ لے لیتے ہیں کوئی یہودی بھی بغیر ابن مشعل سے دریافت کیے انہیں قرض نہیں دے سکتا۔ نہ اس کی کوئی چیز خرید سکتا ہے۔ گویا اس پر تمام مہاجنوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ابا جان نے باغات۔ مکان اور زیورات بھی فروخت کرنے چاہے تو کسی نے بھی نہ خریدے۔ اگر کوئی خریدار ہوا بھی تو اس نے ابن مشعل کے کارندہ سے پوچھا۔ اُس نے منع کر دیا۔ پھر اُس نے بات بھی نہ کی۔ تمام مہاجن ابن مشعل کا بڑا لحاظ کرتے اور اس سے ڈرتے تھے۔

ابا جان بہت پریشان اور غمزدہ تھے۔ ان کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ انہوں نے یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں اور مسلمانوں سے بھی قرضہ لینے یا ان کے ہاتھ اپنا سب کچھ فروخت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر قوم کے مہاجنوں اور رئیسوں پر ابن مشعل کا اثر اور دباؤ تھا۔ اس لیے کسی نے بات تک بھی نہ کی۔ یہاں تک کہ ابن مشعل کے کارندہ نے جو مہلت ایک ہفتہ کی دی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اور اس نے ابا جان پر سختی سے تقاضا کیا۔ اور یہ دھمکی دی کہ یا تو فوراً قرضہ ادا کر دو ورنہ گرفتار کر لیے جاؤ گے۔

اباجان نے وزیر اعظم سے اس معاملہ میں امداد چاہی۔ وزیر اعظم نے مجبوری ظاہر کی اور یہ کہہ دیا کہ سلطان نے ابن مشعل کو یہ رعایت دی ہے کہ وہ اپنے مقروض کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ حکومت اس میں کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

یہ سُن کر اباجان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اور غم و فکر نے انہیں نڈھال کر دیا۔ انہوں نے ابن مشعل سے جو قرض لیا تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار دینار اس زمانہ کی اشرفیاں ہو گئی تھیں۔ یہ اتنی بھاری رقم تھی کہ اگر تمہارے تمام زیورات باغات جاگیر اور مکان بھی بک جاتے تو قرضہ ادا نہ ہو سکتا۔

اباجان۔ اس قدر پریشان اور غمگین ہوئے کہ ان کا کھانا چھٹ گیا۔ مجھے ان کی حالت دیکھ بڑا قلق ہوتا تھا۔ کیوں کہ انہوں نے زیادہ قرضہ میرے آرام و آسائش کیلئے لیا تھا۔ امی جان بھی اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھیں۔ ابن مشعل کے کارندے نے گرفتاری کی دھمکی دے دی تھی۔ وزیر اعظم نے بتا دیا تھا کہ سلطان نے اس یہودی کو یہ مراعات دے دی ہیں کہ وہ اپنے مقروض کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ اب اباجان اور ہمارا خاندان ابن مشعل کے رحم و کرم پر تھا۔

اباجان کو یہ اطمینان تھا کہ اگر وہ ابن مشعل سے خود بات چیت کریں گے۔ تو وہ ان کے ساتھ ضرور نرم سلوک کرے گا۔ یہ حسن ظن انہیں اس وجہ سے ہوا تھا کہ ابن مشعل کا برتاؤ ان کے ساتھ اب تک بہت اچھا رہا تھا۔ اُس نے شاندار طریقہ پر ہماری مہمانداری کی تھی۔ ہمیں تحفے دیئے تھے۔ اور اباجان کی بڑی عزت و عظمت کرتا تھا۔

چنانچہ اباجان نے ابن مشعل کے کارندہ سے درخواست کی کہ وہ انہیں ابن مشعل کے پاس لے چلے۔ وہ اس سے اپنا معاملہ طے کر لیں گے۔ مگر کارندہ نے اس بات کو منظور نہیں کیا۔ اس نے صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ ابن مشعل نے اسے روپیہ وصول کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ معاملہ طے کرنے کے لیے نہیں۔ کل تک یا تو روپیہ ادا کر دو۔ ورنہ گرفتار کر کے لے جاؤ گے۔ اور تمہاری جاگیر باغات۔ مکان اور گھر کا تمام اثاثہ جس میں عورتوں کے زیورات اور کپڑے تک بھی ہیں۔ ضبط کر کے نیلام کر دیئے جائینگے

یہ سن کر ابا جان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ان کا سر گھومنے لگا۔ جب وہ گھر آئے تو برسوں کے بیمار معلوم ہونے لگے تھے۔ زرد پڑ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے جسم میں خون کا قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔

امی جان نے اور میں نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو ہم دونوں ہول گئیں ان کے پاس پہنچیں۔ وہ ایسے نڈھال ہو گئے تھے کہ بیٹھے نہ رہ سکے۔ بستر پر پڑ گئے۔ امی جان نے ان کی حالت پوچھی۔ انہوں نے وہ سب باتیں بیان کیں جو کارندہ نے ان سے کہیں تھیں۔ مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ ابا جان میرے آنسو برداشت نہ کر سکے۔ بولے۔ بیٹی۔ تو کیوں روتی ہے۔ ہم نے اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری ہے۔ یہ بلا خود اپنے گلے میں ڈالی ہے۔ نہ قرضہ لیتے نہ یہ نوبت آتی۔

میں نے سسکیاں بھر کر کہا۔ مجھے معلوم ہے۔ ابا جان میرے آرام و آسائش کے لیے آپ نے قرضہ لیا۔ میری وجہ سے آپ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنے آپ کو امیر باپ کی بیٹی سمجھتی تھی۔ آپنے یہ کوشش کی کہ میں ایسا ہی سمجھتی رہوں مجھے یہ احساس نہ ہو کہ میں غریب باپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے اتفاقیہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ مگر کہہ نہ سکی۔ اور میری یہی غلطی تباہی کا باعث ہوئی۔

ابا جان ۔ تیری غلطی نہیں بیٹی۔ ہماری بداحتیاطی اور بدانتظامی۔ ہماری تباہی کا باعث ہوئی۔ ہم نے یہ نہ سمجھا کہ قرضہ ایک ایسی بیماری ہے جس سے انسان نپٹ ہی نہیں سکتا۔ مگر اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہمیں اپنی گرفتاری کا فکر نہیں اب بھی تیرا ہی فکر ہے ـــ

میں ۔ آپ کو بچانے کے لیے میں اپنی جان دیدوں گی "

ابا جان ۔ تو کیا کرے گی بیٹی ۔ ؟"

میں ۔ میں وزیرنی کے پاس جاؤنگی۔ ان سے مدد کی درخواست کروں گی۔

ابا جان ۔ اگر ہو سکے تو وزیرنی کے ذریعے سے یہ کوشش کر کہ ابن مشعل کا کارندہ ہمیں تازہ ابن مشعل کے پاس لے چلے۔

میں ۔ میں کوشش کروں گی۔ اور خدا نے چاہا تو کامیاب ہوں گی۔ آپ فکر نہ کریں "

میں اسی وقت گاڑی میں بیٹھ کر وزیرنی کے پاس پہنچی۔ اور میں نے انہیں تمام حالات سنائے۔ وہ بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور اسی وقت وزیراعظم کو بلایا۔

مجھ سے علیحدگی میں خدا جانے ان سے کیا باتیں کیں۔ کچھ دیر کے بعد میرے پاس آئیں۔ کہنے لگیں۔ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا میں نے سمجھا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے وزیراعظم کو آمادہ کیا ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر پورا زور ڈالیں۔ اور کارندہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ شیخ صالح کو ابن مشعل کے پاس لے جائے۔

میں فکر و تذبذب میں مبتلا رہی۔ وزیرنی مجھے تسلی دیتی رہی کئی گھنٹے کے بعد وزیراعظم آئے۔ وزیرنی ان کے پاس گئیں اور دوڑتی ہوئی میرے پاس آکر بولیں۔ خدا کا شکر ہے۔ کارندہ نے یہ بات مان لی۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی میں وزیرنی سے اجازت لیکر اسی وقت واپس آئی اور میں نے یہ خوشخبری ابا جان کو سنا دی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

سینتیسواں باب ۳۷

مہلت

جمیلہ نے کہا۔ توبہ۔ توبہ، قرضہ کیسی بُری بلا ہے"!

زرقا۔ اس قرضہ کی بدولت جس قدر غم اور تکلیفیں ہم نے برداشت کی ہیں وہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گی کہ انسان بھوکا اور ننگا رہ کر قرضہ نہ لے۔ قرضہ سے بری کوئی چیز نہیں ہے۔ اور قرضہ سے بری کوئی بیماری نہیں ہے۔ مقروض قرضہ کے فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ جو غیرت دار اور آبرو والے ہیں۔ ان کی تو مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ قرضہ کا فکر الگ اور یہ فکر الگ کہ کسی کو ان کے مقروض ہونے کی خبر نہ ہو جائے۔ اور جب پانی سر سے گذر جاتا ہے اور قرضہ ادا نہیں ہوتا۔ تو آبرو پر پانی پھر جاتا ہے۔ ہر ملکیت نیلام ہو جاتی ہے۔ تن کے لیے تک بک جاتے ہیں۔ غیرت والے یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ اور اپنی اولاد کو محتاج چھوڑ جاتے ہیں۔ امیروں کے بچے یا تو محنت مزدوری کرتے ہیں یا بھیک مانگتے ہیں اور جو بے غیرت ہوتے ہیں۔ وہ بے حیا بن کر جیتے ضرور ہیں۔ لیکن ان کی زندگی بھی تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ بھی موت کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ غرض قرضہ بُرا اور بہت ہی بُرا۔

جمیلہ :۔ اچھا پھر کیا ہوا"۔

زرقا نے بیان کیا۔

ابا جان اسی وقت ابن مشعل کے کارندہ سے جا کر ملے۔ اس نے انہیں تازہ

چلنے کے لیے کہا۔ ابا جان نے تیاری شروع کر دی۔ انہیں یہ بالکل یقین تھا کہ ابن مشعل انہیں روپے کی ادائیگی کے لیے کچھ مہلت دیدے گا۔

مگر میرا دل کہتا تھا کہ ابن مشعل یہودی ہے اور یہودی اپنے مطلب کے سچے ہوتے ہیں۔ رحم اور مہربانی کو تو وہ جانتے ہی نہیں اور وہ ہی کیا۔ سارے مہاجن ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ روپیہ سے روپیہ کماتے ہیں۔ غریبوں اور ان امیروں کو جن کے اخراجات ان کی آمدنی سے زیادہ ہوتے ہیں۔ قرضہ دے کر خوب لوٹتے ہیں۔ اگر ابن مشعل مہربانی بھی کرے گا تو کسی غرض کو سامنے رکھ کر۔

ابا جان ابن مشعل کے کارندہ کے ساتھ تازہ روانہ ہو گئے۔ ہم نے اُن کی کامیابی کی دعائیں شروع کیں۔

ایک روز رشید آئے۔ جب سے بھائی جان فوج میں ملازم ہو کر مراکش گئے تھے۔ اس وقت سے انہوں نے آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھی دسویں پندرھویں روز آ جاتے تھے۔ اور امی جان سے باتیں کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک دو مرتبہ میرا بھی سامنا ہو گیا تھا۔ انہیں ہماری پریشانی اور تکلیف کا کچھ علم نہیں تھا۔

حسب عادت وہ آ کر بھائی جان کے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ اسوقت امی جان کچھ پڑھ رہی تھیں میں چہرہ پر نقاب ڈال کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ سعید نے کوئی اطلاع بھیجی ہے"

میں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ جی ہاں۔ ابھی چند روز ہوتے جب انہوں نے خیریت بھیجی تھی"

وہ — امی جان اچھی طرح ہیں"

میں — جی ہاں"

وہ — اور ابا جان —"

میں — آپ کو شاید ہماری ان تکلیفوں اور پریشانیوں کا علم نہیں ہے جو ہم پر گزر گئیں۔

وہ ایک دم چونک پڑے۔ اور انہوں نے میری طرف غور کر کے کہا "نہیں" کیا بات ہوئی؟

میں۔ اگرچہ یہ ہمارا خاندانی راز ہے۔ مگر آپ اس خاندان کے ہمدرد ہیں۔ اسلئے آپ کو بتاتے دیتی ہوں۔"

وہ۔ راز ہے تو نہ بتایئے۔ راز اسی وقت تک راز رہتا ہے۔ جب تک سینہ کے صندوق میں بند رہتا ہے۔

میں۔ یہ سچ ہے۔ مگر بعض راز ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں ظاہر کر دیا جائے تو شاید کوئی مفید مشورہ مل سکے۔ اور اپنے ان ہمدردوں سے ہی راز ظاہر کیا جاتا ہے۔ جن سے کوئی امید ہوتی ہے۔

وہ۔ تمہارا شکریہ۔ تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو۔ ورنہ میں اس قابل کہاں ہوں۔ ایک مفلس طالب علم ہوں۔

میں۔ ایسی بات نہ کہا کیجئے۔"

وہ۔ انسان جو کچھ ہو وہی بتائے۔ میں جو کچھ ہوں وہی بتاتا ہوں۔"

میں۔ مگر ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ایک غیور اور شریف انسان ہیں۔"

وہ۔ یہ میری عزت افزائی ہے۔"

میں۔ اچھا اب سنیئے۔ ہم کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔"

وہ۔ کہو۔"

میں۔ ہم اتنے امیر نہیں ہیں۔ جتنے نظر آتے ہیں۔ ہماری مالی حالت کمزور ہے اور یہی ہمارا خاندانی راز ہے۔"

میں ان کے چہرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرہ سے کسی جذبہ کا اظہار نہیں ہوا۔ وہ جس طرح سر جھکائے بیٹھے سن رہے تھے۔ اسی طرح سنتے رہے۔ میں نے کہا۔" ابا جان نے ابن ابراہیم سے لین دین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ابن شمعون سے اور جب قرضہ بڑھ گیا تو ابن مشعل سے قرضہ لیا۔"

انہوں نے پہلو بدلا اور چونک کر کہا۔" ابن مشعل سے؟"

میں۔ جی ہاں۔ اس نے نہایت آسان شرائط پر قرضہ دیا اور قرضہ کی رقم بہت بڑھ گئی۔"

انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ جانتی ہو۔ اُس نے قرضہ کیوں دیا۔"

اگرچہ ابن مشعل کی باتوں سے میں سمجھ گئی تھی کہ اُس نے قرضہ کیوں دیا تھا مگر میں انجان بن کر کہا "نہیں"۔

وہ۔ "تمہیں معلوم ہے۔ تمہاری تصویر کس نے خریدی تھی"۔

میں۔ "آپ کو معلوم ہے"۔

وہ۔ "ہاں۔ ابن مشعل ہی نے وہ تصویر خریدی تھی۔

میں۔ "خریدی ہو گی۔ اس سے قرضہ کو کیا واسطہ۔

وہ۔ "معاف کرنا۔ مجھے خوف ہے تمہاری وجہ سے کوئی فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو"۔

میں۔ "کیا مطلب ہے۔ اس سے آپ کا ۔۔ ؟"

وہ۔ "مطلب کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے بعض ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ابن مشعل تمہیں حاصل کرنے کی فکر میں ہے"۔

یہ بات تو ابن مشعل نے خود مجھ سے کہی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر وہ مجھے حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ یہ سن کر میرے دل پر گھونسہ لگا میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "یا تو تمہیں اس بات کا یقین نہیں آیا یا یہ بات سُن کر حیرت ہوئی ہے۔

میں۔ "یہ دوسری بات ٹھیک ہے"۔

وہ۔ "آج حکومت میں جو اقتدار ابن مشعل کا ہے وہ کسی مسلمان کا بھی نہیں ہے۔ امیر اور وزیر تو درکنار سلطان تک اس کا بڑا لحاظ کرتے ہیں اسے بہت سی ایسی مراعات دی ہوئی ہیں جو سلطان ہی کو حاصل ہیں۔

یہ بات مجھے معلوم تھی۔ انہوں نے کہا "اچھا ناؤ۔" تم

میں نے انہیں تمام حال سنا دیا۔ انہوں نے کہا۔ ابن مشعل نے پھندا پھینک دیا ہے۔ کاش میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں ابن مشعل کا سارا قرضہ چکا دیتا اب بھی میں کوشش کروں گا۔ معاف کرنا مجھے ان حالات کا بالکل بھی علم نہیں تھا۔ ورنہ اگر کوئی مدد نہ کر سکتا تو غم میں شریک تو ہو جاتا۔

میں۔ "صاف بات یہ ہے کہ میرے دل کو آپ کی باتوں سے کچھ تسکین ہو جاتی ہے"۔

وہ ۔ اور انشاءاللہ اب میں قریب قریب روزانہ آتا رہوں گا تاکہ حالات معلوم ہوتے رہیں۔

کچھ دیر اور بیٹھ کر چلے گئے۔ میں بھی چلی آئی۔ چند روز کے بعد ابا جان واپس آگئے۔ وہ خوش تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ابن مشعل نے میری بڑی عزت و تکریم کی۔ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔

ہم نے جو قرضہ کی ادائیگی کے لیے مہلت چاہی تو اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے مہلت دیدی۔ تین مہینہ کی مہلت دی ہے۔

ہمیں اس بات سے خوشی تو ہوئی کہ اس نے مہلت دیدی۔ لیکن یہ فکر ہوا کہ تین مہینے میں روپیہ کہاں سے آئے گا۔ مگر ابا جان نے کہا کہ میں اس عرصہ میں ضرور انتظام کرلوں گا۔ اس سے کچھ اطمینان ہوگیا۔

مگر یہ اطمینان بہت جلد رخصت ہوگیا۔ ہوا یہ کہ ابا جان کے آنے کے دوسرے یا تیسرے روز رشید آگئے۔ ابا جان موجود تھے۔ وہ ان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے امی جان نے پھل دیکھ کہا کہ کھٹکا کر کے اپنے ابا جان کو بلا لینا۔ اور یہ پھل دیدینا۔

میں لیکر چلی جب کمرہ کے قریب پہنچی تو باتوں کی آواز کان میں آئی۔ میں نے سنا رشید کہہ رہے تھے "کیا تحریر لکھائی ہے ابن مشعل نے"

ابا جان نے کہا۔ صرف یہ لکھایا ہے کہ اگر تین مہینے میں روپیہ ادا نہ کروں تو اسے اختیار ہوگا کہ وہ کوئی ایک مطالبہ کرے ہمیں وہ مطالبہ منظور کرنا ہوگا"

رشید۔ یہ دستاویز بہت سخت ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا مطالبہ کرے۔

ابا جان۔ اس کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ انشاءاللہ اس عرصہ میں ہم روپے کا انتظام کردیں گے"

میں نے کھٹکا کیا۔ ابا جان آگئے۔ میں انہیں پھل دے کر چلی آئی۔

اڑتیسواں باب ۳۸

غلبۂ غم

زرقا نے بیان کیا۔

"میں وہاں سے آئی تو عجب الجھن میں پڑ گئی۔ رشید نے مجھ سے کہا تھا کہ "مجھے خوف ہے تمہاری وجہ سے کوئی فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو۔" یہ بھی کہا تھا کہ ابن مشعل تمہیں حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ اور آج ابا جان نے یہ بتایا کہ اگر تین مہینے میں اس کا قرضہ ادا نہ ہوا تو وہ جو مطالبہ کرے گا ابا جان کو منظور کرنا ہوگا۔"

ان باتوں سے میرا دل سا بیٹھ گیا۔ میرے دل نے کہا کہ تیری وجہ سے ضرور فتنہ اٹھے گا۔ تین مہینے کے اندر مطالبہ ادا نہ ہو سکے گا۔ اور ابن مشعل میرا مطالبہ ضرور کریگا۔ کیا ہوگا۔ اسوقت۔ کیا ابا جان اس کا مطالبہ منظور کر لیں گے۔ ۔ اگر نہ منظور کرینگے تو کیا ابن مشعل ان اختیارات کو استعمال نہ کرے گا۔ جو اس نے سلطان سے حاصل کر رکھے ہیں۔

ابا جان کو اس کی نیت معلوم نہیں ہے۔ وہ اسے نیک آدمی سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی سادہ لوحی سے جو اس نے کہا وہی لکھ دیا۔ جب قرضہ ادا نہ ہوسکیگا اور وہ میرا مطالبہ کریگا۔ آنکھیں کھلیں گی۔

مجھے اس خیال سے بڑی تکلیف ہوتی اور بڑا رنج ہوا۔ اس روز مجھے یہ خیال آیا کہ کاش میں اس جوہری کے پاس چلی جاتی جو نمائش میں آیا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ

اگر تصویر والی لڑکی مجھے مل جائے تو شیشہ کی الماری کے تمام زیور اسے پہنا کر اس کی نذر کر دوں۔ اگر وہ مجھے زیورات دیدیتا تو ہماری مشکل حل ہو جاتی۔ ان کو فروخت کر کے قرضہ ادا کر دیا جاتا۔

مجھے یہ غم کھائے جانے لگا۔ ایک روز عصر کے وقت رشید آئے۔ امی جان خادمہ سے کھانا پکوا رہی تھیں۔ میں نقاب ڈال کر رشید کے پاس چلی گئی وہ کئی روز میں آئے تھے۔ میں نے کہا "یہی وعدہ کیا تھا۔ آپ نے ——

وعدہ —— انہوں نے کہا۔ اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا "جی ہاں — وعدہ۔ آپ نے کہا تھا۔ قریب قریب روزانہ آتا رہوں گا"

وہ — میں ایک کام سے باہر گیا تھا"

میں — کب آئے آپ —؟"

وہ — کل شام کے وقت —"

میں — یہ بات شاید آپ کو معلوم ہو گئی ہو گی کہ ابن مشعل نے قرضہ کی ادائیگی کیلئے مہلت دے دی ہے۔

وہ — جی ہاں — معلوم ہو گئی ہے۔ مگر اس نے ہاتھ کاٹ لیے۔ میں تمہارے ابا جان کے"

میں — کیسے —؟"

وہ — اس نے تمہارے ابا جان سے ایک دستاویز لکھالی ہے۔ اس میں لکھ لیا ہے کہ اگر تین مہینے کے اندر مطالبہ ادا نہ ہوا تو جو مطالبہ وہ کریگا۔ تمہارے ابا جان کو منظور کرنا ہوگا"

میں۔ کیا مطالبہ کریگا۔ وہ یہی نہ کہ ہماری ساری املاک لے لیگا"

وہ — اگر وہ ایسا کرتا تو مہلت ہرگز نہ دیتا۔ اس نے مہلت دی ہے۔ وہ مطالبہ میں تمہیں طلب کرے گا۔

میں — کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ آخر اسلامی قانون کہاں چلا جائے گا۔ اسلامی حکومت کہاں چلی جائے گی۔

وہ — اس نے دستاویز ایسی لکھائی ہے کہ نہ قانون تمہاری مدد کرے گا اور

نہ اسلامی حکومت تم اور تمہارے ابا جان اس بات سے واقف نہیں ہو کہ یہودی بڑے قانون دان اور بڑی سوجھ بوجھ کے ہوتے ہیں۔ تم نے شائلاک یہودی کا قصہ نہیں سنا۔ وہ ایک عیسائی سے نفرت کرتا تھا۔ سخت نفرت وہ اسے تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اس عیسائی پر کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ ہمیشہ اس سے خندہ پیشانی سے پیش آتا اس کی مدارات کرتا۔ وہ یہودی عیسائی حکومت میں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس عیسائی کو یا اس کے دوست کو روپے کی ضرورت پیش آئی۔ اُس نے اپنے۔ یہ۔ یا اپنے دوست کے لیے اُس یہودی سے قرضہ لیا۔ یہودی نے اس سے ایک دستاویز لکھائی اور اس میں یہ لکھا لیا کہ اگر میعاد کے اندر روپیہ ادا نہ ہو تو عیسائی کو اپنے جسم کا ایک سیر گوشت جس جگہ سے یہودی طلب کرے گا۔ دوں گا۔ عیسائی نے یہ شرط لکھ دی اور روپیہ لے کر دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اب ایسا اتفاق ہوا کہ وہ عیسائی میعاد کے اندر روپیہ ادا نہ کر سکا۔ یہودی نے عیسائی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ مدعا علیہ سے اس کے جسم کا گوشت دلایا جائے۔

عیسائی قانون تھا۔ عیسائی حکومت تھی۔ اور عیسائی عدالت تھی۔ مگر اس عیسائی کی مدد نہ قانون کر سکا نہ حکومت کر سکی اور نہ عدالت۔ دستاویز صاف تھی۔ اس عیسائی نے ہر چند کوشش کی کہ شائلاک یہودی قرضہ سے دو چند مطالبہ لے لے۔ اور مقدمہ سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن یہودی نہ مانا۔ عدالت نے بھی یہودی کو سمجھایا۔ مگر وہ رضا مند نہیں ہوا۔ اور انصاف کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ عدالت مجبور ہو گئی۔ کہ یہودی کے حق میں فیصلہ دے اور عیسائی کے جسم سے ایک سیر گوشت اتروا دے مدعا علیہ کے وکیل کو ایک بات سوجھ گئی۔ اُس نے عدالت سے کہا۔" دستاویز میں ایک سیر گوشت اتارنا لکھا ہے۔ میرے موکل کو منظور ہے کہ عدالت یہودی کی ڈگری کر دے اور اس کو اجازت دیدے کہ وہ ایک سیر گوشت مدعا علیہ کے جسم سے اتار لے لیکن ایک سیر سے زیادہ گوشت نہ اتارے۔ پورا ایک سیر ہو اور یہ کہ خون کا ایک قطرہ نہ بہنے پائے۔ کیونکہ دستاویز میں ایک سیر گوشت لینے کا ذکر ہے۔ خون بہانے کا ذکر نہیں ہے اب تو شائلاک بہت چکرایا۔ وہ اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو گیا۔ لیکن

چونکہ اُس نے ایک عیسائی کی جان لینے کا ارادہ کیا تھا۔ اس لیے اس عیسائی قانون کے موافق سزا ملی؛؛

مجھے بھی یہ قصہ معلوم تھا۔ رشید نے کہا۔ شائلاک کے ہم قوم ابن مشتعل نے تمہارے ابا جان سے ایسی دستاویز لکھالی ہے۔ جس سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور قانون یا سلطان تمہاری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔

یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔ میں نے کہا۔ پھر کیا ہوگا؛؛

وہ ہے۔ وہی۔ جو میں تم سے کہہ چکا ہوں تمہاری وجہ سے ضرور فتنہ کھڑا ہوگا۔

میں چپ ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔ سنو زرقا میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ کہیں سے مجھے اتنی رقم مل جائے کہ تمہارے ابا جان کا قرضہ ادا ہو جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو میں اپنی جان کا مالک ہوں اور یہ جان تم پر تصدیق کر دوں گا؛؛

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے کمرہ کے باہر کچھ کھٹکا ہوا۔ میں گھبرا کر اُٹھنے لگی۔ ابھی اٹھی بھی نہ تھی کہ اماں جان اندر داخل ہوئیں۔ خوف سے میرا جسم کانپنے لگا۔ اور خون خشک ہو گیا۔ کیا جواب دوں گی۔ امی جان کو ایک نامحرم سے میں باتیں کر رہی تھی۔ اگرچہ میرے خیالات پاک تھے۔ دل پاک تھا۔ ضمیر پاک تھا۔ لیکن ان باتوں کو کون جانتا تھا۔ دنیا ہے۔ دنیا ظاہر کو دیکھتی ہے۔ اور ظاہر میں میں گنہگار تھی۔

امی جان کو دیکھ کر رشید بھی سہم گئے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ امی جان بڑے اطمینان سے دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے رشید سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا"، میں نے تمہاری باتیں سن لیں مجھے خوشی ہوئی کہ تم ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کرو؛؛

رشید خدا میں سب قدرت ہے۔ آپ نے میری باتیں سن لی ہیں۔ یہ جان آپ کے لیے حاضر ہے۔

امی جان نے مجھے اشارہ کیا۔ میں چلی آئی

اگرچہ امی جان نے انہیں یا مجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں خود ہی شرم سے کٹ گئی۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور شرم کی وجہ سے کئی روز

تک امی جان کے سامنے نہ جا سکی۔

ابا جان روپیہ کی فراہمی کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کہیں سے روپیہ نہ ملتا تھا۔ کوئی مہاجن بھی کسی شرط پر بھی روپیہ دینے کو تیار نہ تھا۔ اور تو اور کوئی ہمارے زیورات اور باغات تک خریدنے کو تیار نہ تھا۔

ابا جان نے دوسرے شہروں طنجہ العرائش میں کوشش کی۔ بڑی مشکل سے ایک یہودی نے وعدہ کیا۔ وہ بذات خود حویلی اور زیورات دیکھنے فاس میں آیا۔ مگر یہاں آکر جب اسے معلوم ہوا کہ ابن مسعل کے قرضہ کا انتظام کیا جا رہا ہے تو وہ بھی انکار کر کے چلا گیا۔

غرض روپے حاصل کرنے کی تگ و دو میں ڈھائی مہینے گذر گئے۔ صرف پندرہ دن باقی رہ گئے اور اس عرصہ میں قرضہ کا کچھ بھی انتظام نہ ہو سکا۔ اب ابا جان کو امی جان کو اور سب سے زیادہ مجھے فکر و تردد نے آگھیرا۔ پھر ہم غمگین اور پریشان رہنے لگے۔ اور یہ غم اور پریشانی روز بروز بڑھنے لگی۔

انتالیسواں باب ۳۹

تاوان کا مطالبہ

زرقا نے بیان کیا۔

اباجان نے ہر چند کوشش کی لیکن روپیہ فراہم نہ ہوا۔ اور جو مہلت ابنِ مشعل نے دی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اب یہ فکر ہوا کہ دیکھئے ابن مشعل کیا مطالبہ کرتا ہے۔

اباجان کو وہ باتیں معلوم نہیں تھیں جو مجھے اور رشید کو معلوم تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ابن مشعل ان کی جاگیر کا مکان کا اور زیورات کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن ایک روز انہوں نے امی جان سے کہہ دیا۔ ابن مشعل ہماری جائداد لے لیگا۔ مکان لے لیگا۔ اور زیورات لے لیگا۔ وہ ہمارے پاس کچھ نہیں چھوڑے گا۔ مگر ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں ہے۔ سعید ملازم ہو گیا ہے۔ ہم اُس کے پاس مراکو چلے جائیں گے۔ اور وہیں رہنے لگیں گے۔

میرے جی میں آئی کہ میں کہدوں کہ "اگر وہ اتنا ہی کرے تو ہم نفع میں رہیں گے مگر اس کی نیت کچھ اور ہے" لیکن نہ کہہ سکی۔ کیونکہ اگر وہ پوچھتے کہ اس کی نیت کیا ہے تو کیا جواب دیتی۔ کیسے کہہ دیتی کہ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مجھے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ وہ بدچلن اور اوباش قسم کا آدمی ہے۔ شراب پیتا ہے اور عیاشی کرتا ہے مجھے اس سے نفرت تھی۔ ایسی نفرت کہ میں اس کے محل میں ایک منٹ بھی رہنے کو تیار نہ تھی۔ میں خدا سے دُعائیں مانگا کرتی تھی کہ وہ میرا

مطالبہ نہ کرے۔

لیکن ساری دعائیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔ تین مہینے کی میعاد ختم ہو گئی۔ دس دن اور گذر گئے۔ ابا جان کچھ بے فکر سے ہو گئے۔ لیکن میرا فکر بڑھتا گیا۔ آخر پندرھویں روز ابن مشعل کا کارندہ آدھمکا۔ وہ وزیر اعظم کا مہمان ہوا۔ اور اس نے ابا جان کو بلایا۔ ابا جان تیار ہو گئے کہ جو کچھ وہ مانگے گا دیدینگے۔

چنانچہ وہ کارندہ سے ملے۔ کارندہ نے کہا۔ آپ نے اب تک روپیہ ادا نہیں کیا۔

ابا جان نے جواب دیا۔ میں نے ہر چند کوشش کی لیکن روپیہ فراہم نہیں ہوا۔

کارندہ۔ میں روپیہ لینے آیا ہوں۔ اب دیدیجئے۔"

ابا جان۔ اگر روپیہ ہوتا تو میں تازہ ہی میں آکر نہ دیدیتا۔"

کارندہ اور ابا جان میں جو گفتگو ہوئی وہ ابا جان نے امی جان سے بیان کی تھی اور میں سن لی تھی۔ کارندہ نے کہا۔ پھر کیا ارادہ ہے۔؟"

ابا جان۔ میرا ارادہ ہی کیا میں تو مجبور ہوں۔

کارندہ۔ آپ لکھ کر دے دیجئے کہ مجھ سے روپیہ انتظام نہیں ہو سکا۔ ابن مشعل جو مطالبہ کریں۔ وہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ابا جان نے یہ سمجھ کر کہ وہ جاگیر وغیرہ کا مطالبہ کرے گا۔ اسے لکھ کر دیدیا۔ اس نے تحریر اپنے قبضہ میں کر کے نہایت نرمی سے کہا۔ اب معاملہ کی گفتگو ہونی چاہیئے۔

ابا جان۔ میں تیار ہوں۔

کارندہ۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ابن مشعل کس قدر دولت مند ہے۔"

ابا جان۔ میں کیا ہر شخص جانتا ہے کہ ان سے زیادہ دولت مند اس زمانہ میں مراکش۔ اسپین۔ افریقہ اور مصر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ ان کے پاس بیشمار دولت ہے۔ وہ اگر چاہیں تو کئی سلطنتیں خرید لیں۔

کارندہ۔ جتنا روپیہ آپ پر ان کا قرض ہے۔ وہ ان کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

ابا جان۔ بیشک وہ اس سے زیادہ روپیہ روزانہ خیرات کر سکتے ہیں۔

کارندہ۔ یہی بات ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ قرضہ کی وصولی ذرا سختی سے کرتے ہیں۔"

اباجان۔ ہاں مجھے معلوم ہے۔"

کارندہ۔ یہ بات بھی ہے کہ وہ اقرار نامہ پر اقرار کرنیوالوں سے سختی سے عمل کراتے ہیں۔ وہ اس بات سے بہت ناراض ہوتے ہیں کہ لوگ معاہدہ کی خلاف ورزی کریں۔ اکثر لوگ نادہندہ ہوتے ہیں۔ قرضہ تو خوشی خوشی لے لیتے ہیں۔ اور ادا کرتے نہیں۔ اسی وجہ سے ابن مشعل نے حکومت سے مراعات حاصل کر لیں ہیں جس سے وہ اپنی مرضی کے مطابق قرضداروں سے قرضہ وصول کر سکیں۔ اور معاہدوں اور اقرار ناموں پر عمل کرا سکیں۔ حکومت اور سلطان ان کے کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔

اباجان۔ مجھے یہ سب باتیں معلوم ہیں۔

کارندہ۔ آپ نے قرضہ لیا۔ دستاویز لکھی اور دستاویز میں یہ لکھا کہ اگر ہم ایک سال کے اندر قرضہ ادا نہ کر سکے تو تاوان میں ابن مشعل جو طلب کریں گے۔ وہ ادا کریں گے۔ اس کے بعد تم نے تازہ میں جا کر کچھ قرضہ اور لیا اور اس دستاویز میں بھی یہ لکھ دیا۔ اگر یہ قرضہ پہلے قرضہ کے ساتھ ادا نہ کر سکا۔ تو ابن مشعل کو اختیار ہو گا کہ وہ تاوان میں میری عزیز سے عزیز چیز بھی طلب کریں گے تو بغیر کسی حجت اور بحث کے دیدوں گا۔ خواہ وہ میرے کسی عزیزہ ہی کو کیوں نہ طلب کریں۔ ان دونوں دستاویزوں کا مضمون تمہیں یاد ہو گا۔"

اباجان:۔ یاد ہے۔

کارندہ۔ جب تم میعاد کے اندر قرضہ ادا کر سکے تو تازہ گئے۔ تم نے مہلت طلب کی۔ ابن مشعل نے مہربانی کر کے تین مہینے کی مہلت دے دی اس وقت بھی تم نے ایک دستاویز لکھی۔ اور اس میں یہ اقرار کیا کہ اگر تین مہینے کی مہلت کے اندر قرضہ ادا نہ کر سکوں تو ابن مشعل جو مطالبہ کریں گے۔ پورا کر دوں گا۔

ابا جان - ہاں میں نے یہ دستاویز لکھی ہے -

کارندہ - آپ نے تین دستاویزیں لکھی ہیں - اور تینوں میں تاوان کا ذکر ہے - یہ بھی ذکر ہے کہ جو چیز وہ طلب کریں گے - آپ دیں گے - یہ قانونی باتیں ہیں - اور آپ انصاف اور قانون کی روح سے اصل قرضہ اور تاوان دونوں چیزیں ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں - کہیئے یہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں "

ابا جان :- ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں "

کارندہ :- اب یہ سمجھیئے کہ آپ قرضہ تو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں ہی - لیکن قرضہ کے علاوہ تاوان ادا کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں - اور اس تاوان کا قرضہ سے کوئی تعلق نہیں ہے - یعنی تاوان ادا کرنے کے بعد بھی آپ مطالبہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے -

ابا جان :- بلاشک "

کارندہ - لیکن ابن مشعل بہت نیک آدمی ہے - وہ کسی چیز پر جبر اور ظلم کرنا نہیں چاہتا - وہ آپ کے ساتھ بہت کچھ رعایت کرنے پر تیار ہے - جو قرضہ آپ پر ہے وہ معاف کر دے گا - اور جس قدر آپ پر روپیہ قرضہ کا ہے - اس سے دوچند آپ کو اور دے گا اگر آپ اس کا مطالبہ منظور کر کے ادا کر دیں گے - کہیئے آپ کے ساتھ یہ خاص رعایت ہے یا نہیں -

ابا جان اسوقت تک بھی کچھ نہیں سمجھے کہ ابن مشعل کیا چاہتا ہے اس کا مطالبہ کیا ہے - انہوں نے سادہ پن سے کہہ دیا - بلاشک یہ ان کی خاص رعایت ہے - میں ان کا مشکور ہوں "

کارندہ - اچھا تو سنیئے ابن مشعل کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ زرقا کی شادی اُسکے ساتھ کر دیں -

اب ابا جان کی آنکھیں کھلیں - یہ بات سنتے ہی ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی - انہیں سخت غم و قلق ہوا - اور غصہ بھی آیا - لیکن معاملہ ایسا نازک

تھا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ گم صم رہ گئے۔

کارندہ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کے تیور دیکھ کر یہ بات سمجھ گیا کہ انہیں یہ بات سخت ناگوار گزری ہے۔ اس نے سمجھانے کے طور پر کہا۔ آپ کو تو یہ بات سُن کر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس سے آپ کو کچھ خوشی نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ اگر آپ غور کریں تو آپ کے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہوگی۔ آپ کی بیٹی ابن مشعل کی تمام دولت کی مالک ہوگی ۔ عزّت اور ثروت کی مالک ہوگی۔ بیشمار لوگوں پر حکومت کرے گی۔ شہزادیوں سے زیادہ اس کی شان ہوگی۔ اور آپ جس قدر دولت چاہیں گے لے سکیں گے۔ آپ کی عزت بڑھ جائے گی۔ دولت آپ کے قدموں میں ہوگی۔ آپ بھی عیش و آرام سے زندگی گذار سکیں گے۔

ابا جان خاموش بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ ابن مشعل میرا مطالبہ کرے گا۔ ایک طرف ابن مشعل کی طاقت کا خوف تھا۔ دوسری طرف خاندانی شرافت اور اسلامی حمیت کا خیال تھا۔ وہ اس بات کو سُن کر خفا نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ دستاویزیں لکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کٹوا دیئے۔ دستاویزوں کی رو سے ابن مشعل کو یہ حق تھا کہ وہ مجھے مانگ سکے۔

ابا جان نے کچھ وقفہ کے بعد کہا۔ ابن مشعل خوب جانتے ہیں کہ وہ یہودی ہیں۔ اور میں مسلمان ہوں وہ اس قسم کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

کارندہ نے ایک حکمنامہ دکھایا۔ یہ حکمنامہ کارندہ کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ شیخ صالح سے دستاویزات کی تحریروں کے بموجب زرقا کا مطالبہ کیا جائے اور زرقا کو فوراً یہاں بھیجدیا جائے۔

ابا جان، ابن مشعل کی تحریر پہچانتے تھے۔ وہ اس حکمنامہ کو پڑھ کر دم بخود رہ گئے۔ اب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ابن مشعل نے انہیں بغیر سود کے قرضہ کیوں دیا تھا۔ اور قرضہ کی ادائیگی کے لیے تقاضا نہیں کیا تھا کیوں وہ دم دلاسا دیدے کر دستاویزیں لکھاتا رہا۔ وہ کارندہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ انہوں

نے اس سے صرف یہ کہا کہ "میں سوچ لوں"
کارندہ نے کہا۔ضرور سوچ لیجئے۔اگر آپ خوشی سے زرقا کی شادی منظور کرلیں گے تو جو کچھ طلب کریں گے۔آپ کو ابن مشعل دے گا۔اور اگر وہ حیل و حجت کرے گا تو وہ زبردستی زرقا کو لے جائے گا۔سوچ لیجئے کہ بہتری کس بات میں ہے۔

ابا جان وہاں سے چلے آئے۔وہ سخت پریشان اور غمزدہ تھے۔انہوں نے امی جان کو یہ تمام باتیں سنائیں۔میں نے بھی چھپ کر سن لیں۔مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ میں کانپنے لگی"

چالیسواں باب

ناکامی و نامرادی

زرقا نے بیان کیا۔

جس بات کا ڈر تھا۔ وہی سامنے آئی۔ میں بیان کر چکی ہوں کہ میں ابن مشعل سے نفرت کرتی تھی۔ اس سے شادی کرنا تو درکنار میرے لیے تو یہ بات بھی سوہان روح ہوجاتی کہ میں اس کے قصر میں سیر کرنے ہی کے ارادے سے جاؤں۔

میں روتی ہوئی اپنے کمرہ میں آئی اور آتے ہی بستر پر گر پڑی۔ میرے آنسو جاری ہوگئے۔ اور میں رونے لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم عورتوں کے آنسو بہت جلد نکل آتے ہیں یہی ہماری کمزوری کی دلیل ہے۔ مرد کتنے بھی پریشان اور غمزدہ ہوں۔ ان کے آنسو نہیں نکلتے۔

اس وقت میرے پاس کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو مجھے تسلی دیتا یا جس سے میں اپنا دکھڑا بیان کر کے اپنے غم کو کچھ ہلکا کر لیتی ۔ امی جان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ ابا جان سے کچھ کہنے کی تو ہمت ہی نہیں تھی۔ اگر بھائی جان ہوتے تو انہیں ضرور اپنا رازدار بنا لیتی۔ مگر وہ بھی نہیں تھے۔ مجھ سے کوسوں دُور مراکو میں تھے۔

رشید کی طرف خیال جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے جیسے آنا ہی چھوڑ دیا تھا کئی روز سے نہیں آئے تھے۔ حالانکہ انہیں ہماری پریشانیوں کا حال

معلوم تھا۔ ان کے نہ آنے سے میں یہ سمجھی کہ سیاہ بختی میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیا کرتا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

میں دیر تک روتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اب ابا جان کیا کریں گے۔ اس روز مجھ سے رات کا کھانا نہیں کھایا گیا۔ اور مجھ سے ہی کیا۔ امی جان اور ابا جان سے بھی نہ کھایا گیا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے ابا جان کی باتیں سُن لی ہیں۔ وہ از خود مجھ سے کہنا نہیں چاہتے تھے اور میں ان سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔

وہ رات میں نے بڑے کرب اور اضطراب میں کاٹی۔ جب کبھی ابن مشعل کا خیال آجاتا تو ہول سا طاری ہو جاتا۔ صبح میں نے نماز پڑھ کر خدا سے عافیت اور اپنی عصمت کی حفاظت کی دُعا مانگی۔ کچھ دِن چڑھے ابا جان لباس بدل کر چلنے لگے۔ میں دالان کے ستون کی آڑ میں کھڑی تھی انہیں دیکھنے لگی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اتفاق سے امی جان آگئیں۔ انہوں نے کہا "دونوں جگہ جانا"۔

ابا جان نے کہا۔ ارادہ دونوں ہی جگہ جانے کا ہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کونسی جگہ ہیں جہاں ابا جان جا رہے ہیں کیا وہاں سے مدد ملنے کی امید ہے؟ کیا کوئی ایسا ہے کہ جو اس وقت ہمارے آڑے آجائے۔ ہماری مدد کرے اور ہمیں تباہ ہونے سے بچالے۔

ابا جان چلے گئے اور میں "دونوں جگہ" کے معمہ کو حل کرتی رہ گئی۔ بہتیرا سوچا کوئی جگہ ایسی سمجھ میں نہ آئی جو ابن مشعل کی گرفت سے ہمیں نکالنے میں ہماری مدد کرنے پر تیار ہو سکتی۔

میں نے دیکھا کہ امی جان اور درجہ غمزدہ اور خاموش ہیں۔ وہ میرے سامنے سے کترا جاتی ہیں۔ اگر کبھی سامنا ہو جاتا ہے تو ان کی نگاہوں سے حسرت ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ اس بھول میں تھیں کہ مجھے ان کے غم کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے سب کچھ معلوم تھا۔ اور میں ان سے زیادہ غمزدہ تھی۔ ان سے زیادہ پریشان تھی۔

اور ان سے زیادہ تکلیف میں تھی۔

لیکن میں بھی ان پر اپنے غم کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ میں بھی انہیں اس مغالطہ میں رکھنا چاہتی تھی کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے چہرہ کو لبشاش بنا لیتی۔

ابا جان دوپہر تک واپس نہیں آتے۔ میں نے اور امی جان نے کھانا کھایا۔ کھانے کو دونوں کا جی نہ چاہتا تھا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ مگر دونوں اس لیے کھا رہی تھیں۔ کہ ایک دوسرے کو پریشان اور غمگین نہ سمجھے۔

کھانا کھا کر میں کتاب دیکھنے لگی۔ لیکن کتاب میں بھی جی نہ لگا سینے پرونے بیٹھ گئی۔ دراصل دل ٹھکانے نہیں تھا۔ اس لیے کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

مشکل سے دن کٹا۔ عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھی ہی تھی کہ ابا جان آگئے۔ ان کا چہرہ صبح سے بھی زیادہ اداس اور پھیکا تھا۔ وہ کبھی اس قدر پریشان نظر نہیں آئے جیسے اس وقت تھے۔۔۔

وہ سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔ امی جان نے انہیں آتے ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی پیچھے ہی پیچھے پہنچیں۔ اور میں کمرہ کے دروازہ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ امی جان نے پوچھا "کیا رہا۔۔۔؟"

ابا جان نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ناکامی رہی۔ کیسی عجیب بات ہے کہنے کو حکومت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن یہودیوں کے اثر میں ہے۔

امی جان۔ یہودیوں کی دولت نے مسلمانوں اور اسلامی حکومت کو خرید رکھا ہے۔۔۔

ابا جان۔ یہی بات ہے۔ ابن مشعل سے اراکین سلطنت وزراء۔ وزیر اعظم اور سلطان سب ڈرتے ہیں۔"

امی جان۔ ذرا مفصل سناؤ۔ کہاں کہاں گئے۔ کیا کیا ہوا۔"

ابا جان نے کہنا شروع کیا۔

"گردگشت کی دوڑ پھر رہا پر۔ میں سیدھا وزیر اعظم کے پاس گیا۔ خوش قسمتی سے

وہ نہال گئے۔ میں نے انہیں تمام روداد سنائی۔ انہوں نے بڑی توجہ سے سنی۔ مگر سب کچھ سن کر بولے۔ سید صاحب آپ نے اپنے ہاتھ تو خود کٹوا لیے ہیں۔ ایک دستاویز میں نہیں تین دستاویزوں میں لکھ دیا کہ وہ جو چاہے طلب کرے۔ اب قانون یا حکومت یا سلطان تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ غلطی ہو گئی۔ سیدھا ہونے کی وجہ سے دھوکا کھا گیا۔ للہ مدد کیجئے۔ ایک سید زادی کو بدکار یہودی کی ہوس رانی کا شکار ہونے سے بچا لیجئے۔ ورنہ نہ میں زندہ رہوں۔ نہ زرقا زندہ رہے گی۔ ہمارا خاندان مٹ جائے گا۔"

انہیں بڑا ترس آیا۔ انہوں نے کئی وزیروں کو بلایا۔ ان کے سامنے معاملہ رکھا۔ سب نے زبانی ہمدردی تو کی مگر کوئی ایسی بات نہ بتائی جس سے یہ بلا ٹل جائے بلکہ الٹا یہی کہنے لگے کہ "ابن مشعل کا مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔

میں نے ان سے کہا۔ میں سید ہوں۔ کیسے اس ذلت کو برداشت کروں۔

سب نے ایک زبان ہو کر کہا "جب قرضہ لے رہے تھے اور دستاویزیں لکھ رہے تھے اسوقت اس بات کو سوچتے۔"

یہ طمانچہ تھا۔ جو وزیروں نے میرے منہ پر مارا۔ واقعی مجھے اسی وقت سوچنا چاہیئے تھا۔ اب سوچنے سے کیا فائدہ تھا۔ اگر مجھے یہ بات معلوم ہوتی کہ قرضہ کا انجام یہ ہو گا۔ تو میں مر جاتا مگر قرضہ نہ لیتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے ان سے کہا۔ کہ سلطان کے حضور میں مجھے لے چلو اور میری سفارش کرو۔"

بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئے اور سب میرے ساتھ سلطان کے حضور میں پہنچے۔ وزیراعظم نے تمام حال سلطان کے گوش گذار کیا۔ سلطان ایک دم بگڑ گئے۔ انہوں نے کہا۔ تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ خود اپنے ہاتھ کٹوائے ہیں۔ خود قانونی شکنجہ میں جکڑے گئے ہو۔ اب حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے آئے ہو۔ حکومت تمہاری کیا مدد کر سکتی ہے۔ چلے جاؤ۔ ابن مشعل کا مطالبہ پورا کرو۔ تمہاری وجہ سے ابن مشعل کو خفا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے پاس دولت ہے۔ اور جس کے پاس دولت ہے۔ طاقت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

اب سلطان سے کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ رہی۔ میں اور سب وزیر اپنا سا

نہ سے لَر چلے آئے۔ ان دونوں جگہ سے کچھ امید تھی۔ اور دونوں ہی جگہ سے جواب مل گیا —

وفورِ غم سے میرا دل ٹوٹنے لگا۔ میں اپنے کمرہ میں چلی آئی اور خوب روئی — میں نے ارادہ کیا کہ خودکشی کر لوں۔ دوپٹہ کا پھندہ بنایا۔ مگر فوراً ہی خیال ہوا۔ کہ خودکشی گناہ عظیم ہے۔ اس لیے رُک گئی۔

اکتالیسواں باب (۴۱)

آہ وزاری

زرقا نے بیان کیا۔

اس رات کو ہم میں سے کسی کو بھی کھانا کھانے کا ہوش نہ رہا۔ بھوکے ہی پڑ گئے۔ البتہ نمازیں سب نے خشوع اور خضوع سے ادا کیں۔ دل سے دعائیں بھی مانگیں۔ لیکن جیسے ہماری دعاؤں میں اثر ہی نہ رہا تھا۔ کیونکہ اگلے روز کچھ دن چڑھے ابن مشعل کا کارندہ مکان پر آیا۔ اُسے دیوان خانہ میں بٹھایا گیا۔ ابا جان ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر امی جان نے سمجھایا کہ ملنا ضرور چاہیئے۔ ورنہ معلوم نہیں وہ کیا فتنہ اٹھا کھڑا کرے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ ملنے چلے گئے۔

دیوانخانہ کا ایک دروازہ بھائی جان کے کمرہ میں تھا۔ میں اس کمرہ کی صفائی کے بہانہ سے وہاں پہنچی۔ اور دروازہ سے کان لگا کر سننے لگی۔

ابا جان کے بیٹھتے ہی کارندہ نے کہا "کہیئے کیا طے کیا آپ نے۔"

ابا جان نے کہا "اس بات کے علاوہ ابن مشعل مجھے جو حکم دیں گے میں اس کی تعمیل کرنے کو تیار ہوں۔"

کارندہ۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ کل تم کہاں کہاں گئے کس کس سے مدد کی درخواست کی اور تمہیں کیا کیا جواب ملے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ کہ ابن مشعل نے سلطان سے ایسی مراعات حاصل کر لی ہیں جس سے وہ اپنے

مقروضوں سے آسانی کے ساتھ قرضہ وصول کر سکیں۔ اور مقروض جو عہد و اقرار کریں۔ انہیں پورا کرا سکیں۔ سلطان کوئی مداخلت نہیں کر سکتے۔ لیکن تم نے پھر بھی وزیروں سے مدد چاہی اور سلطان کا دروازہ جا کھٹکھٹایا مگر کوئی تمہاری مدد کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ سلطان نے تمہیں جھڑک دیا۔ ابن مشعل کا یہ اقتدار اور رعب و خوف ہے کہ جن لوگوں کے پاس تم گئے۔ انہوں نے خود مجھ سے تمام حال بیان کر دیا۔ یہاں تک کہ سلطان نے بھی مجھے تمہارا قصہ سنا دیا کہ وہ کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کریں گے۔ ابن مشعل کو اطلاع دیدو کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے شیخ صالح نے تاوان اور مطالبہ وصول کرے۔ اب میں اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم سے آخری جواب لے لوں۔

ابا جان۔ میں نے زرقا کی شادی کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اس لیے اس کی شادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کارندہ۔ ابن مشعل نے شادی کے متعلق نہیں لکھا۔ یہ تو میری تجویز تھی کہ اگر تم خوشی سے تیار ہو جاؤ تو میں انہیں اس بات پر آمادہ کر دیتا کہ وہ زرقا کو باقاعدہ نکاح کر کے لیجائیں۔ تمہارا قرضہ معاف کر دیں۔ اور تمہیں قرضہ سے دو چند روپیہ اور دیدیں۔ تم نے ان کی تحریر دیکھی۔ انہوں نے مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ زرقا کا مطالبہ کروں۔ اگر آپ حیل و حجت کریں گے تو زبردستی زرقا کو حاصل کر لیا جائے گا۔ اور قرضہ کی وصولی میں تمہاری جاگیر، جائداد اور زیورات وغیرہ سب قرق کر کے نیلام کر دیتے جائیں گے۔ اب تم سوچ لو کہ پہلی تجویز کو مناسب سمجھتے ہو یا دوسری کو۔

ابا جان۔ کیا آپ زرقا کو زبردستی لیجائیں گے؟

کارندہ۔ بالکل۔ اگر تم خوشی سے اس کی شادی نہ کرو گے تو ہم زبردستی اٹھا لے جائیں گے؟

ابا جان۔ اور مسلمان اس بات کو گوارا کر لیں گے۔

کارندہ مسلمانوں کو گوارہ کرنا پڑے گا۔ تمہارے شہر کے امیر اور حکومت کے مشیر اور وزیر اور سلطان سب ابن مشعل کے مقروض ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں لب کشائی نہیں کر سکتا۔ رہے عام مسلمان ان کا یہ حوصلہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مداخلت کر سکیں۔ اگر مداخلت کریں گے تو ابن مشعل کے سپاہی یہاں آ جائیں گے اور

انہیں مار مار کر سیدھا کر دیں گے۔ حکومت کے سپاہی بھی ہماری مدد کریں گے۔

کارندہ سچ کہہ رہا تھا۔ ابن مشعل کے بڑے بڑے لوگ سب مقروض تھے۔ یہاں تک کہ سلطان بھی مقروض تھے۔ ایک تو سلطان طبیعت کے بہت کمزور تھے۔ دوسرے ان کے مصاحب اور وزیر ابن مشعل کے مقروض تھے۔ وہ ہر معاملہ ابن مشعل کی طرفداری کرتے تھے۔ اس لیے سلطان ان سے ڈرتے تھے۔ حکومت کا نظام درست نہیں تھا سلطان کو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اور انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ ہماری وجہ سے ابن مشعل سے بگاڑ کرتے۔ انہیں یہ بھی خوف تھا کہ کہیں یہودی بغاوت نہ کر دیں اور ان کے بھتیجے ابو عبداللہ متوکل کی مدد کر کے انہیں معزول کر کے تخت سے نہ اتار دیں۔ اس لیے وہ یہودیوں کے ساتھ کچھ کر ہی نہ سکتے تھے۔ بلکہ یہودیوں کی چاپلوسی میں لگے رہتے تھے۔ خانہ جنگی نے سلطنت کو ابتر کر رکھا تھا۔ اور ملک میں بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ ابن مشعل زور پکڑ گیا تھا۔ سلطان اس سے ڈرتے تھے۔ عام مسلمان بھی اس سے خائف رہتے تھے۔ اور ابن مشعل کی وجہ سے تمام یہودیوں کا اثر اقتدار بڑھ گیا یہودی مسلمانوں کی کوئی اصل و حقیقت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اسلامی حکومت تھی۔ مگر اس حکومت میں مسلمان ہی کمزور تھے۔ یہودیوں سے ڈرتے تھے۔ اور یہودی جس طرح چاہتے تھے مسلمانوں کو دبا لیتے تھے۔ مسلمان کوئی داد فریاد بھی نہ کر سکتے تھے۔

ابا جان: ۔یہ سمجھ لیجئے کہ ہاشمی خون میری رگوں میں ہے اور میں اس ذلت کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

کارندہ ۔جس بات کو تم ذلت سمجھ رہے ہو۔ وہ بڑی عزت کی بات ہے۔ اب تم یہ سمجھو کہ ایک طرف دولت ہے۔ عزت ہے اور شہرت ہے اور دوسری طرف

---

۵ مغرب اقصیٰ کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھا ہے۔ کہ شہر تازہ کا ایک کروڑپتی یہودی ابن مشعل بوجہ بدانتی اور خدنگی کے بہت زور پکڑ گیا تھا۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا۔ جہاں کے باشندے اس کے مقروض نہ ہوں۔ ملک کا ساہوکارہ اسی کے دم سے تھی۔ سلطنت ان کی مقروض تھی اور شہر فاس کا ہر فرد اس کے سود در سود کے جال میں جکڑا ہوا تھا۔

(صادق۔ صدیقی۔ سردھنوی)

افلاس ہے ۔ ذلت ہے اور موت ہے ۔"

ابا جان :۔ میں موت کو ترجیح دوں گا ۔

کارندہ نے بگڑ کر کہا ۔ تمہاری موت بھی زرتاکو بچا نہ سکے گی ۔ جہاں تک مجھ سے کا تعلق ہے میں نے بتا دیا ۔

وہ اٹھ کر چلا گیا ۔ میں نے کمرہ صاف کیا اور وہاں سے چلی آئی ۔ امی جان اور ابا جان باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر امی جان نے بلایا ۔ میں چلی گئی ۔ اور سر جھکا کر ان کے پاس بیٹھ گئی ۔ ان کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا ۔ وہ ضبط کر رہی ہیں ۔ وہ مجھے دیکھ رہی ہیں ۔ اگرچہ میں نے سر جھکا رکھا تھا ۔ مگر سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہیں ۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی سسکی کی آواز آئی ۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ۔ وہ رو رہی تھیں ۔ میں بے چین ہو گئی ۔ میں نے کہا ۔ امی جان "

اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکی ۔ میرا دل بھر آیا ۔ اور میں ان کی گود میں جا پڑی ۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ۔ میں نے کہا ۔ امی جان تم رو رہی ہو ۔

وہ اور بھی زار زار رونے لگیں ۔ انہوں نے کہا ۔ ہاں میں رو رہی ہوں ۔ میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا ۔ کیوں ؟

امی جان ۔ میری بچی ۔ ہمارے خاندان پر مصیبت آن پڑی ہے ۔

بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا ۔ اور یہ مصیبت میری وجہ سے ہے ۔"

اس نے دیکھا امی جان اور ابا جان دونوں کو بڑی حیرت ہوئی ۔ امی جان نے پوچھا "تجھے معلوم ہے ۔"

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ۔ مجھے اقرار کرنا پڑا ۔ میں نے کہا "جی ہاں مجھے معلوم ہے ۔ میں بھائی جان کا کمرہ صاف کر رہی تھی ۔ میں نے ابن مشعل کا کارندہ کی باتیں سنی ہیں ۔"

میں نے دیکھا ۔ کہ ابا جان کو اور بھی صدمہ ہوا ۔ امی جان نے کہا ۔ بیٹی ہم نے اس بات کو تجھ سے بہت چھپانا چاہا ۔ مگر اب ارادہ کر لیا کہ تجھے سب کچھ بتا دیں گے ۔ اچھا ہوا تجھے خود ہی تمام باتیں معلوم ہو گئیں ۔

ابا جان کہیں اُٹھ کر چلے گئے ۔ امی جان نے کہا۔ نور چشمی۔ تیرا کیا مشورہ ہے؟
میں نے عرض کیا۔ میری جان آپ کی ہے۔ آپ اور ابا جان جو حکم دیں گے۔ میں اس کی تعمیل کروں گی۔
امی جان۔ تجھ سے یہی امید ہے۔ مگر ہم اس ذلت کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔
میں۔ امی جان! یہ سمجھئے کہ میں اس یہودی سے سخت نفرت کرتی ہوں۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ قرضہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے ہی اسے ادا کرنا چاہیئے اور اگر میری وجہ سے قرضہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہ میرا فرض تھا کہ میں اپنے والدین کی مدد کروں۔ ان کی عزت بچانے کے لیے خود قربان ہو جاؤں۔ مجھے اس یہودی کتے ابن مشعل کے قصر میں بھیج دیجئے۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔
امی جان۔ رو تو رہی ہی تھی۔ اور بھی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ انہوں نے مجھے سینہ سے لگا لیا۔ اور کہا۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ ہرگز نہ ہوگا۔
میں۔ مگر وہ مجھے زبردستی اٹھوا لیجائے گا۔
امی جان۔ ہماری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔"
میں۔ تب سنیئے۔ وہ میری زندگی میں میرے آنچل کو بھی نہیں چھو سکتا۔
اس وقت اسماعیل ہمارا غلام آ گیا۔ مجھے اس نے گود کھلایا تھا۔ میں اس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اور امی جان نے اسے پالا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ میں نے دیکھا۔ اس کے چہرہ سے جوش اور غصہ کے آثار ظاہر تھے۔

بیالیسواں باب ۴۲

وفادار غلام

زرقا نے بیان کیا۔

" میں اسمٰعیل کو دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اور امی جان بھی رو رہی تھیں۔ اسماعیل نے کہا۔ یا سیدہ امی جان کو وہ یا سیدہ کہا کرتا تھا مجھے مولائی نے ابا جان کو وہ مولائی کہا کرتا تھا۔ تمام حالات سنا دیئے ہیں۔ جب میں آپ کے ساتھ تازہ گیا تھا۔ تو مجھے وہاں ابن مشعل کی بدکاری اور شراب خوری کے حالات معلوم ہوئے تھے۔ مجھے اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ کہیں وہ سیدہ زادی کو نہ دیکھ لے۔ اور فتنہ کوئی نہ کھڑا کرے۔ آخر وہی ہوا "

امی جان نے کہا۔ غلطی ہماری ہی ہے۔ ہم نے یہ نہ سمجھا کہ وہ یہودی ہے۔ مطلبی، خود غرض۔ بے رحم اور سفاک۔ ہم نے اس سے قرضہ لیا۔ تعلقات بڑھاتے۔ اسے نیک اور رحمدل کہتے رہے۔ اس کی نیت کو نہ پہچانا۔ ان کے دل کو نہ ٹٹولا۔ جو وہ کہتا رہا ہم کرتے رہے جو وہ لکھاتا ہم لکھتے رہے۔ ہماری صاف دلی اور سادگی سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اب ہماری عزت کا خواہاں ہے۔ ہمارے ناموس کا خواہاں ہے۔ اللہ ہی ہماری عزت و آبرو کا نگہبان ہے "

اسمٰعیل :- اگر ہم حکام سے شکایت کریں۔ حکومت سے مدد چاہیں تو کیا ہماری شنوائی نہ ہوگی۔

امی جان ۔ حکام اس کے مقروض ہیں ۔ حکومت اس کے سامنے بے بس ہے ۔ آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کی حکومت برائے نام ہے ۔ یہودیوں کا حکومت پر قبضہ ہے احکام یہودیوں کے اشارہ پر ناچتے ہیں ۔

اسمٰعیل :۔ سلطان سے کیوں نہ فریاد کریں ۔ وہ ضروری فریاد سنیں گے ۔"

امی جان ۔ بھولے جوان ۔ سلطان بھی ابن مشعل کے بس میں ہیں ۔ حکام حکومت اور سلطان کوئی بھی ہماری مدد نہیں کر سکتے ۔"

اسماعیل :۔ جاگیر ۔ قرضہ میں دیدیجئے ۔ میں محنت کروں گا ۔ اور اس گھر کا خرچ چلاؤں گا ۔

امی جان ۔ تمہیں سب باتیں معلوم نہیں ہیں ۔ جاگیر، مکان اور زیورات سب فروخت کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خریدار نہیں ہوا ۔ اول تو مسلمانوں کے پاس پیسہ نہیں ۔ اور جن کے پاس پیسہ ہے ۔ وہ ابن مشعل سے ڈرتے ہیں ۔ اس لیے نہیں خریدتے کہ ابن مشعل کی مرضی کے خلاف ہوگا ۔ اور وہ انہیں تباہ کر دیگا ۔ اب رہے یہودی ۔ وہ کیوں خریدیں ۔ وہ ابن مشعل کے اشاروں پر چلتے ہیں ۔ انہیں معلوم ہے کہ ابن مشعل نے کیا جال پھیلایا ہے ۔ وہ بات بھی نہیں کرتے ۔

اسمٰعیل ۔ تب مجھے فروخت کر ڈالو ۔ یقین ہے میری قیمت اچھی اُٹھ جائے گی ۔

امی جان ۔ اوّل تو ہم نے تمہیں پرورش کیا ہے ۔ ہم اس بات کو ہرگز بھی گوارا نہیں کر سکتے ۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت بند ہوگئی ہے صرف غیر مسلم غلام اور کنیزیں خریدی اور بیچی جا سکتی ہیں ۔

اسمٰعیل ۔ مجھے یہ بات معلوم ہے کہ حکومت کا قانون یہ ہے کہ مسلمانوں غلاموں اور کنیزوں کو ان کی مرضی کے خلاف نہیں بیچا جا سکتا ۔ میں تو خود بکنا چاہتا ہوں ۔ مجھے بکنے سے قانون نہیں روک سکتا ۔

امی جان ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ مگر ہماری حمیت اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی ہے کہ ہم اپنے پروردہ کو بیچ ڈالیں ۔"

اسماعیل :۔ آپ نہ بیچیں ۔ میں خود جا کر بک جاؤں گا ۔ غلاموں کی منڈی میں

چلا جاؤں گا۔ میں جوان ہوں۔ تندرست ہوں۔ میرے خریدار بہت پیدا ہو جائینگے۔ جو زیادہ قیمت دے گا۔ وہی خریدیگا۔

امی جان۔ نہیں۔ نہیں۔ ہم ایسا نہ ہونے دیں گے۔"

اسماعیل:۔ مجھے آپنے پالا ہے۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آج آپ پر وقت آپڑا ہے۔ اگر میں اسوقت کام نہ آؤں گا تو میرا ضمیر مجھ پر لعنت کرے گا۔ میں خود اپنی نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ جاؤں گا۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجیے۔

امی جان۔ نہیں اسماعیل۔ ایسا نہ ہو گا۔ ہماری غیرت اور ہماری وہ محبت جو تیرے ساتھ ہے اس بات کو گوارہ نہ کرے گی۔

اسماعیل۔ تو کیا میری حمیت اس بات کو گوارا کرے گی کہ میں آپ کے کام نہ آؤں۔"

امی جان۔ کیا تم بھی اس برُے وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو۔"

اسماعیل۔ رب کعبہ ہرگز نہیں۔ مجھے آپ کے گھر کا دروازہ چھوڑتے ہوئے بڑا قلق ہو گا۔ اور ممکن ہے کہ یہ قلق سوہانِ روح بن کر میری جان ہی لے لے۔ مگر جہاں مجھے اس گھر کو جس میں آکر میں نے ہوش سنبھالا۔ پلا۔ بڑھا، جوان ہوا۔ چھوڑنے کا صدمہ ہو گا۔ وہاں یہ خوشی بھی ہو گی کہ میں اپنے پالنے والوں کے کچھ کام آسکا۔ کیا یہ بات میرے لیے فخر کی نہ ہو گی۔

امی جان۔ تمہارے لیے ضرور فخر کی ہو گی۔ لیکن ہمارے لیے بے عزتی کی ہو گی۔ دنیا کہے گی کہ جاگیر نہ بیچی۔ جائداد نہ بیچی، زیورات نہ بیچے، ایک بیچارہ غلام تھا۔ اسے بیچ دیا۔"

اسماعیل:۔ مگر آپ کہاں بیچ رہی ہیں۔ غلام کو، غلام تو خود بک رہا ہے۔"

امی جان:۔ نہیں اسماعیل۔ میری زندگی میں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تم سب ساتھ رہیں گے اور جو افتاد پڑے گی اسے ساتھ ہی بھگتیں گے۔"

اسماعیل: مگر مجھے عمر بھر اس بات کا قلق رہے گا کہ میں اپنے آقا کے کچھ کام نہ آیا۔"

امی جان۔ اسمٰعیل، تم نے وہ باتیں کہیں جو ایک وفادار شخص کو کہنی چاہیئے تھیں۔ تمہارا جذبہ قابلِ احترام ہے۔ ہم شکر گذار ہیں کہ تم ہمارے آڑے وقت میں کام آنے کے لیے بکنے تک کو تیار ہو۔ مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ قرضہ اتنا زیادہ ہے کہ

تمہارے بکنے سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

اسماعیل:۔ میں نے محنت مزدوری کر کر کے کچھ روپیہ جمع کیا ہے اور وہ یہ حاضر ہے۔ یہ روپیہ اور میری قیمت تو شاید اتنی ہو جائے کہ قرضہ ادا ہو سکے۔

اسمٰعیل نے ایک تھیلی نکالی اور اسے ہمارے سامنے الٹ دیا۔ اس میں پانچسو دینار یعنی اشرفیاں تھیں۔ خدا جانے بیچارے نے یہ اشرفیاں کس کس طرح سے جمع کی تھیں۔ امی جان بھی اور میں بھی اسمٰعیل کی بہت زیادہ مشکور ہوئیں۔ امی جان نے کہا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ اسمٰعیل۔ تم نے آج اپنی محبت اور وفاداری کا پورا پورا ثبوت دیدیا۔ یہ اشرفیاں تمہیں ہی مبارک ہوں۔ تمہیں ایک بات معلوم نہیں ہے۔"

اسمٰعیل:۔ کیا ——؟

امی جان:۔ اب روپے کی ادائیگی کا سوال نہیں ہے۔ روپیہ میعاد کے اندر ادا ہونا چاہیئے تھا۔ میعاد گذر گئی اور روپیہ ادا نہیں ہو سکا۔"

اسمٰعیل:۔ اگر میعاد کے اندر ادا نہیں ہو سکا تو کیا ہوا۔ اب ادا کیا جا سکتا ہے۔"

امی جان۔ اب پہلے وہ مطالبہ پورا نہ ہونا چاہیئے۔ جو ابن مشعل نے کیا ہے۔ کیونکہ دستاویزوں میں یہ لکھا ہے کہ اگر میعاد کے اندر روپیہ ادا نہ ہوا تو ابن مشعل جو تاوان طلب کرے گا یا جو مطالبہ کریگا۔ وہ پورا کرنا ہوگا۔ اب وہ روپیہ طلب نہیں کرتا۔ زرقا کا مطالبہ کرتا ہے۔"

اسمٰعیل نے دانت پیس کر کہا۔ خلیث کا بچہ ابن مشعل۔"

امی جان۔ اسمٰعیل، اب ہماری مدد نہ حکام کر سکتے ہیں۔ نہ حکومت کر سکتی ہے۔ اور نہ سلطان کر سکتے ہیں۔ صرف خدا کر سکتا ہے۔ اس بے غیرتی سے ہمیں موت آجائے تو اچھا ہے۔"

"موت ——" اسمٰعیل نے کہا۔ اور کچھ سوچ کر بولا۔" بیشک موت ہی اس قضیہ کو طے کر سکتی ہے۔ مگر تمہاری نہیں۔ ابن مشعل کی موت میں اسے ٹھکانے لگاؤں گا۔ میں اسے موت کی گود میں پہنچاؤں گا۔"

امی جان:۔ ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ اسمٰعیل، ابن مشعل تک پہنچنا بڑا

مشکل ہے۔ اس کے پاس بے شمار غلام ہیں۔ خادم ہیں۔ سپاہی ہیں۔ تمہاری رسائی اس تک نہیں ہو سکتی۔

اسماعیل۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں اسے ضرور قتل کروں گا۔"

اسمٰعیل کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ امی جان نے سمجھ لیا کہ اس نے جو بات طے کر لی ہے۔ اسے ضرور کر کے رہے گا۔ انہوں نے کہا۔ بیٹا۔ یہ بات بڑے خطرہ کی ہے تم اس کا خیال نہ کرو۔"

مگر اسماعیل ارادہ کر چکا تھا۔ اُس نے کہا" میں اس خطرہ کو مول لوں گا۔ ضرور لوں گا۔ تم سب سُن لو گے کہ میں نے کیا کیا۔

وہ چلا۔ امی جان گھبرا گئیں۔ میں نے کہا" بھائی اسمٰعیل، سنو۔"

وہ لوٹا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے بھائی کی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور کہا" تم نے مجھے بھائی کہا۔ میں اس عزت کے قابل کب ہوں۔"

میں نے کہا۔ اب تم میرے بھائی ہو۔ بہن کی بات مانو۔ ابھی ابنِ مشعل کو اسکے حال پر چھوڑ دو۔ اور دیکھو قدرت کیا کرتی ہے۔

اسماعیل۔ میں بہن کی بات مانوں گا۔ لیکن میری زندگی میں ابن مشعل میری بہن کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔

ہم پر اسماعیل کی وفاداری کا اور اسمٰعیل پر ہماری شفقت اور محبت کا بڑا اثر ہوا۔"

تینتالیسواں باب ۴۳

عجیب اُلجھن

زرقا نے بیان کیا۔

"ہمارے دن بڑے ہی کرب و اضطراب میں گذر رہے تھے۔ ابن مشعل کا کارندہ چلا گیا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اب اس کا کوئی عتاب نازل ہوگا اور اب کوئی تازہ آفت آئے گی۔

ہمارا معاملہ طشت از بام ہو گیا تھا۔ شہر فاس کے تمام باشندوں کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ہم پر ابن مشعل کا قرضہ ہے۔ اور ابن مشعل نے میری خواستگاری کی ہے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نمائش میں جس تصویر کی دھوم ہو گئی تھی۔ وہ میری تھی۔ اس سے میرے حسن کا چرچا اور میرے حسن کے چرچے کے ساتھ ابن مشعل کا ذکر بھی گھر گھر ہونے لگا۔ سب کو ہمارے خاندان سے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لیکن وائے بدنصیبی کوئی بھی ہماری مدد نہ کر سکا۔ سب ابن مشعل اور حکومت سے ڈرتے تھے۔

آخر وہ دن آگیا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ابن مشعل نے وزیر اعظم کو لکھا کہ فوراً شیخ صالح کو مجبور کرو کہ وہ زرقا کو دُلہن بنا کر بہت جلد میرے پاس بھیج دے۔

وزیر اعظم نے ابا جان کو بلا کر سخت ہدایت کی اور حکم دیا کہ وہ بہت

جلد مجھے دلہن بنا کر تازہ بھیج دیں۔

ہم سب پھر غم و قلق میں مبتلا ہو گئے۔ اور امی جان کو سوائے رونے کے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ ابا جان غم و فکر میں گھل گھل کر اچھے خاصے بیمار معلوم ہونے لگے تھے۔

کیا غضب تھا کہ کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سب ابن مشعل سے ڈرتے تھے۔ لوگوں کو ہم سے ہمدردی ضرور تھی۔ مسلمان یہ نہیں چاہیئے تھے کہ ایک مسلمان لڑکی یہودی کے حرم میں جائے۔ انہیں حکومت پر بھی غصّہ تھا کہ وہ کوئی حرکت نہیں کرتی تھی۔ مگر بیچارے عوام بھی ہماری کچھ مدد نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ کوئی بھی بڑا آدمی سہارا دینے کو تیار نہ تھا۔

رشید ایک عرصہ سے نہیں آئے تھے۔ مجھے ان پر بڑا غصّہ آ رہا تھا۔ سوچتی تھی بُرے وقت میں انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن دِل اب بھی ان کی طرفداری کر رہا تھا۔ کہتا تھا یا تو وہ کسی اہم کام میں مصروف ہیں۔ یا خدانخواستہ بیمار ہو گئے ہیں۔

ایک روز رشید آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی پہلے تو مجھے غصّہ آیا اور سوچا ان کے پاس نہ جاؤں۔ ان سے بات بھی نہ کروں۔ لیکن یہ غصّہ بڑا ہی پھس پھسا نکلا۔ ذرا دیر بھی تو قائم نہ رہا۔ یہ خیال ہوا کہ پوچھوں تو کیا بات ہو گئی تھی۔ کیوں نہ آ سکے تھے۔ چنانچہ میں ان کے پاس گئی۔ وہ حسب عادت سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس روز مجھے نقاب کا خیال ہی نہ رہا بے نقاب ہی ان کے سامنے چلی گئی۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں ایک کرسی پہ جا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

میں انہیں ہمدرد سمجھتی تھی۔ اور کسی ہمدرد کا مصیبت کے وقت آنا دِل پر اثر کیا کرتا ہے۔ میرے دِل پر بھی اثر ہوا۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو ــــ"

مجھے ناگوار ہوا کہ وہ سب جانتے ہوتے بھی انجان بن رہے ہیں۔ میں نے طنز سے کہا۔" جی

رشید۔ تم بھولتی ہو کہ تم عورت ہو۔ اور عورت مرد سے کم نہیں ہوتی "
مجھے طرارہ آگیا ۔ میں نے کہا "آپ مجھے طعنہ دے رہے ہیں "
رشید :۔ میری یہ مجال نہیں ہے ۔ میں تو ایک بات تمہیں یاد دلا رہا ہوں ۔ مرد کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے ۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں "
میں جل گئی ۔ میں نے سوچا یہ بھی مجھے کچوکے دینے آئے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ خوب چرکے لگاؤ ۔ اور کونسا وقت آئے گا میرے ستانے کیلئے ۔
وہ :۔ ارے تم ایسے خیال کر رہی ہو ۔ تعجب ہے ۔
میں ــ میں جانتی تھی کہ تم مرد ہو ۔ اور مرد وفادار نہیں ہوا کرتے ۔
وہ ہنسے انہوں نے کہا ۔ چلو ، غصہ سے یہ فائدہ تو ہوا کہ تکلف جاتا رہا ۔ لفظ "آپ" ، سے تکلف اور مغائرت ظاہر ہوتی تھی ، "تم" سے یگانگت کی بو آتی ہے ۔ مگر آخر تم نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے ۔
میں ــ جیسے کچھ خبر ہی نہیں ہے "
وہ ــ کچھ بتاؤ تو خبر ہو "
میں ۔ کیا ابن مشعل کے مطالبہ کی خبر نہیں ہے تمہیں ۔ ؟"
وہ ــ اوہ ، یہ بات ہے ۔ خبر ہے ۔ اُسنے تمہاری خواستگاری کی ہے ۔ کیا حرج ہے اِس میں "
مجھے بہت ناگوار ہوا ۔ میں نے کہا ۔ تم مسلمان ہو کر اِس بات کو بُرا نہیں سمجھتے "
وہ ــ سنو زرقا ۔ وہ دولت مند ۔ مغرب اقصیٰ کا سب سے بڑا دولتمند ہے ۔ تمہیں شہزادیوں سے بھی اچھی طرح رکھیگا "
میں غصہ سے بیتاب ہو گئی ــ میں نے کہا ۔ میں اس پر اور اس کی دولت پر لعنت بھیجتی ہوں ۔ میں اس کے نام کا کتا بھی نہ پالوں ۔ وہ میرا آنچل تک نہیں دیکھ سکتا "

میں اٹھی اور چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ انہوں نے کہا۔ بگڑ کر نہ جاؤ۔ ذرا تھا بیٹھو اور میری باتیں سنو۔"

میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔ ہمیں پیکرِ غم نہیں بننا چاہیئے۔ بلکہ ایسا ہی پیکرِ جلال بننا چاہیئے۔ جیسا اس وقت بن گئی ہو۔ تم ہاشمی خاندان سے ہو۔ ہاشمی خون تمہاری رگوں میں ہے۔ تمہیں غم سے کیا واسطہ۔ اس سے پہلے تمہیں جوش کیوں نہیں آیا۔ تم نے غم کیوں کیا۔۔۔ غصہ کیوں نہیں کیا۔۔۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں سیدزادی تھی۔ ہاشمی خون میری رگوں میں تھا۔ مجھے غم نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ غصہ آنا چاہیئے تھا۔ میں نے کہا۔ واقعی تم نے ٹھیک کہا۔ میں نے غلطی کی۔

وہ۔ میں نے جان کر تمہیں چھیڑا۔ تمہارے جذبہ خفتہ کو بیدار کر دیا۔ اب انشاءاللہ تمہارے پاس غم نہیں پھٹکے گا۔ تمہیں اس بات پر جوش اور غصہ آئے گا کہ ایک یہودی تمہاری خواستگاری کر رہا ہے۔ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا چاہتا ہے۔"

میں :۔ بیشک میر، غم نہ کروں گی۔ میں اس کے قصر میں جاؤں گی اور اُس کے سینہ میں خنجر بھونک دوں گی۔ اس کے غلام اور خادم میرے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ لیکن دنیا کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک ہاشمی دوشیزہ سے کہا۔"

وہ۔ یہی جذبہ ہونا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے اس بات پر خفا ہو کہ میں عرصہ سے یہاں نہیں آیا۔ میں نے کوئی خبر نہیں لی۔ لیکن میں غافل نہیں تھا۔ میں انتظام میں مصروف تھا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آج وہ انتظام جو میں چاہتا تھا۔ مکمل ہوگیا۔"

میں :۔ کیا انتظام کیا ہے آپ نے۔"

انہوں نے ہنس کر کہا۔ پھر وہی آپ ــــ ان تکلفانہ الفاظ کو چھوڑ دو۔"
میں نے مسکرا کر کہا۔ اچھا کیا انتظام کیا ہے تم نے۔"

وہ - میں سب کچھ بتا دوں گا۔ مگر ابھی نہیں - تم ابنِ مشعل کے قصر میں تنہا نہیں جاؤ گی ۔"

میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا - تم بھی میرے ساتھ چلو گے ۔"

وہ :- ایک ایسا کھیل کھیلا جائے گا۔ جو اپنی نظیر آپ ہی ہو گا - اور اگر خدا نے کامیاب کیا تو دنیا بھر میں مشہور ہو جائے گا ۔

میں :- اچھا تو بتایئے ۔"

وہ - جلدی نہ کرو - بہادر بنو - غم میں گھل مِل کر کمزور نہ ہو جاؤ ۔"

ابھی وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابا جان اور امی جان بھی آ گئے - میں ڈر گئی - کیونکہ میں رشید کے پاس بڑی بے حجابی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مگر غم نے ہم سب کو کچل دیا تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہ رہا تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

ایک بات میں بیان کرنا بھول گئی - امی جان نے چاہا تھا کہ ان واقعات کی اطلاع بھائی جان کو کر دی جائے۔ لیکن ابا جان نے اس لیے انہیں اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ جوشیلے آدمی تھے - خدا جانے کیا کر بیٹھتے ۔

ابا جان نے کہا - بیٹا رشید! تمہیں سب واقعات معلوم ہو گئے ہیں - کیا سوچا ہے تم نے ۔؟"

انہوں نے کہا - میں نے اپنا خیال زرقا پر ظاہر کر دیا ہے - آپ وزیر اعظم کو اطلاع دے دیں کہ وہ ابن مشعل کو مطلع کر دے کہ دلہن کا ڈولہ لینے کے لیے اپنے غلاموں کو بھیجدے ۔"

ابا جان نے حیرت سے رشید کو دیکھ کر کہا " کیا یہی کرنا ہو گا ۔"

رشید :- یقیناً - ایک بات مجھے آپ سے علیحدگی میں کہنی ہے ۔"

وہ ایک طرف ابا جان کو لے گئے - اور ان سے آہستہ آہستہ کچھ کہا کہتے رہے - ابا جان سنتے رہے - ان کے چہرہ سے پژمردگی دُور ہونے لگی - اور وہ ایک دم خوش ہو گئے - میں اور امی جان حیران ہوئیں کہ رشید نے کیا کہا - جس سے وہ خوش ہو گئے - ابا جان نے کہا - اچھا میں آج ہی وزیر اعظم کو اطلاع دیئے دیتا ہوں ۔"

رشید نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ دولہن کا ڈولہ ضرور جائے گا۔

وہ چلے گئے۔ میں نے اور امی جان نے ابا جان سے پوچھا کہ رشید نے کیا باتیں کیں۔ مگر انہوں نے نہیں بتائیں۔ صرف یہ کہہ دیا کہ وقت پر معلوم ہو جائیں گی۔

وہ بھی چلے گئے۔ میں اور امی جان عجب الجھن میں پڑ گئیں۔"

چوالیسواں باب ۴۴

کمزوری کا اقرار

زرقا نے بیان کیا۔

" میں اور امی جان الجھن میں تھیں۔ نہ معلوم رشید نے ابا جان سے کیا کہا کہ ان کے غم و فکر یک قلم دُور ہو گئے۔ وہ بشاش نظر آنے لگے۔ رشید کے جاتے ہی ابا جان وزیر اعظم کے پاس گئے۔ اور کہہ آئے کہ میں ابن مشعل کا مطالبہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ انہیں اطلاع دے دیں۔ وزیر اعظم بھی خوش ہو گئے۔"

جب ابا جان آئے تو امی جان نے پوچھا۔ کہاں گئے تھے "

ابا جان نے کہا" وزیر اعظم کے پاس "

امی جان :۔ کیوں ۔ ؟"

ابا جان :۔ انہیں اطلاع دے آیا ہوں کہ میں ابن مشعل کا مطالبہ پُورا کرنے کو تیار ہوں۔

امی جان :۔ کیا زرقا کو اس یہودی کے حرم میں بھیجدو گے ؟"

ابا جان نے مسکرا کر کہا۔ اور چارہ ہی کیا ہے "

امی جان ۔ اور وہ تمہارا ہاشمی خون کیا ہوا۔ کیا ایک سیدزادی کو ایک یہودی کے پلہ سے باندھ دو گے ؟"

ابا جان :۔اور کیا کیا جا سکتا ہے؟"

امی جان :۔میری زندگی میں تو یہ نہیں ہونے کا"

ابا جان :۔پھر کوئی اور تدبیر بتاؤ"

امی جان :۔تم مرد ہو کر کوئی تدبیر نہیں کر سکتے"

ابا جان :۔جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تب مجبور ہو کر یہی کرنا پڑا"

امی جان :۔یہ بزدلی ہے۔یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔

ابا جان چلے گئے۔میں نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔امی جان کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے خود سے مخاطب ہو کر کہا" فاطمہ ان مردوں نے تو بالکل ہی لٹیا ڈبو دی۔ یہ یہودی بچہ سے ڈر گئے۔میں نہیں ڈروں گی۔ہرگز نہیں ڈروں گی۔اس کا مقابلہ کروں گی۔ماروں گی اور مر جاؤں گی"

میں ان کے پاس پہنچ گئی۔انہوں نے کہا۔زرقا یہ تجھے قربان کرنا چاہتے ہیں مگر میں قربان نہیں ہونے دوں گی۔معلوم نہیں رشید نے تیرے ابا جان کو کیا پٹی پڑھا دی۔کل تک وہ انکار کر رہے تھے۔آج ہامی بھر لی۔ہاں ایک بات تو بتا رشید نے تجھ سے کیا کہا تھا۔؟"

اب میں ان سے کیا کہتی کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔کچھ میں ان پر بگڑی تھی۔کچھ انہوں نے مجھے اشتعال دلایا تھا۔یہ باتیں کہنے کی نہیں تھیں۔میں نے کہا۔انہوں نے کوئی خاص بات نہیں کہی تھی"

امی جان :۔اس نے کہا تھا نہ کہ میں نے اپنا خیال زرقا پر ظاہر کر دیا ہے۔کیا خیال ظاہر کیا تھا اُس نے؟"

میں۔کہتے تھے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا"

امی جان۔یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔کیا کرے گا۔وہ تنہا جا کر"

میں :۔کہتے تھے ایسا کھیل کھیلا جائے گا جو اپنا نظر آپ ہی ہو گا۔اور اگر خدا نے کامیاب کیا تو دنیا بھر میں مشہور ہو جائے گا"

امی جان :۔کھیل کھیلا جائے گا۔؟ معلوم ہوتا ہے۔ضرور اس نے کوئی تجویز سوچی ہے۔مگر یہ ڈولہ والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔تجھے میں ہرگز نہ

جانے دوں گی۔

میں خود جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن شاید وہ خود مجھے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ جانے میں کوئی خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔

جمیلہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔" توبہ بچی — اس ملاں کے ساتھ تو موت کے منہ میں جانے کو تیار تھی۔

زرقا نے مسکرا کر اُس کے دھمک مار کر کہا۔" بڑی بی — اور کیا کرتی ایک کا سہارا لیا تھا۔ وہ موت کے منہ میں جانے کو تیار تھے — میں کیا کرتی"

جمیلہ :۔ ہائے بیچاری مغرب اقصیٰ کی حور۔ پھنس گئی۔ ملاں کی داڑھی کے جال میں۔

زرقا :۔ مردار کیسی باتیں کر رہی ہے تو —"

جمیلہ :۔ اچھا سُنا"

زرقا نے کہا۔

" میں امی جان سے کیا کہتی۔ چپ ہو گئی۔ کئی روز کے بعد ایک دن پھر رشید آئے۔ میں عصر کی نماز پڑھ چکی تھی۔ امی جان ابھی وضو کر رہی تھیں۔ رشید بے تکلف آکر کمرہ میں بیٹھ گئے۔ میں بھی نقاب ڈال کر جا پہنچی۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔ تیار ہو گئیں تم"

میں۔ کیا لڑائی پر جانا ہے"

وہ۔ لڑ سکو گی۔؟"

میں۔ نہیں۔ مرد ہی لڑا کرتے ہیں"

وہ — اب امتحان ہو جائے گا"

میں — آخر تم نے کیا تجویز سوچی ہے"

وہ — کہو بتا دوں —— ؟ لیکن اچھا یہ ہے کہ جب اس تجویز پر عمل ہو جائے۔ تب تمہیں معلوم ہو۔

میں — امی جان کہتی تھیں ڈولہ جائے گا۔ ڈولہ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی میں یہ کہنے کو تو کہہ گئی لیکن شرم حیا سے کٹ گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ

میں جس کی شرم و حیا مشہور تھی۔ بڑی بے حجابی سے ایک نامحرم سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ قلب ماہیت اس مصیبت نے کرا دی تھی۔ جو ہم پر ٹوٹ پڑی تھی۔

انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ مگر ڈولہ میں تو ایک دن جانا پڑے گا تمہیں۔

کیسی بات کہی تھی۔ انہوں نے۔ واقعی زندگی کے ساتھ شادی ہونا اور شادی میں ڈولہ میں بیٹھ کر جانا ہی تھا۔ مجھے بیحد شرم معلوم ہوئی۔

جمیلہ نے ہنس کر کہا "بڑا شریر ہے تیرا ملاں۔

زرقا:۔ چڑیل اس میں شرارت کی کیا بات ہے"

جمیلہ:۔ حالانکہ حد کر دی۔ اُس نے شرارت کی اور تو اسے ملاں ہی سمجھے بیٹھی ہے۔ خیر۔ تیرا ملاں تجھے مبارک۔ سنا تو"

زرقا نے کہا۔

میں نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرہ پر شوخی بکھر گئی تھی۔ مجھے اور بھی شرم معلوم ہوتی۔ انہوں نے کہا۔ ڈولہ سے ڈرتی ہو تم"

میں۔ میں ابن مشعل سے ڈرتی ہوں"

وہ ہنس پڑے۔ انہوں نے کہا۔ اب تو اقرار کر لو کہ تم عورت ہو"

میں۔ عورت تو ہوں ہی"

وہ۔ اور عورتیں دِل کی کمزور ہوا کرتی ہیں۔

اب مجھے خیال ہوا کہ میں نے کیا بات کہدی کہ میں ابن مشعل سے ڈرتی ہوں یہ بات کمزوری کی ہے ہی۔ مگر میں نے کہا "ابن مشعل کوئی بھیڑیا ہے جو میں اِس سے ڈروں۔ اس کی شیطنیت سے ڈرتی ہوں"

"وہ۔ مگر میں نہیں ڈرتا اس کی شیطنیت سے"

میں نے مسکرا کر کہا "اپنے منہ ہی سے میاں مٹھو بن رہے ہو"

انہوں نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ امی جان آگئیں۔ رشید نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی اور میرے پاس بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کہا "بیٹا"، کیا تم زرقا کو ابن مشعل کے حرم میں بھیجنے پر آمادہ ہو۔؟"

رشید نے میری طرف دیکھا۔ زیر لب مسکراتے اور کہا۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

امی جان ۔ یہ تجویز تو مناسب نہیں ہے۔"

وہ ۔ اگر زرقا ڈرتی ہیں تو نہ جائیں۔"

اب اگر میں چپ بیٹھی رہ جاتی تو دل کی کمزوری اور بزدلی کا الزام لگتا اسلیئے میں نے کہا۔" یہ کیوں ڈروں۔"

امی جان ۔ اس میں ڈر کا سوال نہیں ہے ۔ عزت و ناموس کا سوال ہے۔"

رشید :۔ اطمینان رکھیئے عزت و ناموس پر آنچ نہ آئے گی۔"

غرض امی جان نے ہر چند تجویز معلوم کرنا چاہی لیکن رشید نے صاف طور پر کچھ نہ بتایا۔ آخر امی جان نے کہا۔ تم اس کان سے سنو یا اس کان میں اپنی زرقا کو ہرگز تازہ نہ بھیجوں گی۔"

انہوں نے کہا ۔ اگر زرقا نہ جانا چاہیں گی تو دوسرا انتظام کر لیا جائیگا۔

امی جان :۔ ہاں دوسرا ہی انتظام کر لو۔"

وہ ۔ تو ان سے کہلا دیجیئے کہ یہ نہیں جائیں گی۔"

میں :۔ میں ڈرنے والی نہیں۔"

امی جان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔" کیسی بچی ہے ۔ اپنے بھائی جان سے تو بحث کرتی ہی رہتی تھی ۔ اب رشید سے بھی شروع کر دی۔

میں ۔ آخر یہ مرد اپنے آپ ہی کو دلیر کیوں سمجھتے ہیں ۔ عورتوں کو کمزور کیوں جانتے ہیں۔

امی جان :۔ یہ تو قدرتی بات ہے۔ قدرت نے مرد کو سخت اور قوی بنایا ہے ۔ عورت کو نرم اور کمزور بنایا ہے۔

میں :۔ سخت اور نرم کی بات نہیں ہے بلکہ کمزوری اور دلیری کی بات ہے۔

امی جان ۔ تو کیا تو ابن مشعل کے حرم میں جا کر لڑے گی۔"

میں ۔ ضرورت پیش آئی تو ضرور لڑوں گی۔"

امی جان ۔ بہت لڑی ۔ نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ خراماں چلتی ہے ۔ تلوار

تک تو اچھی طرح اٹھی نہیں اور رہ گئی۔"

اب میں کیا کہتی امی جان سے ۔ چپ ہو رہی ۔ دن چھپنے کے قریب آگیا ۔ رشید اٹھ کر چلے گئے ۔ میں اور امی جان جس الجھن میں تھیں ۔ اسی میں رہ گئیں ۔ یہ عقدہ حل ہی نہ ہوا کہ رشید نے کیا تجویز سوچی ہے ۔ اور اس پر کیسے عمل کریں گے ۔

دن گزرتے رہے مگر اب ہمیں غم و فکر نہیں تھے ۔ کچھ بے فکری سی ہو گئی تھی ۔ لیکن کبھی کبھی جب مجھے یہ خیال آجاتا تھا کہ ابن مشعل کے آدمی مجھے لینے کے لیے آنے والے ہیں ۔ تو دل دبک سے ہو جاتا تھا ۔ اور کبھی کبھی تو دل کی دھڑکن اضطراب کیوجہ سے تیز ہو جاتی تھی ۔ اور رات کو اگر آنکھ کھل جاتی تھی تو نیند اڑ جاتی تھی ۔ یہ میری کمزوری کیوجہ تھی ۔ اور کمزوری عورت ہونے کے سبب سے تھی ۔

آخر ایک دن میں نے سنا کہ مشعل کے آدمی مجھے لینے کے لیے آگئے ۔ یہ سنتے ہی میں سن ہو گئی ۔ جسم کا ست سا نکل گیا ۔ پھر غم و پریشانی نے آگھیرا ۔ اسی روز رشید آئے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا ۔ ڈولے آگئے ہیں ۔ اب اپنا دل ٹٹول کر بتاؤ ۔ کیا تمہارا دل مضبوط ہے ؟"

اب ضد کرنی فضول تھی ۔ واقعی میرا دل مضبوط نہیں تھا ۔ کمزور تھا ۔ میں نے کہا ۔ "نہیں" ، میرا دل اتنا مضبوط نہیں ہے کہ میں اتنی جرات کر سکوں کہ تا زندہ چلی جاؤں گی ؟"

انہوں نے ہنس کر کہا "بس" ، "اقرار کرو کہ تم عورت ہو ۔ کمزور عورت ۔"

سوائے اقرار کرنے کے چارہ کیا تھا ۔ میں نے کہا ۔ آج میں نے سمجھا ہے کہ کمزوری کا دوسرا نام عورت ہے ۔"

وہ ہنس پڑے ۔ انہوں نے کہا "اب میں کوئی اور تجویز سوچوں گا ۔"

وہ کچھ اور دیر بیٹھ کر چلے گئے ۔

پینتالیسواں باب ۴۵

رُخصتی

زرقا نے بیان کیا۔

"معلوم یہ ہوا کہ کئی پالکیاں آئی ہیں۔ اور سب پالکیاں خوب آراستہ ہیں۔ ان میں سے ایک پالکی کی زینت ایسی کی گئی ہے کہ جسے دیکھنے کے لیے خلقت ٹوٹی چلی آ رہی ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا اچھا خاصا میلہ لگا رہتا ہے۔ پالکیوں کے ساتھ غلاموں کی پلٹن آئی تھی۔ اور غلاموں کے ساتھ ابن مشعل کے کئی معتمد آئے تھے۔ پالکی بردار غلام اور معتمد سب شاہی مہمان تھے۔

ایک روز وزیرنی۔ کئی بیگمات کے ہمراہ آئیں۔ میں نے سمجھا ملنے آئیں ہیں۔ مگر ان کے ساتھ بلشمار خوان تھے۔ جو کنیزیں سروں پر اُٹھائے لا رہی تھیں۔ میں امی جان کے پاس بیٹھی تھی۔ ہم دونوں نے وزیرنی اور بیگموں کا استقبال کیا۔ انہیں عزت سے بٹھایا۔ وزیرنی نے امی جان کو مبارکباد دی۔ نہ میں اس مبارکباد کا مطلب سمجھی نہ امی جان"۔

چنانچہ امی جان نے کہا۔ کیسی مبارکباد دے رہی ہو تم۔

وزیرنی۔ زرقا کے دلہن بننے کی۔

امی جان کو سخت ناگوار گزرا۔ مجھے بھی بہت بُرا معلوم ہوا۔ مگر خیریت یہ ہوئی۔ کہ امی جان چپ ہو گئیں وہ کچھ سخت وسست کہتے کہتے رک گئیں۔

اسی وقت ابا جان نے امی جان کو بلایا۔ انہیں کچھ سمجھایا۔ مجھے معلوم نہیں اِن دونوں میں کیا باتیں ہوئیں۔ البتہ یہ دیکھا کہ جب وہ واپس آئیں تو ان کے چہرہ سے خشونت اور برہمی کے بجائے کچھ شگفتگی ظاہر ہو رہی تھی۔

وزیرنی نے خوان پوش علیحدہ کرا دیئے۔ دیکھا تو چند خوانوں میں خشک میوے تھے۔ چند خوانوں میں بھاری جوڑے تھے۔ اور چند خوانوں میں نہایت سبک، خوشنما اور قیمتی زیورات تھے۔

یہ بری آئی تھی۔ جو ابنِ مشعل کی طرف سے وزیرنی لائی تھیں۔ مجھے خیال تھا کہ امی جان اسے واپس کر دینگی۔ مگر انہوں نے واپس نہیں کی۔ اور وزیرنی سے گھل مِل کر باتیں کرنے لگیں۔ مجھے افسوس بھی ہوا اور ناگوار بھی گذرا۔

امی جان مجھے علیحدہ لے گئیں اور سمجھایا کہ میرے ابا جان نے حکم دیا ہے کہ میں وزیرنی کے حکم کی تکمیل کرتی رہوں۔ دِل میں آیا کہ انکار کر دوں۔ مگر پھر سوچی شاید اس میں کوئی مصلحت ہو۔

وزیرنی نے مجھے غسل کرنے کے لیے کہا۔ نہاتی میں روزانہ تھی۔ بلکہ ایک ایک دن میں دو مرتبہ۔ میں نہانے چلی گئی۔ کئی کنیزیں مجھے نہلانے آگئیں۔ کئی قسم کے ابٹن تھے۔ بڑے خوشبودار۔ انہوں نے خوب مل کر نہلایا۔ میرے جسم سے خوشبو کی لپٹیں نکلنے لگیں۔ بدن بہت ہلکا ہو گیا۔

مجھے ایک بہت ہی خوشنما جوڑا پہنایا گیا۔ خوب سنگھار کیا اور اس کے بعد زیورات پہنائے۔ ٹوپی تاج نما تھی۔ دوپٹہ اڑھا کر اس پر ٹوپی اڑھا دی۔ ایک کنیز نے آئینہ دیا۔ میں نے جو آئینہ دیکھا۔ حیران رہ گئی۔ حسن و شباب نے مجھے وینس کی دیوی سے بھی بڑھ کر حسین و نازنین بنا دیا تھا۔ ایسی نازنین جس کے رخساروں سے بجلیاں تڑپ رہی ہوں۔ جن کی آنکھیں مے پاس ہوں۔ اور جس کے چہرہ کی طرف دیکھنا انسانی طاقت سے باہر ہو۔

جب میں خرام ناز سے چلی اور وزیرنی اور بیگموں کے پاس آئی تو وہ حیران و بیخود ہو کر رہ گئیں۔ دیر تک گم سم بیٹھی رہی۔ جیسے میرے حسن نے ان کے حواس سلب کر لیے ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وزیرنی نے میری پیشانی چومی اور مجھے دعائیں۔

دیں۔

دوپہر کا کھانا ان سب نے ہمارے ہی یہاں کھایا۔ اور ظہر کے بعد چلی گئیں۔ میں نے سنا چلتے وقت وزیرنی نے امی جان سے کہا۔ کل صبح زرقا کو رخصت کرنا ہوگا"۔ امی جان نے انہیں جو جواب دیا وہ میں نہ سُن سکی۔

امی کے جانے کے بعد امی جان شاید تھک کر اپنے کمرہ میں جا لیٹیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ جو جوڑا میں پہنے ہوئے تھی۔ اُسے بدل ڈالوں اور سادہ لباس پہن لوں۔ چنانچہ میں اٹھی۔ اور اپنے کمرہ میں جانے لگی۔ اسی وقت رشید آگئے۔ میں ان کے پاس چلی گئی۔ یہ خیال نہیں رہا کہ نقاب چہرہ پر نہیں ڈالا۔ وہ مجھے دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں شرما گئی۔ میں نے چاہا کہ واپس جا کر نقاب اوڑھ آؤں۔ مگر فوراً ہی خیال ہوا کہیں وہ چلے نہ جائیں۔ مجھے ان سے یہ پوچھنا تھا کہ اب وہ کیا کریں گے۔ انہوں نے کیا تجویز سوچی ہے چنانچہ میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ انہوں نے بھی نظریں جھکا لیں۔ میں نے کہا۔ کیا سوچا ہے تم نے۔

انہوں نے کہا۔ کئی دن سے سوچ رہا ہوں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اسوقت میں یہی کہنے آیا تھا کہ تمہیں جانا ہی ہوگا"۔

میں جانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔ مجھے ابن مشعل سے نفرت تھی۔ اور اس سے ڈرتی بھی تھی۔ رشید کی بات سُن کر میرے دل کو دھکا لگا۔ میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ تم ڈر کیوں رہی ہو زرقا"۔

میں جل گئی۔ میں نے کہا" ختم ہوگئی تمہاری مردمی جاتی رہی تمہاری جرأت اور دلیری۔ ڈر گئے تم ابن مشعل سے"۔

وہ مسکرا رہے تھے۔ ان کے مسکرانے سے مجھے اور طیش آنے لگا۔ وہ سمجھ گئے انہوں نے کہا۔ غصہ آگیا تمہیں زرقا۔ میں شاعروں کو لغوگو سمجھا کرتا تھا۔ مگر تمہیں دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔

میں۔ کیا مطلب ہے اس سے تمہارا"۔

وہ۔ کچھ نہیں۔ میں شاعروں کے متعلق کہہ رہا تھا"۔

میں۔ شاعروں کا کیا ذکر تھا اسوقت"۔

وہ۔ ایک خیال آگیا تھا کاش میں بھی شاعر ہوتا۔"
میں۔ مرد دعوے تو بہت کرتے ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتے۔"
وہ۔ میں ان مردوں میں نہیں ہوں۔
میں۔ تم ڈر گئے۔ ابن مشعل سے۔
وہ۔ جب ابن مشعل سے مقابلہ ہو گا تب معلوم ہو جائے گا کہ کون ڈرتا ہے۔"
میں۔ مقابلہ ہی کیوں ہونے لگا۔ اس سے تمہارا۔ وہ تازا ہیں۔ تم یہاں۔"
وہ:۔ مقابلہ کا وقت قریب آگیا ہے۔"
میں:۔ آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم کیا کرنے والے ہو۔"
وہ۔ اگر تم چلو گی تو خود دیکھ لو گی کہ میں کیا کرتا ہوں۔ نہ چلو گی تو سن لو گی کہ میں نے کیا کیا۔
میں:۔ تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔"
وہ:۔ شائد۔"

میں جتنا ان سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کیا کریں گے۔ انہوں نے کیا تجویز سوچی ہے، وہ اتنا ہی چھپاتے تھے۔ صاف طور پر یہی نہیں کہتے تھے کہ مجھے چلنا پڑے گا یا نہیں۔ ایک بات میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔

ابھی ہم دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ابا جان صحن میں داخل ہوتے میں نے جلدی سے کہا" ابا جان آگئے۔" اور وہاں سے اُٹھ کر دوسرے دروازہ سے نکل کر اپنے کمرہ میں آگئی۔ ابا جان نے مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ پہلے امی جان کے پاس آئے۔ ان سے کچھ باتیں کیں۔ پھر رشید کے پاس چلے گئے اور ان سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں ان کی باتیں سن نہ سکی۔ کچھ دیر کے بعد ابا جان اور رشید دونوں چلے گئے۔

میں نے وہ لباس اور زیورات اتار کر رکھ دیئے اور سادہ سفید لباس پہن لیا۔ رات بھر الجھن رہی۔ وزیرنی کہہ گئی تھی کہ کل زرقا کو رخصت کرنا ہو گا۔ سوچا کیا مجھے جانا پڑے گا۔ کیا رشید ساتھ چلیں گے۔؟ غرض وہ رات فکر و تذبذب میں بمشکل سے کٹی۔ ابھی صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ وزیرنی اور کئی بیگمیں آگئیں

مجھے پھر ایک خوشنما جوڑا اور زیورات پہنائے گئے۔ کنیزوں سے معلوم ہوا کہ پالکیاں اور غلام آگئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ چالیس ڈولے اور ہیں۔ ان میں میری سہیلیاں بیٹھی ہیں۔ حیران ہوئی کہ یہ سہیلیاں کہاں سے آئیں۔ کون ہیں کن لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو ابن مشعل کے حرم میں بھیجنا گوارا کر لیا۔ میرے لیے ہر بات ایک عجیب معمہ اور چیستاں بنتی جاتی تھی۔

اب مجھے رخصت کرنے کا وقت آگیا۔ امی جان مجھے ابا جان سے ملانے کے لیے لے چلیں۔ وہ دیوانخانہ میں تھے۔ میں نے چلتے چلتے امی جان سے پوچھا "کیا تم مجھے رخصت ہی کر دو گی۔"

انہوں نے میرے کان میں کہا "نہیں"

مجھے اطمینان ہوا۔ دیوانخانہ میں پہنچی۔ تو دیکھا ابا جان کے ساتھ رشید بھی ہیں۔ میں حیران ہوئی۔ امی جان نے ایک گوشہ میں لیجا کر جلدی جلدی میرے زیورات اور کپڑے اتارے اور رشید نے پہن لیے۔ اور منہ پر نقاب ڈال لیا۔ میرے لیے جو پالکی آئی تھی وہ دیوان خانہ کے قریب لگا دی گئی۔ پردہ کرا دیا گیا۔ اور رشید جلدی سے پالکی میں بیٹھ گئے۔ امی جان نے مجھے ایک الماری کے پیچھے چھپا دیا۔ اب میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ میری جگہ رشید دلہن بن کر گئے تھے۔ میں ان کی اس قدر شکر گذار ہوئی کہ جی چاہا دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑوں۔ وہ مجھے بچا کر اپنی جان دینے جا رہے تھے۔

چھیالیسواں باب ۴۶

ڈولوں کی روانگی

زرقا نے بیان کیا۔

پالکیاں اور ڈولے روانہ ہو گئے۔ ان کے آگے اور پیچھے مسلح غلام چلے۔ میں نے سنا کہ مسلمانوں کو اس بات کا سخت افسوس تھا کہ ایک سید زادی ایک یہودی کے حرم میں جا رہی تھی۔ لیکن وہ اتنے بے بس اور مجبور تھے کہ کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے دل جلے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ امیروں کو۔ وزیروں کو۔ حکومت اور سلطان کو برا کہہ رہے تھے۔ اس روز مسلمانوں کو اپنی مجبوری اور یہودیوں کی برتری کا بڑا احساس ہوا۔ تمام شہر فاس میں اس بات کی شہرت ہو گئی کہ میرا ڈولہ ابن مشعل کے حرم میں جا رہا ہے۔ جو سنتا وہی افسوس کرتا مگر یہ کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ڈولہ کو روک دے یا کوئی مزاحمت کرے۔

وزیرنی اور بیگمیں بھی رخصت ہو گئیں۔ انہیں بھی افسوس تھا۔ مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نہیں گئی۔ سب یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں چلی گئی۔ ان کے جانے پر میں اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ اس بات کی تو مجھے خوشی تھی کہ میں نہیں گئی۔ مگر اس بات کا رنج تھا کہ رشید گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ابن مشعل کے سینکڑوں غلام ہیں۔ اور سینکڑوں ہی سپاہی ہیں۔ کنیزیں بھی ہیں۔ اور خادم بھی ہیں۔ اب یہ خیال ہوا کہ اتنے آدمیوں میں تنہا رشید کیا کر لیں گے۔ انہوں نے کیا تجویز سوچی

ہے۔کیوں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا ہے۔اگر خدا نخواستہ مارے گئے ــــ

میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکی۔میرا دل پریشان ہونے لگا۔اور پھر غم کا سیلاب امنڈ آیا۔میں نے دل میں کہا۔"زرقا، تو نے بہت ہی بُرا کیا۔اپنی جان بچالی۔اور ایک شریف اور غیور نوجوان کو موت کے منہ میں جانے دیا۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔جب زیادہ بیچین ہوئی تو اٹھی اور رو رو کر خدا سے رشید کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔لیکن بے چینی بڑھتی ہی رہی۔عجب عجب اور طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔مجھے یہ بھی افسوس ہوا کہ میں نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ان سے بگڑتی اور ان سے خفا ہوتی رہی۔اور وہ میری خفگی کو برداشت کرتے رہے۔

مجھے آج ان کی جرأت اور دلیری کا احساس ہوا۔واقعی وہ دلیر تھے۔جری تھے نڈر تھے۔بہادر تھے۔اور غیور تھے۔ان کے غیور ہونے ہی نے انہیں جوش دلایا تھا۔ اور وہ ایک سید زادی کی حرمت۔عفت۔ناموس اور اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ کس قدر ایثار کیا تھا۔

انہوں نے ان کے اس ایثار کا میرے دِل پر بڑا اثر ہوا۔اور میرے دل میں ان کی محبت کا چشمہ ابل پڑا۔

جمیلہ نے کہا۔"جھوٹی ــــ یہ کیوں نہیں کہتی کہ پہلی ہی ملاقات میں جب انہوں نے تجھے غنڈوں سے بچایا تھا۔ان کی محبت تیرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔"

زرقا:۔"میں تجھے اپنا سب حال سنا رہی ہوں۔میں نے کوئی بات تجھ سے چھپائی نہیں ہے۔پہلی ملاقات میں کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔"

جمیلہ:۔"ارے مجھ سے بھی اڑتی ہے تو اگر پہلی ملاقات میں کوئی اثر نہیں ہوا تھا تو منہ کھول کھول کر ان کے سامنے کیوں جاتی تھی۔"

زرقا:۔"جب کبھی میں اتفاقیہ بغیر نقاب کے ان کے سامنے ہوتی رہی۔اس کی وجہ بھی بتاتی رہی ہوں۔"

جمیلہ۔"میں سب سمجھتی ہوں۔خیر تو بیان کر۔ہاں تیرے دل میں ان کی محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا۔"

زرقا نے کہا ـــــ

"اب میری یہ خواہش ہوئی کہ کسی طرح خدا ان کی راتے بدل دے۔ وہ واپس آجائیں۔ یا کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ ابن مشعل کے غلام مارے جائیں یا بھاگ جائیں اور رشید آجائیں۔ مگر ایسی آرزوئیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔"

جوں جوں دن چڑھتا جاتا تھا۔ میرا دل غم سے نڈھال ہوتا جاتا تھا۔ کبھی تو خیال ہوتا۔ رشید آنے والے ہیں۔ کبھی خیال ہوتا۔ ان کی کوئی خبر آنے والی ہے۔ مگر نہ وہ آئے۔ نہ ان کی کوئی خبر آئی۔

اب میں وہ واقعہ بیان کرتی ہوں۔ جو رشید نے مجھ سے بیان کیا۔

انہوں نے کہا۔ انہیں یہ خیال ہو گیا تھا کہ ابن مشعل کسی وقت ضرور رنگ لائے گا۔ اور زرقا کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ خیال اس وجہ سے اور پختہ ہو گیا تھا کہ میری تصویر نمائش میں رکھی گئی تھی۔ اور ابن مشعل نے خرید لیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے جنگی فن سیکھے۔ اور جب اس میں خود ماہر ہو گئے۔ تو انہوں نے اپنے ہم سن تمام طالب علموں کو یہ فن سکھایا۔ اور انہیں لڑائی کے فن میں طاق کر دیا ـــــ

وہ اگرچہ ہمارے یہاں کم آتے تھے۔ مگر میرے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا۔ ابن مشعل نے میری خواستگاری کی ہے۔ انہیں بڑا غصہ آیا۔ مگر انہوں نے یہ خیال کیا کہ اسلامی حکومت ہے مسلمان سلطان ہیں۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے اور ایک ہاشمی دوشیزہ کو ایک یہودی کے حرم میں ہرگز نہ جانے دیں گے۔

لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ حکومت اور سلطان بھی ابن مشعل کے سامنے بے بس ہیں۔ تو انہیں بڑی غیرت آئی۔ پہلے تو انہوں نے یہ سوچا کہ خود تنہا تازہ جا کر ابن مشعل کا کام تمام کر آئیں۔ لیکن ان کو یہ معلوم ہوا کہ اس تک رسائی مشکل ہے تب انہوں نے یہ تجویز سوچی کہ میرے ساتھ چلیں گے۔ اور اسے ٹھکانے لگائیں گے۔

لیکن جب میں نے ابن مشعل کے حرم جانے سے انکار کر دیا۔ تب انہوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ پالکی میں سوار ہو کر جائیں گے۔ اور اسے اس کی بدکاری

کی سزا دیں گے ۔

جب یہ بات مشہور ہوئی کہ ابن مشعل نے میری خواستگاری کی ہے ۔ تو قیروین کے غیور طالب علموں نے مجلس شوریٰ منعقد کی ۔ اس میں رشید کو بھی مدعو کیا ۔ اور اس بات پر غور کیا جانے لگا کہ ایسی صورت میں جبکہ سلطان اور وزیر سب ابن مشعل کے ساتھ ہیں ۔ کس طرح ایک ہاشمی دوشیزہ کے ناموس کو بچایا جائے ۔

کئی تجویزیں پیش ہوئیں ۔ مگر کسی پر اتفاق نہ ہو سکا ۔ کیونکہ یہ بات ان طالبعلموں کو معلوم تھی کہ ابن مشعل کے پاس کافی جمعیت ہے ۔ اگر اسے اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ تو وہ ہوشیار ہو جائے گا ۔ اور سلطان بھی اس کی مدد کریگے ۔ وہ سب لوگ رشید کا احترام کرتے تھے ۔ اور رشید نے اس وقت تک اپنی کوئی رائے پیش نہیں کی تھی ۔ چنانچہ ان سے لوگوں نے مشورہ لیا ۔ انہوں نے کہا :۔

" میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہاشمی دوشیزہ کی بجائے میں پالکی میں سوار ہو کر جاؤں اور موقع پا کر اسے قتل کر ڈالوں ۔

لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ابن مشعل کے آدمی تمہیں کیوں زندہ چھوڑیں گے ۔ تمہارے بھی ٹکڑے اڑا دیں گے "

رشید نے کہا :۔ ہاشمی دوشیزہ کی عصمت بچانے کے لیے مجھے اپنی جان کی قربانی دینی ہوگی "

لوگوں نے ان کی جرأت و ہمت کی بڑی تعریف کی اور دس لڑکوں نے ان کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی ۔

ایسا تمام طالب علموں میں جوش پیدا ہو گیا ۔ انہوں نے کہا :۔ ابن مشعل کا قتل اس لیے ضروری ہے کہ اس نے نہ معلوم کتنی معصوم دوشیزاؤں کی عصمت دری کی ہے ۔ اس لیے ہم سب کو ساتھ چلنا چاہیے ۔

رشید نے کہا :۔ اگر ہم سب چلنا چاہیں گے تو راز فاش ہو جائے گا ۔

صرف چالیس آدمی چلیں۔

بڑی ردوکد کے بعد یہی طے ہوا کہ چالیس آدمی ہی چلیں گے۔ اور یہ سب ڈولوں میں سوار ہولیں۔ اپنا لباس اور ہتھیار ڈولوں میں رکھ لیں اور زنانہ لباس پہن کر چلیں۔

چنانچہ چالیس نوجوان چھانٹ لیے گئے۔ اور سب سے یہ اقرار کرا لیا گیا کہ وہ اس تجویز کا کسی غیر سے ذکر نہ کریں گے۔ مشہور یہ کیا گیا کہ زرقا کے ساتھ اس کی چالیس سہیلیاں بھی جائیں گی۔ ابن مشعل کے معتمدوں نے اس بات کو بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔

جب میری رخصتی کا دن آیا تھا تو چالیس نوجوان زنانہ لباس پہن کر ڈولوں میں بیٹھ گئے۔ ڈولوں کا انتظام رشید نے کیا تھا۔ ڈولے بردار ابن مشعل کے غلام تھے۔ یہ ڈولے ہمارے مکان کے سامنے آگئے۔ رشید ہمارے گھر پہلے ہی آگئے تھے۔ وہ میرا لباس پہن کر یعنی وہ لباس جو ابن مشعل نے میرے لیے بھیجا تھا۔ اور جسے میں نے وزیرنی اور بیگموں کے سامنے پہنا تھا۔ پالکی میں سوار ہو گئے۔ ان نوجوانوں نے یہ کام بڑی دلیری کا کیا تھا۔ قومی حمیت اور اسلامی جوش نے انہیں جانیں دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔

ابن مشعل کے غلام اور معتمد خوشی خوشی پالکیاں اور ڈولے لیکر روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ عورتیں تازہ سے نہیں آئی تھیں۔ ورنہ اس تجویز میں شاید دقت ہوتی۔ کیونکہ وہ مجھے اور سہیلیوں کو دیکھنا چاہتیں۔

تازہ صبح ہی اطلاع بھیج دی گئی تھی۔ کہ مغرب اقصیٰ کی حور مع اپنی سہیلیوں کے آرہی ہے۔ چنانچہ جب یہ قافلہ جو اپنے خیال میں مجھے لیے جارہا تھا تازہ کے سامنے پہنچا۔ تو ابن مشعل کے تمام غلام اور سوار اور شہر کے معزز لوگ استقبال کے لیے آئے۔ ابن مشعل ان میں نہیں تھا۔ جب یہ سواری شہر کے قریب پہنچی تو سلامی کی توپیں داغی گئیں۔ اس سے تمام شہر تازہ کے باشندوں کو معلوم ہو گیا کہ ہاشمی دوشیزہ آگئی۔

مغرب کے وقت یہ جلوس شہر میں داخل ہوا۔ آتش بازی چھوٹتی رہی
رشید کہتے تھے کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو یہ خوف تھا کہ کہیں کوئی رسم
یہودیوں کی ایسی نہ نکل آئے جس سے عورتیں پہلے آکر دلہن اور اس کی سہیلیوں
کو دیکھیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

ابن مشعل کا قصر خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ تمام قصر میں چراغاں کیا گیا تھا۔
بہت زیادہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پالکیاں اور ڈولے قصر کے اندر پہنچائے گئے۔"

سینتالیسواں باب ۴۷

ابن مشعل کا انجام

زرتوا نے بیان کیا۔

"رشید نے مجھے وہاں کے حالات مفصل سناتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ پالکیاں اور ڈولے قصر میں داخل ہوتے بے شمار کنیزیں مشعلیں لے کر دوڑیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے دو دو کنیزیں مشعلیں لے لے کر کھڑی ہو گئیں اور سب نے ہاتھ اونچے کر کر کے مشعلوں کو آگے کی طرف تھوڑا تھوڑا جھکا کر محرابیں بنالیں۔ یہ محرابیں دُور تک بنتی چلی گئیں۔ اور محرابوں کے نیچے سے پالکیاں اور ڈولے گذرنے لگے۔

رشید کہتے تھے کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو یہ خوف ہوا کہ کہیں کوئی چنچل کنیز کسی پالکی میں یا ڈولے میں منہ ڈال کر نہ جھانکنے لگے۔ اس خوف سے سب نے گھونگھٹ نکال لیے تھے۔

یہ خوف اس وجہ سے تھا کہ کہیں ابن مشعل کا سامنا ہوتے بغیر یہ انکشاف نہ ہو جائے کہ پالکیوں اور ڈولوں میں عورتیں نہیں۔ مرد ہیں۔ اور ابن مشعل کہیں جا چھپے اور بچ جائے۔

سامنے جو عمارت تھی۔ وہ چراغاں کی وجہ سے جگمگا رہی تھی۔ جونہی پالکیاں اور ڈولے محرابوں کے نیچے سے گزرنے شروع ہوئے باجہ نہایت ہی سُریلے

لہجہ میں بجنے لگا۔ کنیزیں اور غلام سب نہایت عمدہ پوشاکیں پہنے ہوئے تھے۔ ہماری سواری باغیچہ میں سے گذر کر چبوترہ کے قریب پہنچی۔ کنیزوں نے ارادہ کیا کہ دلہن کو اس جگہ اتار لیں۔ مگر فوراً ہی ابنِ مشعل آگیا۔ اس نے کہا۔ کیا کرتے ہو۔ دلہن کو وہاں نہ اتارنا۔ وہ شاخِ گل سے زیادہ نازک ہے۔ پالکی اوپر لے آؤ اور خوابگاہ کے پاس لگا دو۔"

چنانچہ غلاموں نے پالکی اٹھالی اور چبوترہ پر چڑھ گئے۔ ابن مشعل پالکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور کہنے لگا" اے مغرب اقصیٰ کی حور۔ میری ساری دولت تیری ہے۔ تو حوروں سے زیادہ دل ربا ہے۔ تیرا چہرہ چاند سے زیادہ دلکش اور روشن ہے۔ تجھ پر میرا سب کچھ قربان ہے۔ نثار ہے۔ میں نے جب سے تجھے دیکھا ہے ہزار جان سے تجھ پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ تیری کوئی خواہش ایسی نہ ہوگی۔ جو پوری نہ کر دی جائے گی۔

ابن مشعل نے شراب پی رکھی تھی۔ وہ بہک رہا تھا۔ اور لڑکھڑاتا چل رہا تھا۔ اس کے گلے میں جواہرات کے کئی ہار پڑے تھے۔ جو روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ اور اس نے ایسا عطر مل رکھا تھا جس کی تیز خوشبو مہک رہی تھی۔

پالکی خوابگاہ کے دروازہ کے قریب رکھ دی گئی۔

رشید بڑی نزاکت سے اس میں سے اترے۔ دو کنیزیں انہیں سہارا دے کر اندر لے گئیں۔ اور مسہری پر بیٹھا دیا۔

ابن مشعل پالکی ہٹوا کر کمرہ میں آیا۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کنیزوں کو رخصت کر دیا۔ اور ایک نہایت قیمتی ہار اپنے گلے سے اتار کر دلہن کے گلے میں ڈال دیا۔ اور کہا" یہ رونمائی میں نذر ہے۔ آپ چہرہ انور سے نقاب الٹ دو۔

کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اور دلہن سے زیادہ آراستہ تھا۔ رشید نے آہستہ آہستہ نقاب اٹھا کر ایک دم الٹ دیا۔ ابن مشعل ہزار شوق سے روئے جانان کے دیدار کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جونہی ان کی نظر رشید کے داڑھی والے چہرہ پر پڑی۔ سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ گھبرا کر بولا" تم"

رشید نے کہا۔ جی ہاں یہ خاکسار"

ابن مشعل نے غضبناک ہو کر کہا "دھوکا ـــــ تمہیں یہ جرأت ۔ کیسے ہوئی "
رشید ۔ او یہودی ۔ کیا تو سمجھا تھا کہ ایک معصوم اور عصمت مآب دوشیزہ تیرے حرم میں آ جائے گی ۔
ابن مشعل ۔ اسے آنا ہو گا ۔ ضرور آنا ہو گا ۔ کوئی طاقت اسے میرے حرم میں آنے سے نہیں روک سکتی ۔
رشید ۔ اس کے آنے سے پہلے ۔ تیری موت آ گئی ہے ۔
یہ کہتے ہی رشید نے خنجر میان سے کھینچ لیا ۔ خنجر دیکھتے ہی ابن مشعل کی روح کھنچنے لگی ۔ اس نے شور شروع کیا ۔ رشید نے کود کر اس کا گلا پکڑا ۔ اور کہا ۔ کیوں چلاتا ہے ۔ تیرے پاس بھی خنجر ہے نکال اور مقابلہ کر ۔
لیکن بدکاروں میں جرأت اور ہمت نہیں ہوا کرتی ۔ وہ کانپ رہا تھا اور چلا رہا تھا "بچاؤ ـــ بچاؤ "
کئی غلام اور کنیزیں بھاگتی ہوئی خوابگاہ میں آئیں ۔ رشید نے سمجھ لیا کہ اگر اس وقت تاخیر کی تو اس کے غلام اسے چھڑالیں گے ۔ چنانچہ انہوں نے بڑی پھرتی سے خنجر اس کے سینہ میں گھونپ دیا ۔ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا ۔ رشید نے اس کے سینہ پر کھڑے ہو کر کہا "بدکار" اور بد اعمال آج میں نے ان معصوم ہستیوں کا تجھ سے انتقام لے لیا ۔ جن کے ناموس کی تو نے دھجیاں اڑائی تھیں "

لہ مغرب اقصیٰ کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھا ہے ۔
" ابن مشعل کو عیش کا چسکہ پڑ گیا تھا ۔ اس نے شہر فاش کی ایک شریف زادی کو جس کے حسن و جمال کا شہرہ دور دور پھیلا ہوا تھا ۔ اپنے قبضہ میں کرنا چاہا ۔ اور دلربا کے والدین ابن مشعل کے مقروض ہو گئے تھے ۔ ایک طرف افلاس تھا اور اس یہودی کے قرضہ کا بارگراں ۔ جب انکے پاس اُن کی حسین لڑکی کی خواستگاری کا پیغام پہنچا تو ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ۔ انہوں نے ہر چند احکام اور سلطان سے فریاد کی ۔ لیکن ابن مشعل کے مقابلہ میں کسی نے انکی مدد نہ کی جامع قیروئین کے ایک غیور طالبعلم کی رگِ حمیت جوش میں آ گئی ۔ اس نے ہاشمی دوشیزہ کے والدین کو تسلی دی "

غلاموں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ رشید پر حملہ کرتے تھوڑی ہی دیر میں سیہ کار ابن مشعل تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک غیور طالب علم نے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب غلاموں اور کنیزوں نے خوابگاہ سے باہر نکل کر شور مچایا "دلہن نے ابن مشعل کو قتل کر ڈالا"

اس شور کے سنتے ہی زنانے کپڑے اتار اتار کر اور پھینک پھینک کر رشید کے نوجوان ساتھی تلواریں لے لے کر ڈولوں اور پالکیوں سے نکل آئے۔ انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اور غلاموں پر حملہ کر دیا۔

تمام غلام ہتھیار بند تھے۔ وہ بھی مقابلہ میں آ گئے۔ تلواریں چلنے لگیں۔ سر اور تن کٹ کٹ گرنے لگے۔ کنیزیں چلا چلا کر بھاگنے لگیں۔

رشید نے بھی جلدی جلدی دلہن کا لباس اتارا۔ اور تلوار لیکر خوابگاہ سے باہر نکلے۔ انہوں نے بھی مار کاٹ شروع کر دی۔

کئی سو غلام تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ ساتھ ہی ابنِ مشعل کے سپاہی بھی تلواریں لے لے کر قصر میں گھس آئے۔ اور وہ قصر جو دلہن کے استقبال کے لیے سجایا گیا تھا میدان جنگ بن گیا۔

ابن مشعل کے غلام اور سپاہی سب یہودی تھے۔ انہوں نے رشید اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان سمٹ کر سب ایک جگہ جمع ہو گئے اور انہوں نے نہایت سختی سے جنگ شروع کر دی۔ ان کی تلواریں بڑی پھرتی سے چلنے اور کاٹ کرنے لگیں۔ سروں پر سر اچھلنے اور خون کے فوارے اُبلنے لگے۔

چونکہ تمام قصر میں چراغاں ہو رہا تھا۔ اس قدر روشنی پھیلی ہوئی تھی کہ دن نکلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے روشنی میں تلواریں چمک رہی تھیں۔

والدین کو تسلی دی اور خود اپنے چالیس ساتھیوں کے ہمراہ پالکیوں اور ڈولوں میں سوار ہو کر ابن مشعل کے قصر میں پہنچا۔ اور جب بدمست یہودی ان کی خوابگاہ میں آیا تو اُس نے اس کا کام تمام کر دیا۔

یہودی بھی بڑے جوش سے حملے کر رہے تھے۔ لیکن مسلمان ان کی تلواروں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہودی برابر قتل ہو رہے تھے۔ اور مسلمان زخمی بھی نہ ہوتے تھے۔

رشید کو بڑا جوش اور غصہ تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر اور جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہے تھے۔ ان کی تلواریں موت کا فرشتہ بن گئیں تھیں۔ جس کے سر پر پڑتی تھی اسے قتل کیے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ انہوں نے بیشمار یہودیوں کو قتل کر ڈالا۔ مگر اس پر بھی ان کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ ہر اس یہودی کو قتل کر ڈالنا چاہا جس کا تعلق ابن مشعل سے تھا۔ ان کی صورت سے یہودی ڈرنے لگے۔

رشید نے مسلمانوں کو للکارا۔ مسلمانوں نے جوش میں آکر نہایت شدت سے حملہ کیا۔ اس حملہ میں انہوں نے سو یہودیوں کو مار ڈالا۔ باقی یہودی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگ نکلے۔ اور قصر سے باہر چلے گئے۔

اب رشید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ خدا نے ہمیں کامیاب کیا۔ دشمن خدا۔ ابن مشعل مارا گیا۔ اس کا قصر اور اس کی دولت تمہارے قبضہ میں ہے۔ جس قدر دولت چاہو لے لو۔

چند نوجوانوں نے کہا "ہم مال غنیمت کی طمع لیکر یہاں نہیں آئے تھے۔ صرف ابن مشعل اور اس کے حمایتیوں کو قتل کرنے آئے تھے۔ ہم نے انہیں مار ڈالا۔ ہم خدا سے ثواب کے خواستگار ہیں۔ اس کی دولت ہمیں نہیں چاہیئے۔

رشید۔ مگر جو زیورات ابن مشعل نے زرقا کے لیے بھیجے تھے۔ اس کے متعلق کیا کہتے ہو۔ کیونکہ وہ زیورات میں پہن کر آیا تھا۔

سب نے کہا۔ وہ زرقا کے ہیں۔ انہیں لے لو"

چنانچہ رشید خوابگاہ میں گئے۔ اور زیورات لیکر باہر آئے۔ تمام مسلمان ابن مشعل کے قصر سے نکلے۔ اور اس کے اصطبل میں پہنچکر اس کے گھوڑوں پر زین کسے اور ان پر سوار ہو کر رات ہی کو وہاں سے فاس کی طرف چل پڑے۔

اڑتالیسواں باب ۴۸

کافر گیسو

زرقا نے بیان کیا۔

"مجھے اس روز جس روز رشید گئے تھے۔ دن بھر اور رات بھر فکر رہی۔ بار بار ان کا خیال آتا رہا۔ اور جب خیال آتا بڑا اضطراب ہوتا۔ دل کو بڑی اذیت پہنچتی۔ بڑی مشکل سے وہ رات کٹی۔ صبح ہوئی۔ پھر رشید کا خیال ستانے لگا۔ میرے دل سے ہر وقت ان کے لیے دعا نکلنے لگی۔

ظہر کی نماز کے بعد میں اپنے کمرہ سے نکل کر امی جان کے کمرہ کی طرف جا رہی تھی۔ کہ رشید آ گئے۔ کیا بتاؤں کہ انہیں دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی۔ میرا چہرہ روشن ہو گیا۔ اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ اور بیساختہ میری زبان سے نکلا یہ تم آ گئے"۔

انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا "ہاں آ گیا۔ تمہیں میرے آنے سے خوشی ہوئی؟"

میں۔ بہت زیادہ۔ میں رات بھر بڑی پریشان اور بے چین رہی"

وہ برابر میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں بے خیالی میں یہ کہہ تو گئی کہ "میں رات بھر بڑی پریشان اور بے چین رہی"۔ مگر جب یہ خیال ہوا کہ میں نے یہ کیا کہا تو شرم سے کٹ گئی۔ جی چاہا بھاگ جاؤں۔ مگر مجھے ان

کے حالات سننے تھے۔ اس لیے نہ بھاگ سکی۔ نظریں جھکا کر کھڑی رہ گئی۔

اسی وقت امی جان بھی آ گئیں۔ رشید کو دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ ان کا چہرہ بھی شگفتہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا ”بیٹا تم آ گئے“۔

رشید نے انہیں سلام کر کے کہا۔ ”جی ہاں آ گیا“۔

ہم تینوں وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ امی جان نے کہا ”کیا رہا بیٹا“۔ ابن مشعل کو کس حال میں چھوڑا — ؟

رشید۔ مسلمانوں کو ستانے کے لیے ابن مشعل دنیا میں نہیں رہا۔

امی جان نے حیرت سے کہا۔ کیا وہ مارا گیا — ؟ کس نے مارا اسے ؟

رشید۔ آپ کے اس خادم نے اسے ٹھکانے لگا دیا — میں تمام حال عرض کرتا ہوں۔

چنانچہ انہوں نے وہ تمام حال سنایا جو میں پہلے بیان کر چکی ہوں میرے دل پر ان کی بہادری نے بڑا اثر کیا۔ انہوں نے وہ تمام زیورات جو ابن مشعل نے میرے لیے بھیجے تھے اور جسے وہ پہن کر گئے تھے۔ اپنی عبا کی جیب میں سے نکال کر میرے سامنے رکھ کر کہا۔ یہ زیورات ابن مشعل نے تمہاری نظر کیے تھے۔ تمہیں مبارک ہوں۔

میں نے امی جان کی طرف دیکھا — ان کی مرضی معلوم کرنے کے لیے انہوں نے کہا ”بیٹی۔ یہ زیورات تمہارے ہی لیے بھیجے گئے تھے۔ لے لو“۔

میں نے زیور لے لیے۔ امی جان نے رشید کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اگرچہ میں امی جان کیوجہ سے ان کا شکریہ اپنی زبان سے ادا نہ کر سکی۔ مگر میرا دل ان کا مشکور تھا۔ اور انہیں دعائیں دے رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری آہ وزاری پر ان کی رگِ حمیت جوش میں آ گئی تھی۔ اور جس کام کو حکومت اور سلطان انجام نہ دے سکے۔ اسے انہوں نے انجام دے کر ہمارے خاندانی ناموس اور میری عفت کو بچایا۔

وہ چلے گئے۔ امی جان نے ابا جان سے وہ تمام حالات بیان کیے جو رشید نے انہیں سنائے تھے۔ وہ بھی رشید کے بہت مشکور ہوئے۔ وہ جامع قیروین میں ان سے جاکر ملے۔ ان کا شکریہ ادا کیا۔

اب یہ خوف ہمیں دامنگیر ہوا کہ ابن مشعل کے مارے جانے سے کہیں سلطان ناخوش نہ ہو جائیں۔ یا یہودی کوئی فساد نہ اٹھا کر کھڑا کردیں۔ تیسرے ہی روز تمام فاس میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ابن مشعل مارا گیا۔ اس خبر کے ساتھ ہی میرا بھی ذکر شروع ہوا۔ اور فاس سے نکل کر یہ خبر تمام مغرب اقصیٰ میں پہنچ گئی۔ ابن مشعل کے قتل کی خبر کے ساتھ ہی میرا ذکر اور میرے ذکر کے ساتھ رشید کی جرأت اور دلیری کے تذکرے بھی ہونے لگے۔ اس طرح میں بدنام ہونے لگی۔

ہمیں سلطان کی طرف سے بڑا خوف تھا۔ جب ابن مشعل کے قتل کی خبر سلطان نے سنی تو انہوں نے رشید کو بلاکر تمام حالات دریافت کیے۔ رشید نے بڑی بے خوفی سے سب حالات سنا دیئے۔ خیال تھا کہ سلطان خفا ہونگے مگر وہ بالکل ہی نہیں بگڑے۔ بلکہ انہوں نے رشید کی دلیری کی تعریف کی۔ اور انہیں اپنی حمایت میں لے لیا۔

یہ ہے میری داستان جس کے سننے کو تو بہت بے چین تھی۔

جمیلہ۔ کافی دلچسپ ہے۔ تیری داستان۔ مگر یہ وحشی کون تھا جس نے تیرے ملاں پر حملہ کیا۔

زرقا:۔ وہ ابن مشعل کا معتمد خاص تھا۔ میرا ڈولا لینے کے لیے وہ بھی آیا تھا۔ رشید کی پالکی کے ساتھ فاس سے تاڑ گیا تھا۔

جمیلہ۔ مگر تیرا ملاں نکلا۔ بڑا ڈھیٹ۔ بڑے معرکہ کا کام کیا۔ اس نے

لہ مغرب اقصیٰ کے صفحہ ۱۴۵ پر لکھا ہے کہ جب ابن مشعل نے زرقا کے لیے پیغام بھیجا تو اس کے والدین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے آہ وزاری شروع کی۔ ان کی آہ وزاری سن کر جامع قیروین کے ایک طالبعلم کی رگِ حمیت جوش میں آگئی۔

جب تازا میں مشہور ہوا کہ ابن مشعل رات کو مارا گیا۔ اور اس کے غلام اور سپاہی بھی بڑی تعداد میں مارے گئے تو سب کو بڑا تعجب ہوا۔ حیرت یہ تھی کہ کس نے یہ مردانگی کا کام کیا۔ چند ہی روز کے بعد معلوم ہوا کہ قیروتین کے ایک طالبعلم نے یہ بہادری کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیرا ذکر بھی سنا۔ اس سے پہلے تازا والوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات مشہور ہوئی کہ فاس کی ہاشمی دوشیزہ زرقا پر ابن مشعل فریفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے اس کے والدین کو قرضہ کے جال میں پھانسا، پھر اُسے اڑانے کی کوشش کی۔ قیروتین کے طالب علم نے جوش میں آکر اُسے اس کے قصر میں قتل کر دیا۔ کوئی کہتا زرقا اس طالب سے منسوب تھی۔ کوئی کہتا وہ طالب علم اس کا رشتہ دار ہے۔ کوئی کہتا قومی حمیت نے اسے جوش دلایا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ مجھے تیری تصویر نمائش میں دیکھ کر ہی یہ خوف ہوا تھا۔ کہ تیری وجہ سے ضرور فتنے اٹھیں گے۔ آخر وہ خوف سامنے آگیا۔ ایسا بڑا فتنہ اٹھا کہ سینکڑوں آدمی مارے گئے۔ ابن مشعل جیسا سیہ کار اور سفاک شخص ہلاک ہوا۔ بس میرا کہا مان۔ اس ملاں کے پلے سے بندھ جا۔ نہیں تو نہ جانے اور کتنے فتنے تیری ذات سے اٹھیں گے۔

زرقا۔ تجھے ملاں بہت پسند آگئے ہیں۔

جمیلہ:۔ مجھ سے پوچھتی ہے۔ اپنے دل سے پوچھ۔ بے نقاب اور بے حجاب ان کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتی ہے۔ کمبخت کیا ہو گیا ہے تیری شرم کو۔

زرقا۔ بکے جا۔

جمیلہ:۔ مگر تیرا ملاں ہے نرا ملاں ہی۔ تجھے یہ نہیں بتایا کہ ہے کون۔ کہیں کوئی غلام زادہ تو نہیں ہے۔

زرقا۔ پوچھ لے جاکر۔

جمیلہ۔ میں تو ایک منٹ میں اُس کا راز اگلوالوں۔ مگر نہیں، تو اس کے راز کے پیچھے نہ پڑنا۔ تیرے ماں باپ کو اپنی عالی نسبی کا بڑا فخر ہے۔

اگر وہ کوئی ایسا ویسا ہوا تو وہ تیرا ہاتھ اُس کے ہاتھ ہرگز بھی نہ دیں گے۔

زرقا — اور کچھ بک لے۔

جمیلہ ۔ میں نے سمجھا دیا ہے اب تو جان۔

اسی وقت زرقا کو اس کی امی جان نے آواز دی۔ وہ دوڑی چلی گئی۔ جمیلہ تنہا بیٹھی رہ گئی۔ زرقا کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ جمیلہ نے دونوں چوٹیاں کھول ڈالیں اور بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

وہ بھی حسین تھی۔ کافی حسین اس کے سر کے بال لمبے۔ ریشم کی طرح ملائم اور سیاہ تھے۔ سیاہ بالوں میں اس کا چہرہ چاندنی طرح چمک رہا تھا۔

اسی وقت سعید کمرے کے باہر آ گئے۔ انہوں نے زرقا کو آواز دی۔ زرقا وہاں تھی۔ نہیں۔ جمیلہ نے شرم کی وجہ سے جواب نہیں دیا۔ سعید۔ سمجھے وہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ دھڑانہ کمرے میں داخل ہوئے۔ جمیلہ نے حسین آنکھیں اٹھا کر دلفریب نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ اس کا فرگیسو کو دیکھ کر کچھ مسحور ہو گئے۔ ایک لمحہ اسے دیکھتے رہے۔ جمیلہ نے جلدی سے دوپٹہ اوڑھ لیا۔ انہوں نے کہا " اوہ! معاف کرنا۔ مجھے خیال ہوا تھا۔ کہ کمرہ خالی ہے "

وہ جلدی سے چلے گئے۔ اسی وقت زرقا آ گئی۔ اس نے سعید کو کمرہ سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی کمرہ میں آئی اور بولی " یہ تو نے بھائی جان کو کیوں بلایا تھا چڑیل۔

جمیلہ — مردار، تو نے خود تو بھیجا تھا۔ انہیں۔ دیکھتی رہ تجھے کیسا زچ کرتی ہوں "

زرقا — اور یہ تو نے چاند سے چہرہ پہ زلفوں کا جال کیوں پھیلایا تھا۔؟

جمیلہ : — تو چلی گئی — میں نے سوچا بالوں میں کنگھی ہی کر ڈالوں کہ وہ آدھمکے۔

زرقا — وہ آدھمکے —— میں اڑتی چڑیا کو پہچانتی ہوں۔

جمیلہ - پہچانتی رہ -
زرقا - کمبخت - تو ہے شریر اور وہ ہیں سیدھے آدمی کیسے نباہ ہوگا -؟
جمیلہ - بہت چل نکلی ہے تو - یاد رکھنا مار مار کر سیدھا کر دوں گی -
زرقا - تیرا رشتہ ہی ایسا ہو جائے گا - مار بھی لے گی تو میں کیا کرونگی -
جمیلہ :- رشتہ کے بھول میں نہ رہنا -
زرقا :- کیا کہہ گئے ہیں وہ -؟
جمیلہ :- کہہ گئے ہیں - ملاں کو آرام ہوا اور زرقا کو اس کے پلّہ سے باندھا -
زرقا - چڑیل -
دونوں ہنسنے لگیں -

انچاسواں باب ۴۹

رشکِ حور

جمیلہ کئی روز سے مہمان تھی۔ بچپن کی وہ سہیلیاں مدت کے بعد ملی تھیں۔ دونوں حسین تھیں۔ شوخ تھیں۔ سارا سارا دن ہنستے ہنساتے گذر جاتا تھا۔ رات کو بھی دونوں عشا کی نماز پڑھ کر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتیں اور لڑکپن کے زمانہ کی باتیں کر کر کے ہنستی رہتیں۔ کافی رات گئے تک جاگتیں اور جب بالکل ہی نیند آجاتی تب سوتیں۔

اب زرقا۔ رشید کے پاس بہت کم جاتی تھی اور اگر جاتی بھی تھی تو بہت جلد واپس آجاتی تھی۔ کیونکہ اسے جمیلہ کی شرارت کا خیال رہتا تھا۔

رشید کو اب آرام ہوگیا تھا۔ اور پٹی کھول دی گئی تھی۔ ڈاکٹر عثمان نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ کچھ دور چہل قدمی کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ صبح و شام کچھ دور تک چلے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی کمزوری بھی دور ہونے لگی تھی۔

ایک روز جمیلہ نے زرقا سے کہا "بھئی زرقا۔ اب آنا تو تازہ"

زرقا۔ بس معاف کرو مجھے ایک دفعہ گئی تھی تو —

جمیلہ نے قطع کلام کرتے ہوتے کہا۔ ایسا گل کھلا کہ ایک دو نہیں کئی سو آدمی مارے گئے — ارے اچھا ہی ہوا وہ سفاک مارا گیا جس نے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ تجھے کیا فکر اس کی "

زرقا — میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ بات کاٹنے والے سے گانٹھ کاٹنے

والا اچھا ہوتا ہے۔

جمیلہ۔ اچھا ۔۔۔ تو کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ کہہ ۔۔

زرقا۔ ایک دفعہ گئی تھی۔ تو تیرے اماں باوا نے بار سمجھا تھا۔ اب جاؤں گی تو گھسنے بھی نہ دیں گے۔

جمیلہ۔ تو ہے پگلی۔ جب تو یہ سمجھا گیا تھا کہ تو ابن مشعل کی طلبی پر آئی ہے۔ اس لیے تیری مدارات دل سے نہیں کی گئی تھی۔ اب دیکھ تجھے سر آنکھوں پر لیں گے۔ مگر ملاں کو ضرور لانا اپنے ساتھ۔

زرقا نے مسکرا کر کہا "ملاں بیچارہ کو کیوں کہہ رہی ہے۔ اس فوجی کو کیوں نہیں کہتی۔ جس کے اُوپر گرتی پھرتی ہے۔

جمیلہ تو بہت ہی شریر ہے۔ بھلا کیا کہا ہو گا ان بیچاروں نے۔

زرقا۔ سننا چاہتی ہے کہ کیا کہا تھا انہوں نے۔

جمیلہ نے اس شریرہ کی طرف دیکھ کر کہا "کچھ تجھ سے کہا تھا۔۔؟"

زرقا۔۔ سننا چاہتی ہے۔

جمیلہ۔ سنا ؟

زرقا۔ کیا کرے گی سن کر۔

جمیلہ۔ مت سنا

زرقا۔ نہیں سناتی۔

جمیلہ۔ جب سنانا نہیں تھا تو چڑیل تو نے ذکر ہی کیوں کیا تھا۔

زرقا۔ میں کیوں ذکر کرتی۔ تو نے ہی کیا۔

جمیلہ۔ اچھا میں نے ہی کیا سہی۔ بتا کیا کہہ رہے تھے۔

زرقا۔ کہہ رہے تھے۔ زرقا۔ تیری سہیلی بھی عجیب ہے۔ کلا بازیاں کھاتی پھرتی ہے۔

جمیلہ۔ مردار تیری اس حرکت نے مجھے بہت ہی شرمندہ کیا۔

زرقا۔ مگر میں نے انہیں سمجھا دیا۔

جمیلہ:۔ کہی ہوں گی تو نے اُلٹی سیدھی باتیں۔

زرقا — بالکل نہیں سیدھی سی بات کہی تھی۔ پوچھنے لگے تیری سہیلی ہم پر کیوں آپڑی۔ میں نے کہا۔ وہ تمہیں پاس سے دیکھنا چاہتی تھی۔ شوقِ دید میں خیال نہ رہا۔ ایک دم تم پر جا پڑی۔

جمیلہ نے اس کے چٹکی لی۔ زرقا جیسی نازنین کیسے برداشت کر لیتی۔ تڑپ گئی۔ بولی ”چڑیل یہ کیا کیا تو نے“

جمیلہ — تجھے جھوٹ بولنے کی تھوڑی سی سزا دی ہے۔

زرقا۔ کمبخت تو اسے جھوٹ سمجھ رہی ہے۔ یہی باتیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی تجھے پسند کر لیا ہے۔ مگر میں نے یہ کہہ دیا ہے۔ وہ ایسی بھولی اور نیک نہیں ہے۔ جیسی تمہارے سامنے بنی کھڑی تھی۔ بڑی شریر ہے۔ کہنے لگے۔ ہم سب سیدھا کر لیں گے — بس معاملہ طے ہی ہو گیا سمجھو“

جمیلہ :۔ پوچھوں گی تیرے ملاں سے۔

ایک روز جمیلہ نے اپنے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ زرقا نے روکنا چاہا۔ لیکن وہ تازا جانے والی تھی۔ اس لیے اس نے عذر کر دیا۔ مگر اس کی امی جان نے اسے روک لیا۔ اور اس کی خالہ سے کہلا بھیجا کہ دو چار روز کے بعد جمیلہ آئے گی۔

اس کے اگلے روز اس نے جمیلہ سے کہا کہ وہ زیورات۔ لباس اور تاج پہن کر مجھے بھی دکھا۔ جو ابن مشعل اور ملاں کو پہن کر دکھایا تھا — زرقا نے معذرت کی۔ لیکن اس نے سنی ہی نہیں — زرقا نے کہا ”ادھر تو بھائی جان آئے ہوتے ہیں۔ ادھر امی جان ہیں۔ کیسے پہنوں وہ لباس اور زیورات، بھائی جان اور امی جان نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔

جمیلہ نے کہا ”تو اپنے کمرہ میں کیوں پہنے۔ صبح کے وقت تیرا ملاں ہوا خوری کے لیے جایا کرتا ہے۔ اس وقت اس کے کمرہ میں پہن کر دکھا دینا۔“

غرض کچھ جمیلہ نے کچھ ایسا اصرار کیا کہ زرقا تیار ہو گئی۔ دوسرے روز جب

رشید جہاں بندمی کے لیے چلے گئے تو زرقا نے اپنا سب سے اچھا لباس نکالا۔ اور وہ تمام زیورات لیے۔ جو ابن مشعل نے اسے دلہن بنانے کے لیے بھیجے تھے۔ تاج بھی لیا۔ اور دونوں چپکے سے رشید والے کمرے میں پہنچ گئیں۔ وہاں زرقا نے لباس بدلا اور جمیلہ نے زیورات پہنائے اور تاج اڑھا دیا۔

اس لباس زیورات اور تاج نے اسے رشک حور بنا دیا۔ اس کی شان شاہزادیوں اور ملکاؤں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اس کے آئینہ تمثال رخساروں میں جواہرات نے بجلیاں سی بھر دیں۔ حسین آنکھیں ستم ڈھانے لگیں۔ اس کا حسن بے پناہ ہوگیا۔ اور اس کے درخشندہ چہرہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا دشوار ہوگیا۔ جمیلہ حیرت اور محبت بھری نظروں سے اس پیکر حسن و جمال کو دیکھنے لگی۔ زرقا نے مسکرا کر کہا۔"

کیا دیکھ رہی ہے تو ——— ؟"

جمیلہ نے کہا "صنعت پروردگار کا نادر نمونہ دیکھ رہی ہوں۔ خدا کی قسم ایسی حسین اور نازنین ہے کہ چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی"

زرقا۔ کہیں نظر نہ لگا دینا تو مجھے۔

جمیلہ۔ عجب نہیں کہ نظر لگ جائے۔ جب میرا یہ حال ہے کہ جی چاہتا ہے تجھ پر سے قربان ہو جاؤں تو مردوں کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ابن مشعل ضرور تجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگیا ہوگا۔ اور ہلال۔ بھلا ہلال بیچارہ تجھے اس لباس میں دیکھ کر کیسے اپنے حواس میں رہ سکتا ہے۔ بھول گیا ہوگا سب علم و ہنر یاد رہ گئی ہوگی تیری چشم فتنہ جو۔ تیر مژگان۔ ہلال ابرو۔ چاند سا چہرہ۔ سیب سے عارض، خوشنما لب اور موتیوں جیسے دانت۔

زرقا۔ کمبخت۔ سراپا کھینچ رہی ہے میرا۔

جمیلہ:۔ اگر میں شاعرہ ہوتی تو تیرا سراپا ضرور لکھتی۔ یہودی مصور نے تیری تصویر کھینچنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن کھینچ نہیں سکی۔ واقعی اگر تو اس لباس اور اس حالت میں لوگوں کے سامنے آجائے تو بخدا لوگ دیوانے ہو جائیں۔

جمیلہ نے دیکھا۔ رشید آہستہ آہستہ آرہے ہیں۔ اسے شرارت سوجھی اور اس نے کہا۔ میں آئینہ لاکر تجھے دکھاتی ہوں"

وہ زقند لگا کر کمرہ سے باہر ہوگئی۔ اور اس نے جلدی سے وہ دروازہ بند کر دیا جو زنان خانہ کی طرف تھا۔

ادھر اس نے دروازہ بند کیا۔ ادر زرقا نے اس طرف دیکھا۔ ادھر رشید کمرہ میں داخل ہوئے۔ زرقا نے ان کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ جلدی سے ان کی طرف لوٹی۔ دیکھا رشید آگئے تھے۔ وہ شرم و حیا کی پتلی بن کر کھڑی رہ گئی۔ رشید اس فتنۂ جہاں کو دیکھ کر دیکھتے رہ گئے۔ ایک لمحہ کیلئے وہ اپنے حواس کھو بیٹھے۔ کچھ وقفہ کے بعد سنبھلے اور بولے "زرقا یہ تم میرے ضبط و تحمل کا امتحان کیوں لے رہی ہو۔؟"

زرقا اس بات کا کیا جواب دیتی۔ اس وقت اس نے اپنی خواہش سے یہ لباس اور زیورات نہیں پہنے تھے۔ شریر جمیلہ کے اصرار پر پہنے تھے۔ اس نے کہا۔ معاف کیجئے۔ شریر جمیلہ نے مجھے یہ لباس اور زیورات پہنائے ہیں"

رشید :۔ مگر تم انہیں پہن کر یہاں کیوں آئیں۔

زرقا نے بھولے پن سے کہا "یہیں لا کر تو پہنے ہیں"

رشید۔ اپنے کمرہ میں کیوں نہیں پہنے۔

زرقا۔ اس نے اصرار کیا اسی کمرہ میں آکر پہنوں۔

رشید نے مسکرا کر کہا۔ بڑی شوخ ہے تمہاری سہیلی۔ اور تم ۔ نہایت ہی بھولی اور معصوم ہو——— اچھا میں جا رہا ہوں تم اپنی سہیلی کو بلا لو"

رشید چلے گئے۔ جمیلہ دروازے سے لگی سب باتیں سن رہی تھی اس نے دروازہ کھول دیا۔ زرقا جلدی سے کمرہ سے نکلی۔ اور جمیلہ کے بازو میں نوچ کر کہا "شیطان کی خالہ یہ کیا کیا تھا تو نے"

جمیلہ۔ بے رحم سنگدل۔ کس زور سے نوچا ہے تو نے۔ تیرا ملاں تجھے بھولی اور معصوم بتاتا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ سو شریروں کی ایک شریر ہے۔ اچھا ہے کہ تو اس ملاں ہی کے پلے بندھے۔ اور جب تو اس

کے نوچے ۔

زرقا نے مسکرا کر کہا۔ "چپ مردار"

"جمیلہ۔ میں نے تو زقند ہی لگائی تھی مگر تو ملکہ حسن بن کر ہی ملاں کے حواسوں پر ڈاکہ ڈالنے پہنچ گئی۔"

زرقا کو خوف تھا۔ کہیں اس کی امی نہ آ جائیں۔ اس لیے وہ بغیر جواب دیئے لباس اتارنے جلدی سے چلی گئی۔

پچاسواں باب ۵۰

جمیلہ کی شرارت

ایک روز جب صبح کے وقت رشید چہل قدمی کر کے آئے تو سعید بھی ان کے کمرہ میں گئے۔ سعید فوج میں ملازم تھے۔ وہ دو مہینے کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ یہاں آنے کے چند ہی روز بعد رشید کا واقعہ پیش آگیا۔ اب رشید کو بالکل آرام ہو گیا تھا۔ رشید نے سعید سے کہا "بھائی اب میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ میرا رواں رواں آپ سب لوگوں کا شکر گذار ہے۔ آپ نے جس طرح سے میری تیمارداری کی میرے باپ ماں اور بھائی بھی شائد اس سے زیادہ نہ کر سکتے۔

سعید۔ جو احسان تم نے ہمارے خاندان پر کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہم تمہاری کوئی خدمت بھی نہیں کر سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب تک میں یہاں ہوں۔ اسوقت تک تم بھی یہیں رہو۔"

رشید۔ میں فاس سے باہر نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا اور آپ سے ملتا رہوں گا۔

سعید۔ اچھا تم ابا جان یا امی جان سے کہنا۔

سعید اور کچھ دیر ان سے باتیں کر کے چلے گئے۔ اور انہوں نے اپنی امی جان سے رشید کی باتیں دوہرائیں۔ ان کی امی جان نے شیخ صالح سے کہا۔

شیخ صالح نے کہا۔ ہم پر رشید نے بڑا احسان کیا ہے۔ اس احسان کا بدلہ یہ ہے کہ ہم زرقا سے اس کی شادی کر دیں۔ لیکن اس کے حسب نسب کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔

زرقا کی ماں کا نام فاطمہ تھا۔ فاطمہ نے کہا: "سچ پوچھتے ہو تو جب سے میں نے رشید کو دیکھا ہے اس کی محبت میرے دل میں پیدا ہوگئی ہے اور اسی وقت سے میں یہ سوچا کرتی تھی کہ ہماری زرقا کے لیے رشید سے اچھا شوہر نہیں مل سکتا۔ مگر تم سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آج تم نے ذکر کیا ہے تو میں کہتی ہوں۔ اس حسب نسب کے جھگڑے میں مت پڑو۔ قاضی جی کو بلوا کر دو بول پڑھوا دو۔"

شیخ صالح۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا حسب نسب معلوم ہونا ضروری ہے

فاطمہ:۔ حسب نسب انسان کے چال چلن سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے اطوار نہایت شائستہ اور شریفانہ ہیں۔ بڑا خوددار اور غیور ہے۔ نڈر اور بہادر ہے۔ ضرور کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

شیخ صالح۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت بھی ہوگئی ہے۔ جب وہ جانے کا نام لیتا ہے۔ تو میرے دل کو تکلیف بھی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر اس کے خاندان کا حال معلوم ہونا ضروری ہے۔ لڑکی کا معاملہ ہے۔ بغیر حسب نسب معلوم کیے کیسے اسے اپنے خاندان میں شامل لیا جائے۔

فاطمہ۔ تم حسب نسب کے چکر میں پڑے رہنا۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ آج کل شریف لڑکوں کا ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ کسی اور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تو دیکھتے رہ جاؤ گے۔

شیخ صالح۔ کیا کوئی بات سنی ہے۔؟

فاطمہ۔ وزیر نی ہی کئی مرتبہ ذکر کر چکی ہیں۔ شاید وہ اپنی بڑی لڑکی سے منسوب کرنا چاہتی ہیں۔ ابھی انہیں یہ خیال ہے کہ ہم زرقا کے لیے اسے منتخب کر چکے ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی معلوم ہو گیا کہ ہم حسب نسب کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں

تو وہ فوراً رشید کا ہاتھ پکڑ لیں گی۔"

شیخ صالح۔ ہم نے رشید سے چند مرتبہ اس کے خاندان کے متعلق پوچھا۔ اس نے ٹال دیا۔ اب ارادہ ہے قاضی مصباح سے پوچھیں۔

فاطمہ۔ مگر پوچھو گے کب۔ وہ تو اب جانے کو کہہ رہا ہے۔

شیخ صالح۔ آج ہی پوچھیں گے۔

جب ان دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں تو اتفاق سے جمیلہ آنکلی تھی۔ اور اس نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ وہ دوڑی ہوئی زرقا کے پاس گئی۔ زرقا اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے لمبے اور ملائم سیاہی مائل بھورے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

جمیلہ نے کہا "لنوڑیا تو ابھی کنگھی ہی کر رہی ہے اور وہاں تیری قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

زرقا نے ترچھی چتون سے دیکھ کر کہا۔ کیا فیصلہ ۔ ہے"

جمیلہ۔ وہ تیرا ملاں بھاگا جا رہا ہے۔ کچھ مراقی معلوم ہوتا ہے مجھے تو۔

زرقا۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔

جمیلہ۔ دماغ خراب ہے تیرے ملاں کا۔ کیا بتاؤں ذرا حجاب معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اس سے جا کر پوچھتی تو زرقا جیسی حور کو چھوڑ کر کہاں بھاگا جاتا ہے۔ یہاں اسے ہر طرح کا آرام ہے۔ اس کی ہر طرح سے خدمت ہو رہی ہے۔ تجھ جیسی حور اسے اپنا جلوہ بھی دکھا دیتی ہے مگر وہ ہے کہ دم سے تڑا کر بھاگنے کی فکر میں ہے۔ میں کہتی نہ تھی کہ یہ ملاں کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ذرا سی ہی دیر میں بدل جاتے ہیں۔ بس بدل گیا وہ۔

زرقا۔ مردار۔ کیا بک بک کر رہی ہے۔

جمیلہ۔ تجھے بک بک سوجھ رہی ہے۔ مجھے تجھ پر رونا آ رہا ہے۔

زرقا۔ اچھا تو روئے جا۔

جمیلہ۔ میں تو خیر کیا روؤں گی۔ مگر ہاں تیرے رونے کا وقت آ گیا ہے۔ تیرے باوا کو حسب نسب کی پڑی ہے۔ یہ نہیں کہ ملاں کو باندھ لے۔ تیری امی

بیچاری ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ انہیں خوف ہے۔ کہیں وزیر نی تیرے ملاں کو اپنی لڑکی کے لیے نہ اڑا لے۔

زرقا :۔ کیا ہذیان بک رہی ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتی۔

جمیلہ۔ صاف صاف ہی تو کہہ رہی ہوں۔ اب اگر تو کوڑھ مغز ہے اور تیری سمجھ میں نہ آئے تو کیا کروں۔

زرقا۔ کہیں تجھ پر کسی جن کا سایہ تو نہیں ہو گیا ہے۔

جمیلہ :۔ اپنے ملاں سے پوچھ اس پر شاید کسی جن زادی کا سایہ ہو گیا ہے۔ کمبخت بھاگنے کی فکر میں ہے۔

زرقا :۔ چڑیل۔ کیسی باتیں کر رہی ہے تو اطمینان سے بیٹھ اور پھر سنا، کیا بات ہے۔

جمیلہ بیٹھ گئی۔ اور اس نے جو باتیں سنی تھیں سب سنا ڈالیں۔ زرقا نے کہا "جاتے ہیں جانے دے"

جمیلہ۔ اس بھروسہ میں نہ رہنا ملاں گیا تو بس گیا۔ سمجھ ادھر کا رُخ نہ کریگا۔

زرقا۔ ان باتوں کو چھوڑ۔ آج میری ایک درخواست منظور کرے

جمیلہ ۔کیا ۔؟

زرقا۔ میرا ایک اچھا سا لباس اور زیورات پہن لے۔ دیکھوں کیسی معلوم ہوتی ہے تو۔

جمیلہ :۔ میں بھی جامہ زیب ہوں۔ پری بن جاؤں گی۔

زرقا نے ہنس کر کہا۔ میں تو جانوں بالکل بیچا معلوم ہوگی "

جمیلہ :۔ مردار۔ بیچا معلوم ہو گی۔ میں کیوں بیچا معلوم ہونے لگی۔

زرقا۔ اچھا تو پہن کر دیکھ لے۔

جمیلہ :۔۔ اچھا لاؤ۔

زرقا نے ایک نہایت ہی اچھا جوڑا نکال دیا۔ جمیلہ نے پہنا۔ زرقا نے سارے زیورات اسے پہنا دیئے۔ اور تاج بھی اڑھا دیا۔

جمیلہ نہایت نہیں حسین لڑکی تھی۔ جامہ زیب بھی تھی۔ اس لباس اور ان زیورات

نے اسے پری ہی بنا دیا۔ زرقا نے مسکرا کر کہا۔ کیسی معلوم ہو رہی ہے تو۔؟

جمیلہ۔ تو ہی بتا۔

زرقا کو اس کی امی نے پکارا۔ اس نے کہا "میں ابھی آئی جمیلہ"

وہ تیزی سے کمرہ سے نکلی۔ چند ہی قدم چلی تھی کہ اسے سعید ملے۔ انہوں نے کہا۔ کہاں دوڑی جا رہی ہے زرقا"

زرقا نے رُک رُک کر ان سے کہا۔ امی جان بلا رہی ہیں۔ میرے کمرہ میں چل کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کِسْ کِسْ[1] لا رہی ہوں"

زرقا چلی گئی۔ سعید اس کے کمرہ میں جا داخل ہوئے۔ وہاں جمیلہ بڑی بے حجابی سے پری بنی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ سعید نے اس بتِ ہوشربا کو دیکھا۔ جمیلہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں شرم و حیا سے جھک گئیں۔

سعید نے کہا "یہ زرقا بڑی شریر ہو گئی۔ اس نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم یہاں ہو"

وہ واپس لوٹ آئے۔ اسی وقت دوسرے دروازہ سے زرقا داخل ہوئی۔ اس نے جمیلہ سے کہا "یہ تو نے بھائی جان کو کیوں بلایا تھا۔

جمیلہ۔ مردار۔ ذرا آ تو میرے پاس شیطان کی خالہ۔ کیوں بھیجا تھا۔ تو نے انہیں یہاں۔

زرقا۔ خوب، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میں نے بھیجا تھا یا تو نے بلایا تھا۔

جمیلہ نے زیورات اور لباس اتار دیے۔ زرقا نے سب چیزیں رکھ دیں۔ اسی روز جمیلہ کو لینے کے لیے اس کی خالہ آ گئی۔ چونکہ جمیلہ کو آئے کئی روز ہو گئے تھے۔ اس لیے زرقا اور فاطمہ اسے اور کچھ دنوں کے لیے نہ روک سکیں۔ شام کے وقت جمیلہ کو بھی افسوس تھا۔ مگر وہ ایسی لڑکی تھی جو غم اور افسوس کی حالت

---

[1] کِس کِس مغرب اقصیٰ والوں کا بڑا مرغوب کھانا ہے۔ یہ جوار اور گیہوں کا دلیہ ہوتا ہے۔ جو مرغ وغیرہ کے گوشت کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ (صادق صدیقی)

یں بھی شوخی اور شرارت کو نہیں چھوڑا کرتی۔ اس نے زرقا۔ سے کہا۔ دیکھ میں جا رہی ہوں۔ مگر تو ملاں کو ہرگز نہ چھوڑنا۔

زرقا نے کہا۔ تو جا کئی روز کے لیے رہی ہے۔ اطمینان رکھ بہت جلد بھائی جان کی کنیز بنوا کر ہمیشہ کے لیے بلواؤں گی۔"

جمیلہ۔ نسوڑیا مجھے کنیز بناتے گی۔

زرقا نے ہنس کر کہا۔ تو اسی قابل ہے۔"

جمیلہ زرقا اور اس کی امی جان سے رخصت ہو کر چلی گئی۔

اکیاونواں باب ۵۱

عجیب باتیں

جمیلہ کے چلے جانے سے زرینا کو رنج ہوا وہ اس کی راز دار سہیلی تھی۔ اس کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ جتنے روز وہ رہی وہ دن بڑی ہنسی خوشی سے پر لگا کر اڑ گئے۔ اس کے چلے جانے سے وہ تنہائی محسوس کرنے لگی۔

اسے جمیلہ نے بتایا تھا کہ رشید جانا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے بھی جانے کے لیے کہہ چکے تھے مگر کہنے سننے سے رک گئے تھے۔ اب پھر جانا چاہتے تھے۔ اسے یہ برا معلوم ہوا کہ ان کی بڑی خاطر مدارت کیجا رہی ہے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔ ہر طرح ان کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور وہ پھر جانے کے لیے تیار ہیں۔ آخر کیوں ۔۔۔؟

اس نے اپنے دل میں یہ طے کیا کہ ان کے پاس نہ جائے۔ ان سے نہ بولے ان کا خیال چھوڑ دے۔ ایک روز تو وہ ان باتوں پر کاربند رہی ۔۔۔ نہ رشید کے پاس گئی۔ نہ بولی۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ اس پر کاربند نہ رہ سکی۔ اس نے ہر چند چاہا کہ وہ رشید کے پاس نہ جائے۔ لیکن دل نے کہا۔ ضرور چل ۔۔ اور معلوم تو کر کہ وہ کیوں جانا چاہتے ہیں۔ آخر انہیں یہاں تکلیف ہی کیا ہے۔

چنانچہ وہ چلی۔ رشید اس وقت کمرہ ہی میں موجود تھے۔ وہ دراز کمرہ

میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن بولی نہیں۔ اس طرح وہ اپنی خفگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ رشید نے پوچھا "کہو تمہاری سہیلی چلی گئی۔"

زرقا نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا "جی ہاں چلی گئی۔ اس کے جانے سے شاید آپ کو بڑی خوشی ہوئی۔"

رشید مجھے کیوں خوشی ہوتی۔ وہ بیچاری میرے کس کام میں خارج تھی۔

زرقا چپ ہو گئی۔ کچھ وقفہ کے بعد رشید نے کہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ تم مجھ سے خفا ہو۔"

زرقا۔ میں کیوں خفا ہوتی۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ خفا ہونے کی۔

رشید۔ آج تمہاری گفتگو میں روکھا پن ہے۔ طنز ہے سختی ہے۔ یہ باتیں خفگی ہی کی حالت میں ہوتی ہیں۔

زرقا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رشید نے کچھ دیر انتظار کر کے کہا "کیا نہ بتاؤ گی۔ کیوں خفا ہو۔۔؟"

زرقا۔ میں نے کہہ دیا مجھے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

رشید۔ ضرورت تو نہیں ہے۔ مگر خفا ہو۔

زرقا۔ پھر چپ ہو گئی۔ رشید نے کہا "زرقا۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ میں بھی انسان ہوں غلطی ممکن ہے۔ اگر تم مجھے میری غلطی سے آگاہ کر دو تو میں اگر واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ معافی چاہ لوں گا۔ اور اگر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو اسے دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔

زرقا:۔ آپ سے نہیں ممکن ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں کس قدر تمہارا اور تمہارے خاندان والوں کا مشکور ہوں۔ جب میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ تو تمہاری ہی سب کی ہمدردیوں، جانفشانیوں اور کوششوں نے مجھے موت کے چنگل سے بچایا۔

زرقا:۔ اگر یہ سچ ہے تو یہاں سے جانے کی فکر کیوں ہے۔

رشید چپ ہو گئے۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔

زرقا نے کہا "بتائیے، چپ کیوں ہو گئے۔؟"

رشید نے اس بتِ طناز کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اگر گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل والا معاملہ ہے۔"

زرقا:۔ یہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا سہارا کیوں لیا جانے لگا۔

رشید:۔ اس لیے کہ اگر صاف کہوں گا تو خفا ہو جاؤ گی اور اگر صاف نہیں کہتا تو خدا جانے تم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاؤ۔

زرقا:۔ سچ اور صاف کہیئے، میں خفا نہ ہوں گی۔

رشید:۔ تو سنئے تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک مفلس طالب علم ہوں۔ تم ایک امیر زادی ہو۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں دیکھنے کی بھی تمنا کر سکوں۔ باتیں کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں اپنی ہستی کو نہیں بھول سکتا۔ اس لیے یہاں سے جانے کے سوائے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

زرقا:۔ آپ کو یہ بات معلوم ہے۔ کہ ہم بھی امیر نہیں ہیں، یہ جو کچھ ٹھاٹ ہیں۔ وہ آپ کی بدولت ہیں۔ ورنہ معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔

رشید:۔ ایسا نہ کہیئے۔ تم ایک جاگیر دار کی بیٹی ہو۔ سید زادی ہو، ذی عزت ہو۔ ذی شرف ہو۔ میں ایک گمنام اور مفلس ہوں۔ مجھے یہ احساس ہے کہ میں ایک کم درجہ، کم رتبہ اور کم تر انسان ہوں۔

زرقا۔ کیا ہم میں سے کسی نے ایسا کہا ہے۔؟

رشید:۔ نہیں۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی شرافت کا میرے دل پر نقش ہے۔ تم سب نے ذرہ نوازی کی اور مجھ پر اس قدر مہربانیاں کیں کہ میرا سر موئے تن شکر گذار ہو گیا۔

زرقا:۔ ایسی باتیں نہ کیجیے۔

رشید:۔ نہ کروں گا۔

زرقا:۔ یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دیجیے۔

رشید:۔ چھوڑ دوں گا۔ لیکن تمہیں شاید واقعات کا علم نہیں ہے۔

زرقا:۔ کیسے واقعات؟

رشید۔ ہمارے ملک پر جنگ کے بادل چھانے والے ہیں۔ مادرِ وطن

ہر مسلم نوجوان سے قربانی چاہنے والی ہے۔

زرقا :۔ جنگ کے بادل یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟

رشید :۔ پرتگال کے عیسائی ہمارے ملک، مغرب اقصیٰ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

زرقا :۔ میں نے یہ بات نہیں سنی۔

رشید :۔ عمال حکومت اس بات کو چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر صلح نہ ہو سکے گی اور جنگ کا کوہ آتش فشاں ایک دم پھوٹ پڑے گا۔

زرقا :۔ اگر خدانخواستہ ایسا وقت آیا تو آپ ہی کیا ہر مسلم نوجوان ملک و قوم کی خاطر قربانی دینے کو تیار ہو جائے گا۔ اس وقت آپ بھی جنگ میں حصہ لیں۔

رشید :۔ بہت اچھا ابھی میں یہیں رہوں گا۔

زرقا مسکرائی اور وہاں سے چلی آئی۔ وہ وہاں سے سیدھی امی جان کے کمرہ کی طرف چلی۔ شاید ان سے یہ کہنے کے لیے کہ رشید ابھی نہ جائیں گے۔ جب وہ ان کے کمرہ کے دروازہ پر پہنچی تو اس نے امی جان اور ابا جان کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ وہ لوٹنے لگی۔ اسی وقت امی جان نے کہا۔ میری سمجھ میں معمہ کی باتیں نہیں آتیں۔ صاف صاف کہو قاضی مصباح نے کیا کہا؟"

قاضی مصباح کا نام سُنکر زرقا چونکی اور کھڑی ہو کر باتیں سننے لگی۔ اس کے باپ شیخ صالح نے کہا۔" قاضی مصباح بڑے محتاط شخص ہیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ" آپ جانتے ہیں کہ رشید کس کے بیٹے ہیں؟" تو وہ ایک دم چونک گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا" میں جانتا ہوں۔

یہ تم نے کیسے سمجھا۔؟

میں نے کہا" آپ شاید بھول گئے، جس روز آپ رشید کی شہادت

لینے گئے تھے، میں اس وقت موجود تھا۔ رشید نے اپنے والد کا نام بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جب آپ نے اصرار کیا تھا تو آپ کے کان میں بتایا تھا۔"

وہ کچھ نادم سے ہو گئے۔ انہوں نے کہا "ہاں مجھے یاد آگیا — مگر سید صاحب آپ ان کے راز کے انکشاف کے درپے نہ ہو جئے۔ آپ نے رشید کے وہ الفاظ بھی سنے ہوں گے جو انہوں نے اپنے والد کا نام بتانے کے متعلق کہے تھے۔"

میں :۔ سنے تھے اور یاد ہیں۔

قاضی :۔ بس تو آپ ان کے باپ کا نام نہ پوچھئے ورنہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوگا۔

میں :۔ آپ کو معلوم ہے کہ رشید نے ہمارے خاندان پر کتنا زبردست احسان کیا ہے۔

قاضی :۔ معلوم ہے۔

میں :۔ میں انہیں ان کے احسان کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔

قاضی ۔ صلہ دے دیجئے۔ صلہ کو ان کے باپ کا نام دریافت کرنے سے کیا مطلب۔

میں :۔ صلہ دینے سے پہلے یہ معلوم ہو جانا نہایت ضروری ہے کہ وہ کس خاندان سے ہیں۔

قاضی :۔ یہ کیوں۔؟

میں :۔ بات یہ ہے کہ رشید نے زرقا کو یہودی کے چنگل سے بچایا ہے۔ میں زرقا ہی کو ان کے حوالہ کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی :۔ میں سمجھ گیا۔ یہ بات تو میں بتائے دیتا ہوں۔ کہ رشید نہایت شریف خاندان سے ہیں۔ لیکن ان کے والد کا نام نہیں بتا سکتا۔ اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جب بھی یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ کس کے بیٹے ہیں اور کس خاندان سے ہیں، ان کی جان کی خیر نہیں ہے۔ اب یہ تم جانو کہ زرقا سے

ان کی شادی کرو - یا نہ کرو "

میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو انہوں جواب دینے سے انکار کر دیا - میں چلا آیا -

فاطمہ :- عجیب بات ہے - یہ -

شیخ صالح :- نہایت ہی عجیب - ہمیں کچھ روز اور انتظار کرنا چاہیئے - شاید کسی دن خود ہی ان کے خاندان کا حال معلوم ہو جائے -

فاطمہ :- ٹھیک ہے مگر ہمیں رشید کو یہاں سے جانے نہ دینا چاہیئے -

شیخ صالح :- یہی میری رائے ہے -

اب آواز آنی بند ہو گئی - زرقا وہاں سے چلی آئی -

باونواں باب ۵۲

عیسائیوں کی یورش

رشید نے یہ ٹھیک ہی کہا تھا کہ پرتگالی عیسائی مغرب اقصیٰ پر حملہ کی تیاریاں بڑے زور و شور سے کر رہے تھے۔ رشید کو یہ بات قاضی مصباح سے معلوم ہوئی تھی۔ قاضی مصباح پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس تھے) اور اب وہ حاجب (سلطان کے پرائیویٹ سیکرٹری) ہو گئے تھے۔ ان کا حکومت میں بڑا اثر و رسوخ ہو گیا تھا۔ اور معین سلطنت اور وزیر سب ان کا ادب و احترام کرنے لگے تھے۔ سلطان ہر کام ان کے ہی مشورہ سے کرتے تھے۔

پرتگالی عیسائیوں کی نگاہیں ایک عرصہ سے مغرب اقصیٰ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں کی اسلامی حکومت کو مٹا کر مسلمانوں کا خاتمہ کر ڈالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ یورش بھی کی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے انہیں ہر مرتبہ شکست دے کر بھگا دیا تھا۔

مغرب اقصیٰ میں کچھ پرتگالی عیسائی رہتے تھے۔ انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ ابو عبداللہ متوکل علی اللہ اپنے چچا سلطانِ مغرب عبدالملک معتصم سے ناراض ہے۔ انہوں نے اپنے بادشاہ کو اس بات کی اطلاع دی۔

اس وقت پرتگال کا بادشاہ سیباسیتو تھا۔ نہایت چالاک اور بڑا ہوشیار

تھا۔ اس نے اپنے چند معتمد فاس میں بھیجے تاکہ وہ عبداللہ کو بغاوت پر آمادہ کریں۔ اور مسلمانوں میں ایسی پھوٹ ڈلوا دیں جس سے وہ متفق ہو کر عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور عیسائی ابو عبداللہ کی مدد کے بہانے سے مغرب اقصیٰ میں ہو کر اس زرخیز ملک پر قبضہ کر لیں۔

یہ چند عیسائی خاموشی سے مغرب اقصیٰ میں داخل ہو کر شہر فاس میں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے ابو عبداللہ کو ورغلا کر بغاوت پر آمادہ کر لیا تھا۔

ابو عبداللہ کوتاہ اندیش، بدمزاج اور کمزور طبیعت کے انسان تھے وہ عیسائیوں کے بہکانے سکھانے میں آ گئے۔ اور انہوں نے پرتگال کے بادشاہ سیباسیتو سے امداد کی درخواست کی۔ اتفاق سے انہیں ابن مشعل کے قصر سے زرقا کی تصویر بھی ہاتھ آگئی تھی۔ اس نے وہ تصویر بھی سیباسیتو کے پاس بھیج دی اور یہ لکھ دیا کہ یہ نازنین جو اس زمانہ کی بہترین حسینہ ہے۔ میرے سلطان ہونے پر آپ کے حرم میں بھیج دی جائے گی۔

ابو عبداللہ کے ایک مشیر کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ وہ اس سے بدظن تھا۔ اور اس نے ابو عبداللہ کے ارادوں اور حرکتوں سے قاضی مصباح کو مطلع کر دیا۔ قاضی نے سلطان کو سب حالات بتا دیئے۔ اور ایک روز جب رشید ان سے ملنے گئے تو انہوں نے رشید سے بھی یہ حالات بیان کر دیئے۔

رشید کو ابو عبداللہ کی اس نازیبا اور کمینہ حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ مجبور تھے۔ اس لیے چپ ہو رہے۔ انہوں نے زرقا کو یہ تو بتا دیا کہ پرتگالی عیسائی مغرب اقصیٰ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کی تصویر بھی پرتگال بھیج دی گئی ہے۔

چند ہی روز کے بعد پرتگال کے بادشاہ سیباسیتو کے سفیر سلطان عبدالملک کے پاس آئے۔ اور انہوں نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ مغرب اقصیٰ کی حکومت کے حق دار آپ نہیں ہیں۔ آپ کے بھتیجے ابو عبداللہ ہیں۔ آپ تخت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور تخت و تاج ابو عبداللہ کے حوالہ کر دیں۔ اور زرقا کو پرتگال بھیجنے کا انتظام کریں۔

عبدالملک کو ان کی باتیں سخت ناگوار گذریں۔ انہوں نے کہا "ابو عبداللہ

بے عقل اور نا سمجھ انسان ہے۔ اس کا کوئی حق اس سلطنت پر نہیں ہے۔ اگر کسی کا حق ہے بھی تو عبدالرحمٰن کی اولاد کا ہے۔ اور ان کی اولاد کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اگر پرتگال کے عیسائی بادشاہ نے چڑھائی کی تو اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ رہی زہرا، وہ ایک ہاشمی دوشیزہ اور دخترِ اسلام ہے۔ عیسائی بادشاہ اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا۔

سفیر اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ عبدالملک شاہ پرتگال کے مطالبات منظور نہیں کریں گے۔ وہ رسمی طور آئے تھے۔ ان کا مقصد زیادہ تر ابو عبداللہ کو اور پختہ کرنا تھا۔ تاکہ جب پرتگال کا بادشاہ حملہ کرے تو وہ بغاوت کر دیں۔

چنانچہ سفیر ابو عبداللہ کو اچھی طرح پختہ کر کے چلے گئے۔ ابو عبداللہ فاس سے طنجہ بھاگ گئے۔ اور انہوں نے وہاں سلطان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

ادھر پرتگال کے بادشاہ سیباسیتو نے پوپ سے درخواست کی کہ وہ یورپ کے عیسائی بادشاہوں کو اس کی مدد پر آمادہ کر کے امدادی لشکر بھجوائے۔ پوپ مسلمانوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے چنانچہ انہوں نے اعلان جہاد کر دیا۔ اور یہ فتویٰ دے دیا کہ عیسائی مغرب اقصیٰ سے مسلمانوں کو نکالنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں بڑا ثواب ملے گا۔ اور ان کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

صلیبی جہاد کا اعلان ہوتے ہی یورپ سے پرتگال میں عیسائی فوجیں آنے لگیں۔ پرتگال کے بادشاہ نے بھی عظیم الشان لشکر فراہم کرنا شروع کر دیا۔ سلطان عبدالملک کو بھی سیباسیتو کی تیاری کا حال معلوم ہو گیا۔ انہوں نے بھی لشکر کی فراہمی شروع کر دی۔ اعلان جہاد کر دیا۔ مسلمان جوق در جوق آنے اور فوج میں بھرتی ہونے لگے۔

رشید کو بھی اچھی طرح آرام ہو گیا تھا۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ چونکہ وہ ابن مشعل کا معرکہ سر کر چکے تھے اور اس سے ان کی کافی شہرت ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ پانچ سو سپاہیوں پر افسر مقرر کر دیئے گئے۔ انہیں قاضی نے ایک

گھوڑا اور ایک غلام دے دیا تھا۔ اور اب وہ شیخ صالح سے رخصت ہو کر چھاؤنی میں پہنچ گئے تھے۔

پرتگالی عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں میں کافی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا اس کے ساتھ ہی ابو عبداللہ کو بھی مسلمان غدار اور ملک و قوم کا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ اس فکر میں تھے کہ اگر وہ ہاتھ آجائیں تو انہیں قید کر دیں۔

اتفاق سے سلطان عبدالملک کچھ بیمار ہو گئے۔ قاضی مصباح کو سلطان نے اس جنگ کے تمام اختیارات سونپ دیئے۔ انہوں نے چند عیسائی جاسوس پرتگال بھیجے۔ ان جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ایک لاکھ پچیس ہزار عیسائیوں کا لشکر جمع ہو چکا ہے۔ اور یہ عظیم الشان لشکر پرتگال کے بادشاہ سیبا سیتو کی سرکردگی میں عنقریب مغرب اقصیٰ پر حملہ کرنے والا ہے۔

اس وقت تک اسلامی لشکر بیس ہزار ہی جمع ہو سکا تھا۔ اس لشکر میں بربری بھی تھے۔ حبشی بھی اور عربی بھی۔ قاضی مصباح نے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیدیا تھا۔ توپ خانہ طنجہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اب قاضی اس فکر میں تھے کہ سلطان عبدالملک کو آرام ہو گیا تھا۔ کچھ کمزوری باقی تھی کہ دفعۃً خبر آئی کہ عیسائی لشکر طنجہ پر اترا۔ اور اس نے العرائش کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ عیسائی حسب عادت سفاکی اور بربریت پر اتر آئے ہیں۔ زراعت کو پامال، باغات کو تاراج، عمارات کو مسمار اور مسلمان زن و مرد کو قتل و غارت کرتے بڑھے چلے آرہے ہیں۔

سلطان نے کوچ کا اعلان کر دیا۔ فوجیں روانہ ہونے لگیں۔ رشید سلطان کے ساتھ جانے والے تھے جس روز انہیں جانا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے وہ شیخ صالح اور فاطمہ سے رخصت ہونے کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ سب سے پہلے انہیں فاطمہ ملیں۔ انہوں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی۔ رشید نے بتایا کہ وہ سلطان کے ساتھ جانے والے ہیں۔ فاطمہ نے ان کی سلامتی کی دعا مانگی۔ شیخ صالح نہیں مل سکے۔ کہیں گئے ہوئے تھے۔

رشید فاطمہ سے رخصت ہو کر چلے۔ جب وہ سعید کے کمرہ کے قریب

سے گزر رہے تھے تو زرقا نے کہا "آپ جا رہے ہیں۔

وہ لوٹے اور اس کے پاس پہنچکر بولے "ہاں میں جا رہا ہوں۔ بھائی سعید کل روانہ ہو چکے ہیں۔ میں انشاء اللہ کل روانہ ہو جاؤں گا"

زرقا:۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔

رشید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ایک فتنہ تو تمہاری وجہ سے اٹھا ہی تھا اب یہ دوسرا فتنہ بھی تمہاری ہی وجہ سے اُٹھا ہے۔ تمہاری تصویر سیبا سیتو کے پاس پہنچ گئی ہے۔

زرقا:۔ مجھے معلوم ہے کم بخت ابن مشعل نے میری تصویر کھینچوا کر مجھے بدنام کر دیا۔

رشید نے مسکرا کر کہا "بدنام کر دیا یا مشہور کر دیا۔

زرقا نے تیکھی چتون سے کہا "مشہور کر دیا۔ ہ یا دنیا میں منہ دکھانے کا جگہ نہ رکھی"

رشید:۔ حالانکہ دنیا، منہ دیکھنے کی آرزو مند ہے۔

زرقا نے رشید کو دیکھ کر کہا "خیر سے طبیعت میں شرارت آگئی ہے"

رشید نے اس کے حسین چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا "شوخی اور شرارت تو تم جیسی حسین لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ مجھ جیسے سیدھے مسلمان میں کہاں سے آئی۔

زرقا:۔ سیدھے مسلمان ——— گویا مرد ہی سیدھے مسلمان ہوتے ہیں۔

رشید۔ دنیا اس بات کو جانتی ہے کہ مرد کو عورت سمجھ لیتی ہے اور عورت کو مرد سمجھ نہیں سکتا۔

زرقا نے مسکرا کر کہا "اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد سے عورت زیادہ عقلمند ہوتی ہے"

رشید:۔ نہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرد سیدھا ہوتا ہے اور عورت

زرقا نے قطع کلام کر کے کہا "چالاک ہوتی ہے"

رشید:۔ چالاک تو نہیں البتہ اتنی ہوشیار ہوتی ہے کہ مرد کا راز اگلوا لیتی ہے۔ اور اپنا راز چھپا لیتی ہے۔

زرقا :- یہ بھی عورت کی دانش مندی کی دلیل ہے۔ حالانکہ مرد کہتے ہیں، کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں

رشید :- میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عورتیں بہت ہی ہلکی پھلکی ہوتی ہیں۔ بالکل گلاب کا پھول۔ دیکھنے میں خوش نما۔ سونگھنے میں خوشبودار اور چھونے میں نرم۔

زرقا۔ شاعر ہو نہ۔ شاعر تو عورت کو پیکرِ حسن و ناز، حور شمائل اور خدا جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔

رشید :- شاعر عورت کو خدا کی بہترین صنعت اور قدرت کا بہترین عطیہ سمجھتا ہے۔

اس وقت شیخ صالح آگئے۔ زرقا پیچھے ہٹ گئی۔ رشید شیخ صالح سے مل کر اور ان سے رخصت ہو کر چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ترپن واں باب ۵۳

ترقی

سلطان عبدالملک پانچویں جمادی اول ۹۸۶ھ کو عیسائیوں کے مقابلہ میں جانے کے لیے شاہی محل سے برآمد ہوئے۔ تمام معززین شہر اکابر قوم، علمائے کرام ارکین سلطنت، وزراء اور کچھ فوجی افسران ان کے انتظار میں تھے۔ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ سلطان جامع قیروتین میں فتح کی دعا مانگ کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوں گے۔ شاہی سواری کا جلوس جامع قیروتین کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان عبدالملک گھوڑے پر سوار تھے۔ وہ اب بھی کافی کمزور تھے۔ ان میں میدانِ جنگ میں جانے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن ان کے دل میں اسلامی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں پرتگالی عیسائیوں پر اس لیے غصہ تھا کہ انہوں نے بلاوجہ مغرب اقصیٰ پر لشکر کشی کی تھی۔ اور اس سرزمین سے مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

جب شاہی سواری جامع قیروتین میں پہنچی تو وہاں بے شمار مسلمانوں نے ان کا استقبال کیا۔ رشید بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ انہیں جامع قیروتین کے طالب علموں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سلطان نے دیکھا۔ وہ وزیروں اور امیروں کے جھرمٹ میں داخل ہوتے۔ تمام مسلمان پیچھے پیچھے چلے۔ سلطان اور سب مسلمان بیٹھ گئے۔ اور سب نے نہایت خلوص سے فتح کی دعا مانگی۔ دعا مانگ

کر سلطان مسجد سے باہر آئے۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ سلطان چلے تمام مسلمان ان کے جلو میں چلے۔ شہر سے باہر آئے۔ یہاں پانچ ہزار سوار نہایت عمدہ وردیاں پہنے۔ بندوقوں، خنجروں اور تلواروں سے مسلح کھڑے تھے۔ انہوں نے سلطان کو سلامی دی۔ سلطان نے سلامی لی۔ اور لشکر کے درمیان میں پہنچ گئے۔ قاضی مصباح اور رشید سلطانی رسالہ میں شامل ہو گئے۔

اب لشکر روانہ ہوا۔ جو مسلمان اس لشکر کو رخصت کرنے آئے تھے۔ انہوں نے نعرے لگائے۔ اور ایک مرتبہ اور فتح کی دعا مانگی اور واپس چلے گئے اور لشکر طنجہ کی طرف بڑھا۔

باوجودیکہ سلطان عبد الملک کمزور تھے۔ اس سے ان کی صحت اور خراب ہوتی جاتی تھی۔ مگر وہ شوق جہاد میں اس کی پرواہ نہیں کر رہے تھے۔

یہ عجیب بات تھی۔ کہ یہ وہی سلطان عبد الملک تھے جو ابن مشعل سے دبتے تھے اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی داد فریاد نہ سنتے تھے جو اس بات کیلئے بھی تیار ہو گئے تھے۔

کہ ایک دختر اسلام اور ہاشمی دوشیزہ کو ابن مشعل کے حرم میں پہنچوا دیں۔ اس وقت ان کی قومی حمیت جوش میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اب انہیں اس بات پر طرارہ آگیا تھا کہ پرتگال کے بادشاہ شیبا سیتو نے زرقا کی خواستگاری کی تھی۔ انہیں اس کی یہ بات ناگوار گذری تھی۔ اور اس بات کو قومی توہین سمجھا تھا۔

سلطان نے چند ہی منزل سفر طے کیا تھا کہ انہیں کئی اسلامی قافلے المعرائش سے آتے ہوئے ملے۔ اس قافلہ میں مرد بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ وہ عیسائیوں کے خوف سے ترک وطن کر کے چلے آرہے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ عیسائیوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم شروع کر دیتے ہیں۔ اسلامی بستیوں کو تاراج اور برباد کرتے چلے آرہے ہیں۔ زراعت کو پامال کر دیتے ہیں۔ باغوں کو کاٹ ڈالتے ہیں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیتے۔ گھروں کو لوٹ کر ان میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اور مسجدوں کو جلا ڈالتے ہیں۔

ان قافلہ والوں نے یہ بھی بتایا کہ عیسائی لشکر العرائش ہی میں عیسائیوں کو روک دینا چاہتے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ تھا اور عیسائی لشکر طوفان کی تیزی کے ساتھ بڑھا چلا آرہا تھا۔ اس لیے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

ایک روز ایک مقام پر لشکر نے قیام کیا۔ اس وقت سلطان کے ساتھ تمام لشکر ہو گیا تھا۔ یعنی وہ بھی جو سلطان سے پہلے روانہ ہوا تھا اور وہ بھی جو سلطان کے ساتھ آیا تھا۔ اس سب لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی۔ پہلے ہی لشکر کے ساتھ توپخانہ بھی تھا۔ یہ لشکر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

سلطان کو یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ پرتگال کے بادشاہ سیباسیتو کے ساتھ ابو عبداللہ بھی ہے۔ انہیں اس بات کا بڑا ملال تھا کہ ابو عبداللہ مسلمانوں پر مظالم ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر عیسائیوں کے ساتھ ہے۔ اس کی رگِ حمیت جوش میں نہیں آتی۔ وہ ان سے الگ کیوں نہیں ہو جاتا۔

تمام سلطانی لشکر کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ ابو عبداللہ، سیباسیتو کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوتے دیکھا ہے۔ اور چپ ہے۔ عام طور پر سپاہیوں کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ حقیقت میں اس نے قابلِ نفرت کام بھی کیا تھا۔ اسی کے سہارا دینے پر پرتگال کے بادشاہ کو مغرب اقصیٰ پر لشکر کشی کی جرأت ہوئی تھی اور عیسائی لشکر اسلامی بستیوں میں جو تباہی اور بربادی پھیلاتا چلا آرہا تھا۔ اس کی ذمہ داری ابو عبداللہ پر تھی۔

جب اسلامی لشکر مقیم ہو گیا۔ خیمہ و خرگاہ نصب ہو گئے۔ سائبان کھڑے کر دیئے گئے۔ تو سلطان ایک خوش نما سائبان کے سایہ میں آ بیٹھے۔ قاضی مصباح اور کئی بڑے بڑے فوجی افسر بھی سلطان کے سامنے ادب سے بیٹھ گئے۔ سلطان نے قاضی سے مخاطب ہو کر کہا۔" رشید آپ کے ساتھ نہیں آئے۔ وہ کہاں ہیں ؟

قاضی نے عرض کیا۔" اعلیٰ حضرت، وہ اپنے دستہ میں ہوں گے۔"

سلطان۔ نہ معلوم کیوں ہمیں اس نوجوان کی ذات سے ہمدردی اور محبت ہوتی جاتی ہے۔

قاضی:۔ رشید، نہایت بہادر۔ نڈر اور سلطان کا بڑا ہمدرد اور وفادار

ہے۔ اسے یہ افسوس ہے کہ عالم پناہ کی کمزوری ابھی دُور نہیں ہوئی تھی کہ اس مہم پر آنا پڑا۔ اسے خوف رہتا ہے کہ کہیں خدانخواستہ سفر کی کلفت سے مرض پھر عود نہ کر آئے۔ وہ پروردگار عالم سے سلطان کی صحت کی دعا مانگا کرتا ہے۔

سلطان۔ اسے بلوا لیجئے۔ ہمیں خیال ہوتا ہے کہ ہم نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

قاضی:۔ ایک دم چونک پڑے انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں سلطان اسے پہچاننے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے سلطان کو مغالطہ میں ڈالنے کیلئے کہا "رشید جامع قیروان میں تعلیم پا رہا ہے۔ ممکن ہے کسی موقع پر اعلیٰحضرت نے اسے دیکھا ہو"

سلطان:۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اس کے اطوار نہایت شائستہ ہیں ہمیں وہ بہت پسند ہے۔ ہم آج سے اسے رسالہ خاص کا افسر مقرر کرتے ہیں۔

قاضی اس سے اس کی بڑی عزت افزائی ہوگی۔ میں اسے ابھی بلا کر یہ خوشخبری سناتا ہوں۔

چنانچہ قاضی نے ایک غلام کو اشارہ کیا وہ گیا اور رشید کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ رشید نے بڑے ادب سے سلطان کو سلام کیا۔ قاضی نے رشید سے کہا۔ "اعلیٰحضرت نے تمہیں رسالہ خاص افسر مقرر کیا ہے"

رشید نے سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ سلطان نے اسی وقت انہیں خلعت عطا فرمایا۔ رشید کو اس بات سے بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ انہیں اعلیٰ عہدہ مل گیا۔۔۔

اسی وقت شاہی غلام نے اطلاع دی کہ ابو عبداللہ کے قاصد آئے ہیں سلطان نے انہیں حاضری کی اجازت دی، دو آدمی جو اچھے لباس پہنے ہوئے تھے۔ آئے انہوں نے سلطان کو سلام کیا اور عرض کیا "ابو عبداللہ چاہتے ہیں کہ اگر سلطان وزان تک کا علاقہ پرتگال کے بادشاہ کو دیدیں۔ تو صلح کی کوشش کی جائے۔

سلطان نے کہا اس سے کہہ دینا کہ ہماری زندگی میں مغرب اقصیٰ کی

ایک انچ زمین بھی عیسائی بادشاہ کو نہیں دی جا سکتی۔"

ابھی سلطان کی بات ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ دونوں قاصدوں نے تلواریں سونت لیں اور سلطان کی طرف بڑھے۔ رشید بجلی کی طرح اُٹھے اور انہوں نے جلدی سے تلواریں کھینچ کر ایک قاصد کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اس کا سر اڑ گیا۔

اس عرصہ میں دوسرا شخص سلطان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے تلوار بلند کی، رشید نے جھپٹ کر اس کے سر پر وار کیا۔ اس کے سر کی پھانکیں کھل گئیں۔ اور وہ پتورا کر گرا۔

یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا۔ اور افسر بیٹھے دیکھتے ہی رہ گئے۔ سلطان نے اُٹھ کر رشید کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور کہا" بہادر نوجوان آج تمہاری دلیری نے تمہارے سلطان کی جان بچا لی۔ ہم تمہارے بہت شکر گذار ہیں۔"

رشید نے عرض کیا" عالم پناہ! اس جان نثار خادم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

اس روز سے رشید سلطان عبدالملک کے خاص طور پر مہمان ہو گئے۔

چوّن واں باب ۵۴

رشید کی جرأت

اسلامی لشکر تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس لشکر کا ہر سپاہی اور سلطان عبدالملک عیسائیوں سے جنگ کرنے کے لیے بیتاب تھے، سلطانی جاسوس عیسائیوں کی خبریں روزانہ لارہے تھے، سلطان کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ عیسائی العرائش تک بڑھ آئے ہیں۔ اور جن بستیوں میں سے وہ ہو کر گذرے ہیں۔ انہیں بالکل برباد کر ڈالا ہے۔

ان خبروں کے سننے سے سلطان کو بڑا رنج ہوتا تھا، اور وہ اپنے آرام اور اپنی صحت کا خیال نہ کر کے اور بھی تیزی سے سفر کر رہے تھے۔ کچھ تو سفر کی کلفت سے اور کچھ اسلامی بستیوں کی بربادی کے ملال سے سلطان کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ کمزور تو وہ تھے ہی مرض نے پھر غلبہ کر لیا۔ اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر چلنے کی طاقت نہ رہی۔ تخت رواں پر سوار ہو کر چلنے لگے۔

اسلامی لشکر جب نہر الکبیر کے قریب پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ عیسائی بھی قریب آ گئے۔ سلطان نے رشید کو بلا کر حکم دیا کہ کچھ سپاہ لے کر وادی مخازن میں پہنچ جائیں۔ اور جب عیسائی لشکر پل کو پار کر آتے تو پل کو اڑا دیں۔ رشید دو ہزار جانباز مجاہدوں کو لیکر چلے۔ جس جگہ اسلامی لشکر فروکش تھا۔ اس

سے چند میل کے فاصلہ پر مزازن کی وادی تھی، اس وادی میں دریا کے کنارہ کنارہ قدآدم سے بھی اونچی اونچی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ ابھی تک عیسائی لشکر وہاں نہیں پہنچا تھا۔ رشید پہلے پہنچ گئے۔ انہوں نے تمام لشکر کو جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ اور چند افسروں کے ساتھ پل پر پہنچکر اس کا معائنہ کیا۔ پل خاصا مضبوط تھا۔ رشید نے افسروں سے توپیں نصب کرنے کا مشورہ کیا۔ افسروں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے دی، لیکن رشید ان کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ توپیں ایسی جگہ نصب کی جائیں جہاں سے گولہ باری کرنے پر درمیان سے پل کے ٹکڑے اڑ جائیں اور اس پر سے انسانوں حیوانوں اور ہر چیز کا گذرنا ناممکن ہو جائے۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس وقت پل پر گولہ باری کی جائے اسی وقت عیسائی لشکر پر توپیں داغی جائیں۔ تاکہ عیسائی گھبرا جائیں اور ان کی بدحواسی کی حالت میں اگر ممکن ہو سکے تو توپیں اور لشکر کو لیکر خاموشی سے وادی سے نکلکر اسلامی لشکر میں پہنچ جائیں۔

رشید نے چند توپچیوں کو بھی بلایا۔ اور ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ایک جگہ پسند کی رشید نے خود بھی وہی جگہ مناسب سمجھی تھی۔ یہ جگہ دریا کے کنارے سے چند پر ایک ٹیلہ پر تھی۔ اور اس ٹیلہ پر اور ٹیلہ کے چاروں طرف گنجان جھاڑیاں کھڑی تھیں۔

رشید نے سپاہیوں کو اس ٹیلہ پر توپیں چڑھانے کا حکم دیا۔ چونکہ اسلامی جاسوس عیسائیوں کے قریب آجانے کی خبریں لا چکے تھے۔ اس لیے رشید چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے۔ توپیں ٹیلہ پر چڑھا کر نصب کر دی جائیں۔

مجاہدین اسلام نے بڑی محنت اور جانفشانی سے چار توپیں ٹیلہ پر چڑھا دیں۔ اور حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ انہیں نصب کر دیا۔ توپوں کی نالیوں کے سامنے سے جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر صفائی کر دی، لیکن شاخیں اس طرح کاٹیں کہ قریب سے دیکھنے پر بھی نالیں نظر نہ آئیں۔ ان میں سے دو توپوں کے رُخ پل کی طرف اور دو توپوں کی نالیں دوسری طرف اس طرح رکھی گئیں کہ جب پل پر

گولہ باری ہو۔ تو اسی وقت پل سے پار ہو جانے والے علیسائیوں پر بھی گولے برساتے جا سکیں۔

جوں ہی توپیں نصب ہو چکیں اور گولہ بارود وہاں لاکر جمع کیا گیا اسی وقت دور فاصلہ پر علیسائی فوجیں آتی ہوئی نظر آ رہیں۔ بے شمار علم لہرا رہے تھے۔ توپخانہ آگے تھا۔ اس کے پیچھے پیدل تھے۔ اور پیدلوں کے پیچھے سوار تھے۔

رشید ٹیلہ پر موجود تھے، ان کا خیال تھا کہ لشکر اسی روز پل کو عبور کریگا۔ لیکن کنارہ پہ پہنچکر رک گئے۔ اور انہوں نے وہیں قیام کر دیا۔

مسلمان جھاڑیوں کے پیچھے ہی چھپے رہے۔ انہوں نے اس روز کھانا تیار نہیں کیا۔ اگر وہ کھانا تیار کرتے۔ تو آگ اور دھوئیں سے علیسائیوں کو ان کی موجودگی کا علم ہو جاتا۔ وہ ستو کے بھی کچھ بولے اپنے ساتھ لائے تھے یتمام مجاہدین نے ستو گھول کر پی لیا۔ اور رات جھاڑیوں ہی میں گزار دی۔

صبح کو تھوڑے تھوڑے مسلمانوں نے نماز پڑھی اور پھر جلدی سے جھاڑیوں کے پیچھے جا چھپے۔ رشید چند افسروں، توپچیوں اور سپاہیوں کے ساتھ ٹیلہ پر پہنچ گئے۔

کچھ دن چڑھے علیسائی لشکر میں نقل و حرکت شروع ہوئی۔ سب سے پہلے توپخانہ چلا۔ اور پل عبور کرنے لگا۔ بعض افسروں نے رشید سے عرض کی کہ اس وقت پل اڑا دیا جائے۔ تو پخانہ دریا بُرد ہو جائے گا۔ اور علیسائی لشکر پل کے اس طرف ہی رہ جائے گا۔

رشید نے کہا "اس سے سلطان کا وہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ تمام علیسائی لشکر پل کے اس پار آ جانا چاہیئے اور پھر پل اڑا دینا چاہیئے تاکہ علیسائی لشکر واپس نہ جا سکے، اور سب کا سب کھیت رہے" رشید نے یہ ٹھیک ہی کہا تھا۔ سلطان کا یہی مقصد تھا، حیرت ہے۔ سلطان اور ان مسلمان مجاہدین کی دلیری اور جرأت پر جو بیس ہزار ہوتے ہوئے ایک لاکھ پچیس ہزار دشمنوں کے مقابلہ کے لیے آ گئے تھے۔ اور سب سے زیادہ ان دو ہزار مسلمانوں کی ہمت اور بہادری قابل داد ہے جو اس عظیم الشان علیسائی

لشکر کے سامنے پل اڑانے کے لیے آتے تھے۔

توپ خانہ پل کو پار کر گیا۔ اس کے پیچھے خیمے رسد اور سامانِ جنگ کی گاڑیاں پیدلوں کے ساتھ چلیں۔ یہ سامان اور پیدل بھی پار اتر گئے۔ ان کے بعد شاہی سواری دس ہزار آہن پوش سواروں کے جھرمٹ میں بڑھی۔ سیبا سیتو اعلیٰ قسم کے گھوڑے پر سوار فاخرہ ریشمی لباس پہنے اور سونے کا تاج سر پر رکھے ایک زردوزی سائبان کے نیچے آ رہا تھا۔ وہ اور اس کا رسالہ بھی پل پار کر گئے۔

دوپہر کے بعد سے سواروں کے دستے آنے اور پل پار کرنے لگے۔ عصر کے وقت کافی تعداد میں سوار بھی پل پار کر آئے۔ مگر ابھی کئی ہزار سوار دوسری طرف باقی رہ گئے تھے۔ اور پل سواروں کے برابر آتے رہنے کی وجہ سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ رشید نے کہا "بس یہ موقع گولہ باری کرنے کا ہے ادھر گولہ باری سے عیسائی گھبرا جائیں گے۔ ادھر دن چھپ جائے گا۔ وہ وقت ہمارے نکل جانے کے لیے مناسب ہوگا"

تمام افسروں نے ان کی رائے کی تائید کی۔ توپچیوں نے جلدی جلدی گولے اور بارود توپوں میں بھر کر فلیتے دکھائے۔ ایک دم چاروں توپیں ہولناک گرج کے ساتھ چلیں۔ دو توپوں کے گولے پل کے بیچ کی محراب پر پڑے انہوں نے دُور تک درازیں ڈال دیں۔ تمام پل لرز گیا اور پل کا کچھ ملبہ دریا میں گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے سوار بھی دریا میں گرے۔

ادھر جو سوار پل عبور کر کے کچھ فاصلے پر پہنچ گئے تھے۔ اِن کے قریب جا کر گولے پھٹے۔ سواروں اور گھوڑوں کے پرخچے اڑ گئے۔

توپچیوں نے بڑی پھرتی سے پھر گولے ڈالے بارود بھری اور فلیتے دکھائے پھر توپیں گرجیں۔ اور گولے نکلے اس مرتبہ پل کی دو محرابیں اڑ کر دریا میں جا پڑیں۔ پھر ملبہ کے ساتھ بہت سے سوار دریا برد ہو گئے۔ پل کے ٹکڑے ہو گئے اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ کوئی چیز بھی اس پر سے گذر سکے۔

دوسری طرف پھر بہت سے سوار اور گھوڑے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر

اُڑ گئے۔ عیسائی ان پیہم توپوں نے نااروں سے گھبرا گئے۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے
اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جھٹپٹا ہو گیا تھا۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ کس طرف سے فیر ہو رہے
ہیں۔ چونکہ پل اڑ گیا تھا۔ اور سلطان نے پل اڑانے ہی کے لیے رشید کو بھیجا تھا۔
اس لیے انہوں نے اور فیر نہیں کرائے، مسلمانوں نے مغرب کی نماز پڑھی توپیں
اکھاڑیں اور نہایت خاموشی سے توپیں لے کر وہاں سے چلے اور بخیر اسلامی
لشکر میں آپہنچ گئے۔

پچپن واں باب ۵۵

رشید کا راز

رشید کو جب سلطان نے پل اڑانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت ان کی طبیعت اچھی تھی۔ مگر اُسی روز شام کے وقت ان کی طبیعت دفعتاً بگڑ گئی شاہی طبیب جو ساتھ تھے، انہوں نے دوا دستی کی، مغرب کی نماز کے بعد کچھ طبیعت سنبھلی۔ سلطان نے قاضی مصباح کو طلب کیا۔

قاضی نہایت نیک اور بڑے بزرگ آدمی تھے۔ جب سے سلطان کی طبیعت خراب ہوئی تھی، وہ اسی وقت سے اِن کی صحت کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ سلطان کے حضور میں پہنچے۔ انہیں سلطان عبدالملک نے اپنے قریب بٹھا لیا۔ قاضی مصباح کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا سلطان بہت زیادہ کمزور ہو چکے ہیں۔ انہیں خوف ہوا کہ کہیں ان کا وقت تو قریب نہیں آگیا ہے۔

سلطان نے نحیف آواز میں کہا "ہمارے معتمد صاحب، اب ہم وہاں جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔"

قاضی نے عرض کیا "عالی جاہ، نا امید نہ ہو جیئے۔ بندگانِ عالی اعلیٰحضرت کی صحت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ خدا عالم پناہ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے گا۔"

سلطان :۔ دل کے بہلانے کے لیے یہ خیال اچھا ہے۔ کل تک ہمیں بھی یہ اُمید تھی کہ ہم اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن آج یہ اُمید ٹوٹ گئی۔ ہماری حالت

بگڑ گئی ہے اور ہم اس مہمان سرائے دنیا میں چند پہروں کے مہمان رہ گئے ہیں،

قاضی :- خدا نہ کرے کہ ہم اپنے عادل اور نیک سلطان کے سایہ سے محروم ہو جائیں ۔

سلطان :- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " کل نفس ذائقۃ الموت " یعنی " ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے " اور ہماری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ تم ہمارے بہت زیادہ ہمدرد اور وفادار ہو ہمیں یہ فخر ہے کہ تم جیسا مخلص اور وفادار ہمدرد ہمیں ملا۔ آج ہم تمہیں اپنے کچھ حالات سناتے ہیں۔

قاضی مصباح سر جھکائے بیٹھے تھے، سلطان نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ تم نے ہمیں عادل اور نیک کہا۔ افسوس یہ ہے کہ ہم ایسے نہیں ہیں آج ہمیں اپنے گناہ اور اپنے بُرے اعمال ایک ایک کر کے یاد آرہے ہیں ۔ ہم نے عدل نہیں کیا۔ بڑی ناانصافی کی بلکہ سچ پوچھو تو ظلم کیا۔ اس کا کچھ خمیازہ تو ہم نے دنیا ہی میں بھگت لیا۔ معلوم نہیں آخرت میں کیا سزا ملے گی۔

سلطان کہہ رہے تھے۔ اور قاضی مصباح سن رہے تھے، سلطان نے کچھ دیر ٹھہر کر کہا " ہمارا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ہم نے غاصبانہ فاس کے تخت و حکومت پر قبضہ کیا۔ جب پدر بزرگوار سلطان مغرب نے وفات پائی۔ تو بڑے بھائی عبدالرحمٰن فاس سے بہت دور مراکو میں تھے۔ ہم فاس میں تھے۔ ہم نے فوراً ہی تخت نشین ہو کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ عبدالرحمٰن اس خوف سے کہ کہیں ہم انہیں گرفتار کرا کر قتل نہ کرا دیں، روپوش ہو گئے۔ ہمیں عرصہ تک خوف رہا کہ کہیں وہ ظاہر ہو کر بغاوت نہ کر دیں۔ لیکن وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ پھر بھی ہمیں اطمینان سے سلطنت کرنی نصیب نہیں ہوئی بدقسمتی سے ہم نے اپنے اخراجات بڑھالئے آمدنی کم اور اخراجات زیادہ بغیر عرصہ کے کیسے کام چلتا۔ ابن مشعل سے قرضہ لیا۔ اور یہ قرضہ بڑھتا ہی گیا۔ اس قرضہ کے صلہ میں ابن مشعل کو ایسی مراعات دینی پڑیں۔ جو ملک و قوم کے مفاد کے خلاف تھیں، ان مراعات کی وجہ سے اس نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کے مقروض تھے، اس لیے دم بخود تھے۔ اس عرصہ میں ہمارے چھوٹے بھائی کا بیٹا ابو عبداللہ جوان ہو گیا۔ اور اس کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ بغاوت نہ کر دے۔

ابن مشعل کیوجہ سے تمام ملک مغربِ اقصیٰ میں یہودیوں کا زور ہوگیا۔ اور ان یہودیوں سے یہ خوف رہنے لگا کہ کہیں وہ ابو عبداللہ کو نہ ابھاریں۔ اس لیے تمام یہودیوں کا لحاظ کرنا اور ان سے دبنا پڑتا تھا۔

غرض سلطنت حاصل کرکے ہم ایک مستقل فکر اور عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہ تفکرات تو تھے، ہی کہ اولاد کا غم ہونے لگا۔ ہمارے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، ایک ایک کرکے یہ تینوں مر گئے۔ ہمارے دل پر یہ بات نقش ہوگئی کہ ہم نے جو بڑے بھائی کا حق غصب کیا ہے۔ اس کی یہ سزا ملی ہے۔ اب ہم لاولد ہیں۔ اور مرض الموت میں گرفتار ہیں۔

ہمیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ عبدالرحمٰن مر گئے ہیں۔ اور انہوں نے ایک بیٹا چھوڑا ہے۔ کاش ہماری زندگی میں ان کا وہ بیٹا مل جاتا اور ہم یہ سلطنت جو اس کا ہی حق ہے۔ اس کے حوالہ کرکے اطمینان سے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتے۔

قاضی :۔ اگر عبدالرحمٰن کا بیٹا مل جاتے۔ اور جہاں پناہ کو آرام ہو جاتے۔ تب ظل اللہ کیا کریں گے۔؟

سلطان :۔ اگر ہماری عمر اور نکل آئے۔ اور خدا ہمیں صحت دے دے تو ہم بقیہ عمر گوشہ نشین ہوکر اللہ کی یاد میں گزار دیں گے۔ لیکن اسوقت ہماری سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہمیں ہمارا بھتیجا مل جائے۔

قاضی :۔ جہاں پناہ! خدا کا شکر ادا کیجئے کہ ظل اللہ کا بھتیجا ظل اللہ کے سایہ عاطفت میں موجود ہے۔

سلطان کو یہ سنکر بڑی حیرت ہوئی، انہوں نے قاضی کی طرف دیکھ کر کہا "ہمارا بھتیجا ہمارے ظلِ عاطفت میں موجود ہے۔؟"

قاضی :۔ جی ہاں۔ عالی جاہ۔

سلطان : کہاں ہے وہ۔

قاضی :۔ اعلیٰحضرت کے حکم سے وادیٔ مخازن کا پل اڑانے گیا ہے۔

سلطان :۔ کیا رشید ہمارا بھتیجا ہے۔؟

قاضی۔ جی ہاں۔

سلطان :۔ اوہ خدا! تیرا شکر ہے۔ ہزار ہزار شکر ہے۔ کیا رشید کو

معلوم ہے کہ وہ کون ہے۔؟

قاضی :۔ جی ہاں معلوم ہے۔ جب اسے وحشی نے زخمی کر دیا تھا۔ اور میں اس کا بیان لینے گیا تھا۔ تب اس نے مجھے اپنے باپ کا نام میرے کان بتایا تھا۔

سلطان :۔ رشید بڑا ہونہار اور شریف طبیعت ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ جب وہ آئے فوراً ہماری طرف سے پیش کرنا۔

دوسرے روز سلطان نے رشید کی خبر لانے کے لیے چند افسروں کو بھیجا یہ افسر بھی رشید کے پاس ہی رہ گئے۔ اور جب وہ پل اڑا کر واپس آئے تب قاضی مصباح رشید سے ملے اور انہیں ساتھ لے کر سیدھے سلطان کے حضور میں گئے۔ رشید نے سلطان کو بڑے آداب سے سلام کیا۔ سلطان نے دعا دے کر کہا۔" رشید تم آ گئے "

رشید نے عرض کیا۔ جی ہاں اعلیحضرت ظل اللہ کے حکم کی تعمیل کر آیا۔ پل بھی اڑا یا۔ اور کئی سو عیسائیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

سلطان ۔ مرحبا، صد مرحبا۔ یہ بتاؤ رشید تم جانتے ہو کہ ہمارے تم کون ہوتے ہو۔

رشید گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا۔ میں اعلیحضرت کا خادم ہوں "

سلطان مسکرائے انہوں نے کہا" بیٹا گھبراؤ مت ہمیں تم سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، صاف بتاؤ"

رشید :۔ اعلیٰ حضرت اس غلام کے عم بزرگوار ہیں۔

سلطان :۔ جب تم یہ جانتے تھے۔ تو ہم سے کیوں نہیں ملے۔

رشید :۔ یہ شرم دامن گیر ہوئی۔ کہ کس طرح اپنا تعارف کرا سکوں گا۔

سلطان :۔ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا نہیں ہوا کہ ہم غاصب ہیں۔ بغاوت کر کے ہم سے سلطنت چھین لو۔

رشید :۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ سلطنت میرے ایک شفیق بزرگ کے پاس ہے۔ میں ایک ناتجربہ کار نوجوان ہوں۔ اور آپ پختہ کار۔ اور مدبر ہیں اگر میں بغاوت کروں گا۔ تو سلطنت کمزور ہو جائے گی۔ میں نے گمنام رہنا اور گمنامی میں

مرجانا قبول کیا۔ مگر یہ گوارا نہ کیا۔ کہ اپنے دماغ میں بغاوت کا خیال بھی آنے دوں۔

سلطان :۔ تمہاری والدہ زندہ ہیں۔

رشید :۔ جی ہاں۔ انہوں نے ہدایت کر دی تھی کہ چچا سے ہرگز بغاوت نہ کرنا۔ نہ میری زندگی میں اور نہ میرے مرنے کے بعد تمہارے چچا، تم سے ہر طرح افضل اور بہتر ہیں۔

"شریف عورت" سلطان نے کہا۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بزرگانہ محبّت بھڑک اٹھی۔ انہوں نے اپنی آغوش کشادہ کر کے کہا "میرے عزیز آؤ اور اپنے اس ناہنجار چچا کے سینہ سے لگ جاؤ۔ جو تمہارے حق کو غصب کیے بیٹھا تھا۔ رشید جھک کر ان کی آغوش میں پہنچ گئے۔ سلطان نے انہیں خوب پیار کر کے کہا "ایک ابو عبداللہ ہے جو دشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے ایک تم ہو کہ اپنے ظالم چچا سے شرمسار رہے۔ کتنی شرافت ہے۔ تمہاری طبیعت میں ــــ بیٹا اپنے چچا کو معاف کر دو"

رشید نے عرض کیا "کیا فرما رہے ہیں اعلیٰ حضرت"

سلطان :۔ میرے دل کو اسوقت اطمینان ہو گا۔ جب تم معاف کر دو گے

رشید : میں نے معاف کیا۔

سلطان :۔ اگر ہم زندہ رہے۔ تو تمہاری شریف ماں سے معافی مانگیں گے۔ اور اگر خدا کی مرضی پوری ہوئی تو ہماری طرف سے تم ان سے معافی مانگنا۔

رشید :۔ اللہ تعالیٰ، ظل اللہ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

سلطان نے قاضی مصباح سے کہا "تمام فوجی افسروں، مشیروں اور معزز لوگوں کو حاضر کرو" قاضی مصباح گئے اور تھوڑی دیر میں سب لوگ آ گئے۔ سلطان نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "اے سلطنت مغرب اقصیٰ کے بہی خواہوں، آج ہم تمہارے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں کہ رشید ہمارے بھتیجے ہیں۔ یہ سلطان عبدالرحمٰن کے بیٹے ہیں"

یہ بات سُنکر تمام لوگوں کو تعجب ہوا، سلطان نے دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا۔ "تم حیران ہو رہے ہو۔؟ حیران ہونے کی بات ہی ہے۔ اس بات کو قاضی مصباح جانتے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا۔ یہ سلطنت ان کا ہی ورثہ ہے۔ ہم نے انہیں ولی عہد مقرر کیا۔ تم ان کے ہاتھ پر ولی عہدی کے لیے بیعت کرو"

چونکہ رشید سے زیادہ تر لوگ واقف تھے، وہ انہیں شریف اور نیک سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے ولی عہد مقرر کیے جانے پر بہت خوش ہوئے اور سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

چھپن واں باب ۵۶

آغازِ جنگ

صبح کی نماز پڑھ کر رشید سلطان کے خیمہ میں گئے۔ وہ اس روز اٹھ نہیں سکے۔ لیٹ کر نماز ادا کی۔ رشید کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے" بیٹا تم سے ملنے کی ہمیں رات بھر خوشی رہی۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ہم نے حق دار کو اس کا حق سونپ دیا۔ اب تم مالک و مختار ہو۔"

رشید:۔ خدا ظل اللہ کا سایہ میرے سر پر قائم رکھے۔ میں پہلے بھی ایک وفادار غلام تھا۔ اور اب بھی ہوں۔

اس وقت قاضی مصباح آئے۔ انہوں نے کہا" معلوم ہوا ہے۔ عیسائی لشکر میں نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ ان کا توپخانہ بڑھا چلا آرہا ہے۔"

سلطان:۔ عیسائی لشکر کو اپنی کثرت پر ناز ہے۔ وہ اسلامی لشکر سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ تم اور رشید جا کر مورچہ بندی کرو۔

رشید نے عرض کیا" اعلیحضرت کی طبع مقدس کچھ خراب ہے۔ اس لیے آرام دیں، ہم جان نثار عیسائیوں کے لیے کافی ہیں۔"

سلطان نے مسکرا کر کہا" زندہ باشی رشید ہمیں اس بات سے خوشی ہوئی کہ تمہیں ہمارا اس درجہ خیال ہے۔ لیکن غیور مسلمان، بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے میدانِ جنگ میں مرنا بہتر سمجھتا ہے۔ تم چلو۔ ہم بھی تمہارے پیچھے

آرہے ہیں۔

قاضی اور رشید دونوں چلے آئے۔ ولی عہد ہو جانے سے رشید میں کوئی تمکنت نہیں آگئی تھی۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو ایک سپاہی سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے سپاہی ان سے محبت کرتے تھے۔

ان دونوں نے مورچوں کا معائنہ شروع کیا۔ سلطان کا ارادہ اسی جگہ لڑنے کا تھا۔ یہ میدان بہت کافی لمبا چوڑا تھا۔ اسی وجہ سے افسروں نے مورچے قائم کر دیتے تھے۔ اور ان پر توپیں لگا دی تھیں۔

رشید اور قاضی مصباح دونوں نے چند اور افسر بھی ساتھ لے لیے۔ بعض مورچوں کی توپیں ٹھیک طور پر نصب نہیں تھیں انہیں ٹھیک کرایا۔ اور مورچوں کے سامنے پیدلوں کے دستے اس طرح کھڑے کر دیئے کہ جس سے مورچے چھپ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں عیسائی لشکر آندھی اور طوفان کی طرح آتا ہوا نظر آیا۔ جھنڈے اور بیرقیں ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ اور عیسائیوں کے ہتھیار دھوپ میں چمک رہے تھے۔ سب سے آگے توپ خانہ تھا۔ توپ خانہ کے پیچھے پیدل تھے اور پیدل کے پیچھے سوار تھے۔ چونکہ عیسائی لشکر ایک لاکھ پچیس ہزار تھا۔ اس لیے دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس لشکر کا پچھلا حصّہ نظر ہی نہ آتا تھا۔ افق میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

عیسائیوں نے اپنا توپ خانہ دُور تک پھیلا دیا۔ انہوں نے جلدی جلدی مورچہ بندی کی۔ اور ان پر توپیں نصب کر لیں۔ روزِ روشن میں توپوں کی لمبی اور موٹی نالیں خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔

جس عرصہ میں عیسائیوں نے مورچہ بندی کی اس عرصہ میں رشید نے لشکر کو صف بستہ کر دیا۔ اسلامی پرچم ہوا سے اٹھکھیلیاں کرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد سلطان بھی تخت رواں پر سوار ہو کر آگئے۔ وہ ایک مسطح اونچے ٹیلہ پر کھڑے ہو گئے اس ٹیلہ کے نیچے سلطانی رسالہ تھا۔ اور اس ٹیلہ پر کھڑے ہونے سے اپنے لشکر کے علاوہ دشمن کا لشکر بھی نظر آتا تھا۔ سلطان نے قاضی مصباح کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور قاضی کے ذریعہ سے افسروں کے پاس پیغام بھیجنے لگے۔

سلطان عبدالملک نہایت جنگ جو اور تجربہ کار تھے اس سے پہلے کئی معرکوں

میں شریک ہو چکے تھے۔ لشکر کو ترتیب میں رکھنا اور لڑانا خوب جانتے تھے۔ لڑائی کے وقت ان کی نظر میدان جنگ پر رہا کرتی تھی۔ اب بھی وہ بڑے تکیہ کے سہارے سے نیم دراز تھے۔ اور میدانِ جنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رشید سلطان سے کچھ آگے بڑھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ عیسائی گولہ باری کرنے والے ہیں۔ ان پیدلوں کو پیچھے ہٹا لیا جو اسلامی مورچوں کے آگے کھڑے تھے۔ ان کے ہٹتے ہی عیسائیوں نے اسلامی توپیں دیکھیں۔ اب تک وہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے پاس توپیں نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو اتنی زیادہ نہیں ہیں جن سے وہ مورچے بنا لیتے۔

مگر اب تک جب انہوں نے مورچے اور مورچوں پر توپیں دیکھیں تو سمجھے کہ مقابلہ آسان نہیں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑائی کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے توپوں کے منہ کھول دیئے اور گولہ باری شروع کر دی مسلمان حملہ میں پہل نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ دشمن کے حملہ کا انتظار کرتے تھے۔ اور جب دشمن حملہ کر دیتا تھا۔ تب وہ بھی حملہ کرتے تھے۔

چنانچہ مسلمانوں نے بھی گولہ باری شروع کر دی۔ توپیں ہولناک گرج کے ساتھ چلنے لگیں۔ کوہ شکن گولے آگ برساتے ہوئے دوڑنے لگے۔ دھوئیں کے غنٹ آسمان کی طرف اڑنے لگے۔

عیسائیوں کی توپیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اور مسلمانوں کی توپیں مسلسل گولے برسا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عیسائی توپیں چلانے میں پوری مہارت نہیں رکھتے۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ عیسائی توپچی نو آموز یا اناڑی تھے۔ انہوں نے توپیں اس طرح نصب کرائی تھیں اور ان کے رُخ کچھ اس قسم کے رکھے تھے کہ اسلامی مورچوں اور اسلامی لشکر پر گولوں کی پوری زد نہیں پڑتی تھی یا تو گولے مورچوں کے سامنے والے دمدموں میں گھس جاتے تھے یا مورچوں کے پیچھے آ کر پڑتے اور پھٹ جاتے تھے۔

رشید نے عیسائی توپوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ گولے زیادہ سے زیادہ کہاں آ کر پھٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے سپاہیوں کو اتنی دُور ہٹا دیا

تھا۔ جہاں گولے نقصان نہ پہنچا سکیں۔

اسلامی توپوں سے جو گولے نکل رہے تھے وہ خاص عیسائیوں کے مورچوں پر جا کر پڑ رہے تھے۔ اور جب وہ پھٹتے تھے تو مٹی کے تودوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ جو گولنداز، توپچی یا سپاہی اُن کی زد میں آجاتے تھے۔ ان کے ٹکڑے اڑا دیتے تھے۔

عیسائی اسلامی توپوں کی یہ حشر خیزی دیکھ کر گھبرانے لگے تھے۔ انہیں خوف ہو گیا تھا کہ اگر اسلامی توپوں کی اسی طرح سے گولہ باری جاری رہی تو عیسائی مورچے درہم و برہم ہو جاویں گے۔

اسلامی توپیں بڑے شدومد سے گولے برسا رہی تھیں۔ اور یہ گولے عیسائیوں کے عین مورچوں پر پڑ رہے تھے۔ ایک اسلامی گولنداز نے ایک توپ میں گولہ ڈالا اور توپچی نے ایک عیسائی توپ کا نشانہ لے کر گولہ چلایا۔ یہ گولہ عیسائی توپ کے منہ میں جا گھسا اور اس توپ کی نال پھٹ کر توپ اُلٹ گئی۔ کئی آدمی اس توپ کے نیچے آکر مر گئے۔ عیسائی مسلمانوں کو گالیاں دینے لگے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ عیسائی خود تو چڑھ کر آئے تھے۔ بے شمار لشکر ساتھ لائے تھے۔ مسلمانوں کو مغرب اقصیٰ سے نکالنے آئے تھے اور جب مرنے لگے۔ تو مسلمانوں کو گالیاں دینے لگے۔

طرفین سے گولہ باری ہو رہی تھی۔ اژدھا پیکر گولے برساتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ دھوئیں کے بادل چھا رہے تھے۔ توپوں کی گرج سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ دھواں اس کثرت سے مطلع پر چھا گیا تھا کہ آفتاب اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا۔ جیسے گھٹا آگئی ہو۔

جب توپیں گولے اگلتی تھیں تو سیاہ دھوئیں میں چنگاریاں جھڑتیں اور سُرخ سُرخ گولے دوڑتے معلوم ہوتے تھے۔ دھوئیں نے میدانِ جنگ کو تیرہ و تار کر دیا تھا۔

اس وقت رشید نے دو افسروں کو ایک ایک ہزار پیدلوں کے ساتھ ایک کو داہنے بازو کی طرف سے اور دوسرے کو بائیں بازو کی طرف سے خاموشی کے

ساتھ بڑھنے کا حکم دیا۔ جانباز مسلم مجاہدین بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے۔ وہ دھوئیں کی تاریکی میں عیسائی لشکر کی طرف بڑھ رہے تھے ان کی روانگی کے کچھ وقفہ کے بعد رشید نے دو اور افسروں کو پانچ پانچ سو سواروں کے ساتھ دونوں پیدل دستوں کے پیچھے ان کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

گولہ باری بڑی شدّت سے ہو رہی تھی۔ فریقین کی توپیں شدومد سے آگ اگل رہی تھیں۔ اس سے دھوئیں میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دفعتاً ایک گولہ عیسائی مورچہ میں بارود کے ذخیرہ پر جا پڑا۔ بارود میں آگ لگ گئی۔ بارود کے پاس جو گولے پڑے ہوئے تھے۔ وہ پھٹنے لگے۔ شعلے بلند ہو گئے۔ گولوں کے پھٹنے سے قریب کے سینکڑوں عیسائی مارے گئے۔ سینکڑوں جھلس گئے۔ آہ فریاد کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ بارود کے شعلوں میں بعض عیسائیوں نے مسلمانوں کو آتے ہوئے دیکھا وہ خوف سے چلا اٹھے "مسلمان آ گئے۔ مسلمان آ گئے۔"

ستاونواں باب ۵۷

خونریز جنگ

عیسائیوں نے ٹھیک ہی کہا تھا مسلمان عیسائی مورچوں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ وہ مسلمان تھے۔ جنہیں رشید نے بھیجا تھا اور انہیں ہدایت کردی کہ وہ لشکر کے چپ دراست سے کترا کر بڑھتے ہوئے عیسائی مورچوں میں پہنچ جائیں۔

عیسائیوں کے شور کرنے سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ انہیں عیسائیوں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ تیزی سے جھپٹے اور مورچوں میں گھس گئے۔ وہاں جاتے ہی انہوں نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے۔ اور جوش میں آکر عیسائیوں پر جا ٹوٹے۔ نہایت پھرتی سے تلواریں چلنے اور انہیں قتل کرنے لگیں۔

عیسائیوں نے بھی تلواریں سونت لیں۔ اور چلا چلا کر مسلمانوں پہ حملے کرنے لگے۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ ڈھالیں اٹھنے لگیں۔ تلواریں ڈھالوں پر بھی پڑنے لگیں اور جسموں پر بھی۔ سروتن کے فیصلے ہونے لگے۔ سر کٹ کٹ کر اچھلنے اور دھڑوں پر دھڑ گرنے لگے۔ خون کے فوارے اُبلنے لگے۔

مسلمان عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے اور عیسائی مسلمانوں سے گتھ گئے بڑی پھرتی اور قوت سے تلواریں چلنے لگیں۔ تیزی سے مار کاٹ ہونے لگی۔ لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ جب کسی کا کوئی ہاتھ کٹ کر اچھلتا تھا تو اس زور سے پاس والے

سرفروش کے لگتا تھا۔ جیسے لوہے کا ہاتھ جا لگا۔ جسم کے جس عضو پر یہ ہاتھ پڑتا اس کی ہڈی تک توڑ دیتا۔

عیسائیوں کا پہلا مورچہ تھا۔ جس پر مسلمانوں نے حملہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ذریعہ سے مسلمانوں نے اسلامی توپچیوں کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ وہ مورچے میں داخل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اس طرف سے گولہ باری بند ہو گئی تھی۔ اور مسلمان اطمینان کے ساتھ لڑائی میں مشغول ہو گئے تھے۔

اس مورچہ کی عیسائی توپیں بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ اس مورچہ کے قریب عیسائیوں کے جو مورچے اور تھے ان کی گولہ باری بھی بند ہو گئی تھی۔ انہیں یہ تعجب تھا کہ اگلے مورچہ کے عیسائی شور کیوں کر رہے ہیں۔ کئی مورچوں سے چند سوار حالات معلوم کرنے کے لیے آئے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس مورچہ میں آگھسے ہیں اور انہوں نے لڑائی شروع کر دی ہے تو وہ گھوڑے دوڑا کر بھاگے اور انہوں نے اپنے اپنے مورچوں کے افسروں کو مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کی اطلاع دی۔ ان میں سے کسی مورچہ والوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیتے۔ اپنے اپنے مورچوں میں کھڑے رہ کر یہ دیکھنے لگے کہ مسلمان کیا کرتے ہیں۔

مسلمان بڑے جوش سے لڑ رہے تھے۔ ان کی خون آشام تلواریں دشمنوں کو قتل کر رہی تھیں۔ خون پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں۔

عیسائی شور کر کر کے حملے کر رہے تھے۔ مگر مسلمان ان کے وار اپنی ڈھالوں یا تلواروں پر روک کر جب خود حملہ کرتے تھے تو حملہ آور عیسائیوں میں سے اکثروں کو مار ڈالتے تھے۔ جب عیسائیوں پر تلواریں پڑتی تھیں اور وہ زخمی ہوتے تھے تو بُری طرح چلاتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں نے اس مورچہ کے تمام عیسائیوں کو مار ڈالا۔ بہت کم ایسے لوگ تھے جو بھاگ کر دوسرے مورچوں میں پہنچے اور اپنی جانیں سلامت لے جا سکے۔ ان میں سے بھی زیادہ تر زخمی ہو گئے تھے۔

اس عرصہ میں مسلمان کافی تعداد میں دوڑ کر عیسائیوں کے پہلے مورچہ میں پہنچ

گئے۔ رشید بھی جا پہنچے۔ انہوں نے وہاں سے کئی دستے ادھر ادھر کے علیسائی موروچوں کی طرف روانہ کیے۔ اور مورچہ کی علیسائی توپوں کے رخ علیسائی لشکر کی طرف پھیر کر علیسائیوں پر گولہ باری شروع کرا دی۔

علیسائی اطمینان سے صف بستہ تھے انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے پہلے مورچہ پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ علیسائی انہیں مار کر بھگا دیں گے۔ اس لیے وہ اپنی جگہ بڑی بے فکری سے کھڑے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ سلمان ان کے پہلے مورچے پر قبضہ کر کے وہاں سے ان پر گولہ باری کر سکیں گے۔

جب رشید نے توپوں کے رخ بدلوا کر ان پہ گولہ باری کرائی اور گولے ان کے سروں پر جا کر پھٹے تو سینکڑوں علیسائیوں کے ٹکڑے ہو کر اڑے اور دور تک بکھر گئے۔ اس سے علیسائی لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ وہ چلانے اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنے لگے

سیباسیتو لشکر کے درمیان میں کھڑا تھا۔ اس نے گولے اپنے لشکر کی طرف آتے ہوئے دیکھے۔ اسے تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا۔ یہ گولے کہاں سے آ رہے ہیں۔

چند افسروں نے اسے بتایا کہ مسلمانوں نے پہلے علیسائی مورچہ پر قبضہ کر کے اس مورچہ کی علیسائی توپوں سے علیسائیوں پر گولہ باری شروع کر دی ہے۔

سیباسیتو کو مسلمانوں کی اس جسارت پر بڑا غصہ آیا۔ وہ اپنے لشکر کی کثرت پر مغرور تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں کو کچل ڈالے گا۔ مغرب اقصیٰ پہ قبضہ کر لے گا۔ اور اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹا دے گا۔ لیکن اس کے اس خیال کے برعکس مسلمانوں نے اس کے ایک مورچہ پر قبضہ کر لیا اور اس کی ہی توپوں سے اس کے لشکر پر گولہ باری شروع کر دی۔ وہ غصہ سے بھنا گیا۔ اس نے عام حملہ کا حکم دے دیا۔

علیسائی لشکر کا سیلاب مسلمانوں کی طرف بڑھا۔ رشید کو اطلاع کر دی گئی انہوں نے قاصد کو دوڑا کر قاضی مصباح کو مطلع کیا۔ قاضی سلطان کی خدمت میں پہنچے۔ سلطان تخت رواں پر لیٹے ہوئے تھے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ انہیں سلطان کی یہ حالت دیکھ کر سخت صدمہ ہوا۔ سلطان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔

قاضی مصباح کو فکر ہوئی کہ کہیں سلطان کی موت کی خبر سپاہیوں کو نہ معلوم ہو جائے۔ اور اس سے ان کے دلوں پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس لیے انہوں نے تخت رواں کے پردے گرا دیئے۔ اور کبھی کبھی پردہ کے اندر جھانک کر اس طرح بولتے جیسے وہ سلطان سے احکام حاصل کر رہے ہیں اور پیچھے ہٹ کر کاغذوں کے پرزوں پر احکام لکھ لکھ کر افسروں کے پاس بھیج دیتے۔ افسر سمجھتے کہ سلطانی احکام آ رہے ہیں۔ اس لیے وہ دل جمعی کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کر رہے تھے۔ قاضی مصباح نے تمام لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیدیا تھا۔ مسلمان جوش میں آ کر بڑھ رہے تھے۔ ادھر سے عیسائی بڑھے چلے آ رہے تھے۔ دونوں لشکر ٹکرا گئے اور دست بہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ گولہ باری بند کر دی گئی۔

تلواریں تڑپ کر میانوں سے نکل آئیں۔ دھوپ میں جگمگائیں اور انسانوں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ ابھریں اور پھر جھکیں۔ خونریزی شروع ہو گئی۔ سر کٹ کٹ کر اچھلنے اور دھڑوں پر دھڑ گرنے لگے۔ اس زور سے مار کاٹ شروع ہوئی کہ موت گھبرائی ہوئی روحیں قبض کرتی پھرنے لگی۔

مسلمان، عیسائی لشکر کی صفیں توڑتے قلب کی طرف گھستے چلے گئے۔ عیسائیوں نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن پرجوش مسلمان نہ رکے۔ مارتے کاٹتے بڑھنے لگے۔ ان کی تلواریں بڑی پھرتی سے چل رہی تھیں۔ اور نہایت تیزی سے کاٹ کر رہی تھیں۔ شیران اسلام کے سامنے عیسائی صفیں بچھتی چلی جاتی تھیں۔ مسلمان بھی شہید ہو رہے تھے۔ لیکن چونکہ وہ بڑی بے جگری اور بے خوفی سے لڑ رہے تھے۔ اس لیے کم ہو رہے تھے۔ عیسائی مرنے سے ڈر رہے تھے اس لیے بھاری تعداد میں مر رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ موت سے نہیں ڈرتے وہ حیرت ناک کام کر گذرتے ہیں۔ موت بھی ان سے گھبرانے لگتی ہے اور جو موت سے ڈرتے ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ موت کا خوف انہیں کچھ نہیں کرنے دیتا اور آخرت ان کا گلا آ دباتی ہے۔

لہ از مغرب اقصیٰ صفحہ ۳۲

مسلمان بڑے جوش میں تھے۔ ان کی تلواریں تیزی سے چل رہی تھیں۔ وہ بڑی قوت سے حملے کر رہے تھے۔ اور عیسائیوں کو کھیرے اور ککڑی کی طرح کاٹ رہے تھے۔

پرجوش مسلمان عیسائیوں کی صفیں توڑتے، لاشوں پر لاشیں گراتے۔ خون کے دریا بہاتے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

عیسائی انہیں روکتے تھے۔ ان کے سدّ راہ ہوتے تھے۔ وہ عیسائیوں کو مار مار کر ان کی لاشیں بچھا دیتے تھے۔ اگلی صف کو پچھلی صف پر الٹ دیتے تھے۔ جوش میں آکر حملہ کرتے تھے اور قتل عام کرتے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

نہایت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ تلواریں بڑی پھرتی سے اُٹھ اُٹھ کر انسانوں پر پڑ رہی تھیں۔ سر اُچھل رہے تھے۔ دھڑ گر رہے تھے۔ خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ کٹے ہوئے گلوں سے خون اس طرح نکل رہا تھا۔ جس طرح مشکیزوں سے پانی نکلا کرتا ہے۔

مسلمان دُور تک عیسائی لشکر میں پھیل گئے تھے۔ اور جہاں تک وہ پھیل گئے تھے۔ وہیں تک لڑائی کا زور بڑھ گیا تھا۔ تلواروں پر تلواریں چل رہی تھیں۔ اور سروں پر سر کٹ کٹ کر اچھل رہے تھے۔

رشید نے دُور سے سیبا سیتو کو دیکھا۔ وہ شاہی رسالہ کو ساتھ لے کر بڑھے عیسائی ان کے راستہ میں حائل ہو گئے۔ سلطانی رسالہ نے ان کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ رشید اور ان کے ساتھی جانباز مجاہد نہایت سختی سے حملے کرتے۔ دشمنوں کو خاک و خون میں لٹاتے۔ صفوں کو چیرتے اور خون کے دریا بہاتے بڑھ رہے تھے۔

رشید بڑی سرفروشی سے لڑ رہے تھے۔ ان کی برق وش تلوار بڑی پھرتی سے چل رہی تھیں۔ ان کی تلوار جس کے سر پر پڑتی تھی خود کو کاٹ کر اس کے سر کی پھانکیں کر دیتی تھی۔ جس کے شانہ پر پڑتی تھی۔ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتی تھی۔ جس کے گلے پر پڑتی تھی۔ اس کی گردن اڑا دیتی تھی۔

وہ بڑی دلیری، جرأت اور ہمت سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے کئی بڑے بڑے بہادر عیسائی افسروں کو مار ڈالا تھا۔ کئی افسروں کو زخمی کر دیا تھا۔ عیسائی جوش

میں آکر ان کے سامنے جاتے تھے۔ غصہ میں آکر ان پر حملہ کرتے تھے۔ لیکن وہ ان کے حملے روک کر خود ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر ڈالتے تھے۔

رشید اور ان کے ہمراہیوں نے کئی عیسائی تاجداروں کو مار ڈالا تھا۔ وہ اس قدر جوش میں تھے کہ سارے عیسائی لشکر کو قتل کر ڈالنا چاہتے تھے۔ رشید کے دلیرانہ حملوں اور پرجوش نعروں نے ان کے ساتھیوں کے دلوں کو بہت کچھ بڑھا دیا تھا۔ اور وہ شیروں کی طرح حملے کر کر کے عیسائیوں کو چیر پھاڑ رہے تھے۔

کچھ رشید اور ان کے ساتھی ہی پرجوش حملے نہیں کر رہے تھے بلکہ تمام مسلمان نہایت دلیری سے لڑ رہے تھے۔ ہر مسلمان بڑی پھرتی اور قوت سے اس طرح حملے کر رہا تھا۔ جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ عیسائی بھاگ جائیں گے اور انہیں قتل کر ڈالنے کی آرزو اس کے دل ہی میں رہ جائے گی۔

لڑائی صبح ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ اور لڑتے لڑتے عصر کا وقت آ گیا تھا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ کہ وہ کسی وقت کی نماز ہی ادا کر لیتے۔ کھانے اور پینے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ تمام دن انہیں لڑتے ہوئے گذر گیا تھا۔ وہ اپنے سے چھ گنا دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ انہیں قتل کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ تلواریں چلاتے چلاتے ان کے بازو شل ہو گئے تھے۔ مگر ان کی روحانی قوت بڑھ گئی تھی اور اس وقت وہ بھی پھرتی سے جدال و قتال کرتے لگے تھے۔

اس وقت رشید نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ ان کے ساتھیوں نے بھی اس مبارک نعرہ کی تکرار کی۔ تمام مسلمانوں نے یہ نعرہ سُنا۔ انہوں نے صبح سے یہ نعرہ نہیں لگایا تھا۔ اب انہیں ہوش سا آیا اور انہوں نے مل کر اللہ اکبر کا پُرزور نعرہ لگایا تھا۔ اس نعرہ سے ان کے دلوں میں نیا جوش بھر گیا۔ انہوں نے سنبھل کر پُرزور حملہ کیا اور پہلے سے بھی زیادہ قوت اور پھر سے عیسائیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے اس حملہ میں عیسائیوں کے کئی بڑے بڑے افسروں اور کئی تاجداروں کو مار ڈالا۔ عیسائی گھبرا گئے۔ وہ پیچھے ہٹے۔ مسلمانوں نے بڑھ کر ان پر اور شدت سے

حملہ کیا اور بے شمار عیسائیوں کو مار ڈالا۔ ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس عرصہ میں رشید سیبا سیتو کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کے اس رسالہ پر حملہ کر دیا جو اس کی حفاظت کے لیے اس کے گرد گھیرا تھا۔ انہوں نے اور ان جانباز ساتھیوں نے پرزور حملے کر کے اس رسالہ کے سواروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ رشید مارتے کاٹتے سیبا سیتو کے پاس پہنچے اور للکارے۔

' او ناپاک نصرانی سنبھل تیری موت آگئی ہے۔

سیبا سیتو کو جوش آگیا اس نے رشید پر حملہ کیا۔ رشید نے اس کا وار روک کر اس زور سے اس پر حملہ کیا کہ ان کی تلوار اس کی شانہ کی چاندی کی زنجیریں کاٹ کر اس کی گردن اڑ گئی۔ اس کا سر دور جا گرا۔ اور دھڑ گھوڑے پر الٹ گیا۔

عیسائی سیبا سیتو کے قتل ہوتے ہی گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ادھر مغرب میں سورج غروب ہوا۔ اُدھر عیسائیوں میں بھگدڑ پڑ گئی۔

ے مغرب اقصیٰ صفحہ ۲۳

اٹھاون واں باب ۵۸

نئے سُلطان

جس وقت عیسائی ہزیمت اٹھا کر بھاگے اس وقت دن چھپ رہا تھا۔ آفتاب افق میں ڈوب گیا تھا۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ جب عیسائی لشکر میں عام جنبش ہوئی تھی تو مسلمان سمجھے تھے کہ وہ پوری قوت سے حملہ کریں گے۔ لیکن جب انہوں نے انہیں پیچھے ہٹتے دیکھا تو انہوں نے خوش ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

مسلمان تمام دن بھوکے اور پیاسے لڑے تھے۔ تلواریں چلاتے چلاتے اور دشمنوں کے قتل کرتے کرتے ان کے بازو شل ہو گئے تھے۔ جسم تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن ان کے جوش میں اب بھی کمی نہیں آئی تھی۔ دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش اب بھی ان کے دلوں میں موجود تھی۔

یہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ ان پر عیسائیوں نے بلا کسی وجہ سے مغرب اقصیٰ سے انہیں مٹانے کے لیے حملہ کیا تھا۔ امن و امان میں خلل ڈالا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف عمل کیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم یہ تھی کہ سب کے ساتھ پیار اور محبت سے رہو۔ رحم و کرم کے پیکر بن جاؤ۔ جوش اور غصہ کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ تمہیں اس وقت بھی غصہ نہیں آنا چاہیئے۔ جب کوئی طیش میں آ کر تمہارے گال پر طمانچہ مارے۔ بلکہ تم اس قدر نرم جن جاؤ کہ دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو۔

مگر سیبا سیتو نے حضرت عیسٰیؑ کی اس تعلیم کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے دماغ میں ملک گیری کی ہوس پیدا ہوئی۔ اس نے پوپ سے مدد چاہی۔ پوپ نے بھی عیسائی تعلیم کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ عیسائی بھیڑیے یورپ سے پرتگال میں سے مغرب اقصٰی میں مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے آ گئے۔

عیسائی ایک لاکھ پچیس ہزار تھے۔ مسلمان صرف بلیس ہزار ہی تھے۔ عیسائیوں کو پورا پورا یقین تھا کہ وہ مسلمانوں کو کچل ڈالیں گے اور مغرب اقصٰی پر قبضہ کر لیں گے۔ انہیں اپنی کثرت پر بھروسہ تھا۔ وہ خدا کو بھول گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے مسلمانوں کی مدد کی۔ عیسائیوں کو ہزیمت ہوئی۔

جوں ہی عیسائی بھاگے مسلمانوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے لگ لیے۔ انہیں تلواروں کی دھاروں پر رکھ لیا۔ اور اس شدت سے مار کاٹ شروع کی کہ قدم قدم پر عیسائیوں کی لاشیں بچھا دیں۔

اندھیری رات تھی۔ عیسائی بھاگ کر چھپنا چاہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی تیز نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ جہاں جاتے تھے۔ مسلمان پیچھے ہی پہنچ جاتے تھے اور بڑی بے تکلفی سے انہیں قتل کرنے لگتے تھے۔ گویا مسلمانوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ایک عیسائی کو بھی زندہ بچ کر نہ جانے دیں گے۔

سلطان عبدالملک نے دریائے لوقومی کا پل پہلے ہی اڑا دیا تھا۔ اسی پل سے عیسائی آئے تھے اور اسی پل سے واپس جا سکتے تھے اور کوئی راستہ واپسی کا نہیں تھا۔ اس لیے عیسائی، دریا اور اسلامی لشکر کے درمیان گھر گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں چاند افق مشرق سے نمودار ہوا چاندنی پھیلنے سے اندھیرا دور ہونے لگا۔ اب مسلمانوں نے چاند کے اجالے میں عیسائیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

ہزاروں عیسائی مسلمانوں سے ڈر کر دریا میں کود پڑے اور غرق ہو گئے مسلمانوں کو اس قدر جوش اور غصہ کہ بعض عیسائیوں کے پیچھے اب وہ بھی دریا میں کود جاتے اور عیسائیوں کو ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لاتے۔ دریا سے باہر نکالتے اور

قتل کر دیتے۔ بعض مسلمان عیسائیوں کو پانی میں غوطے دے دے کر مار ڈالتے غرض عیسائیوں کے لیے نہ خشکی میں پناہ تھی نہ دریا میں۔ وہ ہر جگہ مر رہے تھے یا مارے جا رہے تھے۔

عیسائیوں نے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ قدرت اُن سے انتقام لے رہی ہے۔ انہوں نے بلا وجہ مسلمانوں پر یورش کی۔ اسلامی بستیوں کو تاراج کیا۔ نہایت بے رحمی سے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ذبح کیا۔ زراعت پامال کی۔ باغات برباد کیے اور مسلمانوں کے گھروں اور مسجدوں کو جلا ڈالا۔ یہ مظالم اس لیے کیے کہ انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کوئی محافظ نہیں ہے۔ وہ کم ہیں۔ انہیں کچل ڈالیں گے۔ برباد کر دیں گے۔ مگر خدا نے مسلمانوں کی حمایت کی تھوڑے سے مسلمانوں نے بے شمار عیسائیوں کو شکست دی۔ مسلمانوں نے فتح پائی اور عیسائی مغلوب ہو گئے۔

جب چاند اور اونچا ہو گیا اور چاندنی اچھی طرح پھیل گئی تو مسلمان دوڑ دوڑ کر عیسائیوں کو قتل کرنے لگے۔ عیسائیوں پر مسلمانوں کی کچھ ایسی ہیبت چھا گئی کہ وہ مقابلہ نہ کرتے۔ مسلمانوں کو دیکھتے ہی سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے اور مسلمان انہیں قتل کر ڈالتے۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام عیسائیوں کا صفایا ہو گیا۔ دو چار سخت جان عیسائی دریا تیر کر پار ہو گئے۔ ورنہ سب کے سب مارے گئے۔

ابو عبداللہ متوکل علی اللہ بھی عیسائی لشکر کے ساتھ تھے۔ وہ بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ عیسائی فتحیاب ہوں گے اور چونکہ سیباسیتو نے ان سے یہ وعدہ کر رکھا کہ مغرب اقصیٰ کی حکومت انہیں دے دی جائے گی۔ اس لیے وہ اپنی حکومت

ل مغرب اقصیٰ کے صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے کہ

"ایک لاکھ پچیس ہزار نصرانی مجاہدین کا گروہ پرتگال کے بادشاہ سیباسیتو کی سرکردگی میں مسلمانوں کو مغرب اقصیٰ سے ختم کرنے کی نیت سے حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں نے ان سب کا صفایا کر دیا۔ [illegible] اندلس کی شکست کا حال یورپ کو عرصہ تک یقین نہ آیا۔"

کے خواب دیکھ رہے تھے۔

مگر جب عیسائیوں کو شکست ہوئی تو وہ بھی بھاگے۔ لیکن دریا نے انہیں بھی روک لیا۔ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ مسلمان ان کی حرکتوں سے ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ انہیں غدّار اور ملک و قوم کا دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ انھیں غدّاری کی سزا ضرور دیں گے۔ اس لیے وہ سخت خائف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اور اُن کے ساتھی لرز گئے۔ سب کے سب دریا میں کود پڑے۔ مسلمان بھی دوڑ کر دریا میں کود گئے اور انہوں نے ان کو ڈبانا شروع کیں۔ ایک مسلمان نے ابو عبداللہ کو پہچان لیا انہوں نے انھیں پانی میں غوطے دیتے ہوئے کہا۔ ”غدّار اور مکّار تیری وجہ سے مسلمانوں کو بڑی اذیت پہنچی۔ انہوں نے ابو عبداللہ کو اتنے غوطے دیئے کہ وہ مر گئے۔

جب دشمنوں کا بالکل صفایا ہو گیا تب مسلمان واپس لوٹے۔ اور اپنے کیمپ میں پہنچ کر سب سے پہلے قضا نمازیں ادا کیں۔ پھر کھانا تیار کیا۔ زخمیوں کا مرہم پٹی کی۔ کھانا کھایا اور سو رہے۔

صبح اُٹھ کر انہوں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ اب قاضی مصباح نے تمام چھوٹے بڑے افسروں اور معزز لوگوں کو سلطانی خیمہ میں طلب کیا۔ اور جب سب لوگ آ گئے تو قاضی نے انہیں آگاہ کیا کہ سلطان عبدالملک کا انتقال ہو گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جس وقت حملہ ہوا تھا۔ سلطان اسی وقت وفات پا گئے ان کی وفات کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

مسلمانوں کو سلطان کی وفات کا رنج ہوا۔ انہوں نے قاضی مصباح کی اِس دانشمندی کی تعریف کی کہ انہوں نے سلطان کی وفات کی خبر کو چھپایا۔

اب نئے سلطان کے ہاتھ پر بیعت کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ مشورہ شروع ہوا۔ قاضی مصباح نے کہا۔ ”سلطان نے رشید کو ولی عہد مقرر کیا تھا۔ وہ اِس سلطنت کے حق دار بھی ہیں۔ اِن کے ہی ہاتھ پر بیعت کی جائے۔

ل از مغرب اقصیٰ صفحہ ۲۳

سب نے اس رائے کی تائید کی۔ چنانچہ رشید سے کہا گیا کہ وہ بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھائیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ سب نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اِس طرح ایک گمنام شخص جو جامع قیروان کے طالب علم تھے۔ مغربِ اقصیٰ کے سلطان ہو گئے۔

اسی وقت تمام لشکر میں سلطان عبدالملک کی وفات اور رشید کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ تاج پوشی کی رسم فاس میں ادا ہونی قرار ہوئی۔

رشید نے مالِ غنیمت فراہم کرنے کا حکم دیا۔ عیسائی بڑا ساز و سامان لے کر آئے تھے۔ وہ سب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ رشید کے حکم سے پانچواں حصہ نکال کر باقی سب مالِ غنیمت تمام لشکر میں تقسیم کر دیا گیا۔ اِس جنگ کی دو خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ ایک لاکھ پچیس ہزار میں سے چند آدمی بچ کر جا سکے۔ باقی سب مارے گئے۔ اور مسلمان ڈیڑھ ہزار شہید ہوئے۔ دوسری یہ کہ رشید کو تاج و سلطنت ملے۔ شہداء کے جنازہ کی نماز پڑھ کر انہیں احترام سے دفن کر دیا گیا۔ اور فاتح لشکر نے فاس کی طرف کوچ کیا۔

انسٹھواں باب ۵۹

دلفریب انجام

مسلمانوں کو جو شاندار فتح وادی مخازن کے قریب حاصل ہوئی اس کی خبر فاس میں پہلے ہی پہنچ گئی۔ مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے فاتح لشکر کے استقبال کی تیاری شروع کر دی۔

فاس اور مغربِ اقصیٰ کے مسلمانوں نے خدا سے فتح کی دعائیں مانگی تھیں۔ انہیں یقین کامل تھا کہ ان کی دعائیں قبول ہوں گی، اور خدا فتح عطا فرمائے گا خدا نے فتح عطا فرما دی تھی۔ اس سے انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی، اور وہ فاتح لشکر کا استقبال کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

رشید اور ان کا لشکر بڑی شان سے واپس آ رہا تھا مسلمانوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عبدالملک نے وفات پائی۔ اور رشید سلطان ہو گئے ہیں۔ زرقا اور اس کی والدہ فاطمہ نے اسلامی لشکر کی فتح کی دعا کے ساتھ ساتھ رشید کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگی تھیں۔

جب فاتح لشکر فاس میں داخل ہوا تو اہل شہر نے اس کا نہایت شاندار استقبال کیا۔ اللہ اکبر کے پرشور نعروں سے تمام شہر گونج اٹھا۔ رشید شاہی محل پر پہنچے۔ قاضی مصباح نے ملکہ سے سلطان عبدالملک کے وفات کی خبر بیان کی۔ انہیں بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے پوچھا "کیا ابو عبداللہ سلطان ہو گیا۔"؟

قاضی :- نہیں وہ دریا میں غرق ہو گیا۔

ملکہ :- خدا کا شکر ہے۔ پھر کون خلیفہ ہوا؟

قاضی :۔ اس سلطنت کا جو حق دار تھا۔ وہی خلیفہ ہوا ؟

ملکہ :۔ کیا عبدالرحمٰن کا بیٹا ۔۔۔ ؟

قاضی :۔ جی ہاں۔

ملکہ نے خوش ہو کر کہا۔ اے خدا تیرا شکر ہے۔ حق حقدار کو مل گیا۔ کہاں ہے میرا بھتیجا ۔۔۔ ؟"

قاضی صاحب واپس آئے، اور رشید کو لیکر پہنچے۔ ملکہ نے رشید کو پردہ کے اندر بلالیا۔ رشید نے نہایت ادب سے انہیں سلام کیا ملکہ نے دعا دیکر انہیں اپنے سینہ لگا لیا۔ اور کہا " بیٹا خدا نے حق، حقدار کو دلا دیا۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے۔

رشید :۔ مجھے یہ افسوس ہے کہ میں بزرگ چچا کے سایہ سے محروم ہو گیا۔ لیکن یہ خوشی ہے کہ محترمہ چچی کا سایہ موجود ہے۔

اس روز سے رشید شاہی قصر میں رہنے لگے۔ اب تاجپوشی کی تیاری شروع ہوئی۔ لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ سلطان عبدالملک نے وفات پائی۔ اور رشید سلطان ہو گئے۔ ان کی تاجپوشی ہونے والی ہے۔

رشید کی والدہ عذرا مولائی یعقوب میں رہتی تھیں، مولائی یعقوب ناس سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک بستی تھی، ان کی بزرگی اور دینداری کی شہرت تھی۔ کوئی انہیں یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک روز رشید مع حشم و خدم اور شاہی رسالہ کے خاص سے مولائی یعقوب کی طرف اپنی محترم والدہ کو لینے کے لیے چلے۔ سلطان کی سواری تھی۔ شہرت ہو گئی۔ سب کو حیرت تھی کہ سلطان اس بستی میں کیوں جا رہے ہیں۔ سلطان رشید کی سواری عذرا کے مکان پر جا کر رکی۔ اس محلہ کے لوگ رشید کو جانتے تھے۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی، کہ یہی رشید جوان کے ہمسایہ تھے سلطان ہوتے ہیں اب جبکہ انہوں نے انہیں شاہی لباس میں دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ رشید مکان کے اندر گئے۔ ان کی والدہ ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ رشید نے انہیں سلام کیا۔ اور ان کی قدم بوسی کے لیے جھکے۔ عذرا نے جلدی سے ان کا سر اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اور کہا " بیٹا خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں میری

زندگی میں سلطنت عطا کر دی۔ میرے صبر اور تمہاری سعادت مندی کا پھل مل گیا۔ دیکھو رشید حکومت پاکر مغرور نہ ہو جانا۔ امیروں سے زیادہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ مسلمانوں کی مدد کرنا۔ غیر مسلموں کی حفاظت کرنا۔ اسلام کی حمایت میں جان دے دینا۔"

رشید:۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نصیحتوں پر عمل کیا۔ اور جب تک زندہ رہوں گا۔ عمل کرتا رہوں گا۔ چچا جان کو مرتے دم اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ وہ حق دار کو اس کا حق دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ "تمہاری امی بہت شریف ہیں ان سے ہماری طرف سے معافی مانگنا"

عذرا۔ میں نے انہیں معاف کر دیا۔

رشید:۔ اب چلیئے۔ قصر شاہی میں سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں،

عذرا:۔ بیٹا مجھے یہیں رہنے دو۔ وہاں جاتے شرم آئے گی،

رشید:۔ اب شرم کیوں ——— چچی جان نے آپ کے استقبال کی تیاری کر رکھی ہے۔

عذرا:۔ بیٹا میں دنیا سے دُور رہنا چاہتی ہوں۔ دور ہی رہنے دو۔ آپ کے سایہ میں زندگی بسر کروں گا۔

"نہیں۔ انہوں نے کہا، "تم جو کہتے ہو وہی کرتے بھی ہو۔ اچھا چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

رشید خوش ہو گئے۔ عذرا کے لیے نہایت خوبصورت اور آرام دہ گاڑی ساتھ آئی تھی، وہ اس میں سوار ہوئیں۔ اور سلطان رشید واپس لوٹے۔ جب وہ ناس میں داخل ہوئے۔ تو عذرا کا استقبال بڑی شان سے کیا گیا اور جب وہ قصر شاہی میں پہنچیں تو شاہی خاندان کی خواتین نے ان کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ عبدالملک کی بیگم جو ملکہ تھیں، ان کے سامنے جھک گئیں۔ عذرا کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے کہا "بہن خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ پہلے تم ملکہ تھیں۔ اب اپنے آپ کو سلطان کی والدہ سمجھو۔ رشید تمہارا بیٹا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "جب مجھے یہ افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکی۔"

عذرا۔ جب میں روپوش ہو گئی تھی۔ تو تم خدمت ہی کیسے کرتیں۔ اب آگئی ہوں قصر کے ایک گوشہ میں اللہ اللہ کیا کروں گی۔

بیگم:۔ ہم سب تمہاری اطاعت کریں گے۔ اس لیے نہیں کہ تم سلطان کی والدہ ہو۔ بلکہ اس لیے کہ ہماری سب کی بزرگ ہو۔

اور تمام بیگموں اور لڑکیوں نے ان کی تعظیم شروع کر دی۔ تاجپوشی کے لیے جو تاریخ مقرر کی گئی تھی، وہ آگئی۔ نہایت شان کے ساتھ تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی۔ لوگوں کو خلعتیں عطا ہوئی۔ عہدوں میں ترقی دی گئی۔ سعید پانچ ہزار سواروں پر افسر مقرر کیے گئے۔ قاضی مصباح بدستور حاجب رہے۔

شیخ یعقوب درویش کا خواب بالکل پورا ہوا۔ انہوں نے رشید کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا۔ جسے رشید سے درگاہ عالیہ میں بیان کیا تھا ایک خوفناک جانور کا رشید پر حملہ کرنا۔ ان کا غائب ہو جانا۔ اور پھر فاخرہ لباس پہنے اور تاج اوڑھے نظر آنا۔

رشید پر وحشی نے حملہ کیا۔ وہ عرصہ تک زخمی پڑے رہے۔ اور اب قدرت نے انہیں حکومت اور تخت و تاج عطا کر دیئے تھے۔ بعض خواب کیسے سچے ثابت ہوتے ہیں۔

تاجپوشی کی خبر سن کر شوخ و شریر جمیلہ جو ناز سے فاس میں آگئی تھی۔ اور ایک روز وہ زرقا سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ اس روز زرقا کچھ فکرمند سی بیٹھی تھی۔ اس نے جمیلہ کا استقبال تو کیا لیکن اس سرگرمی، جوش اور خوشی سے نہیں جس سے وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ جمیلہ نے کہا "کیوں زرقا نہ مانی تو نے میری نصیحت۔ چھوڑ دیا۔ ملا کا بیٹا۔ ذرہ ہو گیا۔ وہ تیری گرفت سے اب پریشان اور مغموم ہونے سے کیا فائدہ۔"

زرقا۔ آنٹی تو پھر تنگ کرنے میں کیوں پریشان اور مغموم ہوں۔

جمیلہ:۔ اچھا جی ۔۔ مجھ سے بھی اڑتی ہے۔ خیر ہو گا۔ مگر یہ تیرا ملا ٹکلا بڑا کائیاں سلطان ہی بن بیٹھا۔ سلطان بننے کے بعد کبھی تجھ سے ملنے آیا۔

زرقا:۔ مجھ سے کیوں ملنے آتے۔

جمیلہ نے کٹ کٹ کرتے ہوئے کہا "بہت ہی بے مروت نکلا نسوڑیا

میں نے تو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اس کا باپ ... اب بیٹی پچھتایا کر بڑا ناز تھا تجھے اپنے حسن پر یہ نہ سمجھا کہ ملا کچھ مزاج قسم کے ہوتے ہیں مگر شہر جاتا کہاں ہے۔ وہ میرا غم ... ہے۔ نیز اسے۔ تیرے پاس بلوا کر چھوڑوں گی۔"

زرقا:۔ "کیسی زبان چلتی ہے۔"

جمیلہ:۔ زبان ہی نہیں چلتی۔ اب افسوں بھی چلے گا۔ دیکھتی رہ کیا افسوں پھونکتی ہوں۔ تیری خوشامد کرتا نظر نہ آئے تو کہنا۔

زرقا نے مسکرا کر کہا "تو ساحرہ ہے۔ افسوں جانتی ہے۔ اس کی میں بھی قائل ہوں۔ بھائی جان پر تو نے ایسا افسوں پھونکا ہے کہ"

جمیلہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "مردار کیا ذکر نے بیٹھی تو"

اسی وقت ایک کنیز دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا "سلطان رشید کی والدہ عذرا تشریف لائی ہیں۔"

جمیلہ نے دوپٹہ کا آنچل ہاتھوں میں پھیلا کر کہا "خدا کا شکر۔ کھل گئی۔ زرقا تیری قسمت۔ آگیا۔ تیرے لیے پیام۔ اب بن جائیگی تو ملکہ۔"

جمیلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عذرا، زرقا کا پیام لائی تھیں۔ فاطمہ تو خود پہلے یہ چاہتی ہی تھیں۔ وہ پہلے ہی سے تیار تھیں۔ اور اب تو رشید سلطان ہو گئے تھے۔ ان کی خاندانی وجاہت معلوم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اور رشید نے اقرار کر لیا۔ نسبت ہو گئی۔ اور چند ہی روز کے بعد دونوں کا نکاح ہو گیا۔

زرقا کی کوشش سے جمیلہ کا سعید کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ اس طرح دونوں سہیلیوں کی آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ اور دونوں آرام وراحت سے زندگی بسر کرنے لگیں۔ زرقا کے حسن سے جو فتنے اٹھے وہ خیر و خوبی سے ختم ہو گئے۔ یہ واقعہ تاریخوں میں "عجیب داستان" کے نام سے لکھا ہے۔

ختم شد

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

جدید الطبع | **فہرست کتب** | بماہ فروری ۹۲ء

کتاب	قیمت
نقشِ سلیمانی (اردو)	35/-
تعبیر نامہ خواب	20/-
اعمالِ قرآنی	15/-
میری نماز	10/-
مسنون دعائیں	6/-
چھ باتیں	5/-
عورتوں کی نماز	7/-
اقوال زرّیں	7/-
عملیات آسیب	7/-
ناظمہ کالال	10/-
عملیات محبت	10/-
جنگ نامہ حضرت علیؓ	7/-
جنت کا راستہ	10/-
سلام نعت و رسولؐ	7/-
اسم اعظم	7/-
گنجینۂ عملیات	12/-
مخصوص مسائل	5/-
میاں بیوی کے حقوق	8/-
روحانی علاج	12/-
شہد سے علاج	12/-
احتلام اور نامردی کا شرطیہ علاج	12/-
نقش منتظم	7/-
حل المشکلات	10/-
مکاشفۃ القلوب	56/-

کتاب	قیمت
اندر جال (اردو)	15/-
چین بنگال کا جادو	7/-
ہمدرد عاشقان	15/-
اصلاح الرسوم	15/-
موت کی یاد	6/-
سنی بہشتی زیور	45/-
شمع شبستان رضا	45/-
طب روحانی	18/-
طریقۂ فاتحہ	8/-
خانانامہ خواب نامہ	15/-
قیامت کب آئیگی	12/-
رسول اللہ کی دعائیں	12/-
والدین کے حقوق	5/-
اسلام کیا ہے؟	15/-
طب نبوی	12/-
شمائل ترمذی شریف	30/-
جاء الحق	55/-
حصن حصین	22/-
قانون شریعت	75/-
جنتی زیور	60/-
تحفۂ خواتین	45/

ہماری ہندی مطبوعات

کتاب		قیمت
نقش سلیمانی	ہندی	18/-
سیفہ کالال		15/-

کتاب		قیمت
آمنہ کا لال	ہندی	8/-
اعمال قرآنی	"	18/-
موت کی یاد	"	8/-
بہشتی زیور	"	65/-
قصص الانبیاء	"	30/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا		30/-
سولہ سورہ کلاں	"	25/-
میلاد اکبر	"	12/-
میری نماز	"	10/-
آئینہ نماز	"	10/-
نعتیں و سلام	"	8/-
تاریخ اسلام	"	45/-
میاں بیوی کے حقوق	"	5/-
آسان نماز	"	7/-
فضائل اعمال	"	75/-
بخاری شریف	"	45/-
مسلمان بیوی	"	10/-
مسلمان خاوند	"	10/-
مسنون دعائیں	"	8/-
چھ باتیں		5/-
سورہ یٰسین شریف	" گنج العرش	2/
ترکیب نماز	"	5/-
پارہ عم	"	5/-
قیامت کب آئیگی	"	12/-
رسول اللہ کی دعائیں	"	12/-

جسیم بک ڈپو ۵۲۰، مٹیا محل جامع مسجد۔ دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

Rs.